یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

نگرانِ اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

مدیر اعزازی
قاضی اطہر مبارکپوری

مرتب
عمید الرحمٰن عثمانی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

برہان

جلد ۱۱۳	جنوری ۱۹۹۴ء مطابق شعبان ۱۴۱۴ھ	شمارہ ۱

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

آزادی کے بعد سال ۱۹۹۲ء میں جس قدر دہشتناک وبہیمانہ فرقہ وارانہ فسادات بابری مسجد کی مسماری کے بعد رونما ہوئے اس کے نتیجے میں ہندوستان اقتصادی لحاظ سے اسقدر پیچھے ہوگیا ہے کہ عالمی بنک کی اٹیلس کے ۲۶ ویں ایڈیشن میں ہندوستان سے متعلق یہ بات درج ہے کہ:

"ہندوستان کی فی کس آمدنی ۱۹۹۲ء میں اس سے پہلے سال کے مقابلے میں کم ہوکر صرف ۳۵۰ ڈالر سالانہ فی کس سے بھی کم ہوکر رہ گئی۔ اور اس طرح ہندوستان ان ۵۷ ملکوں کے زمرے میں آگیا جن کی آمدنی مذکورہ حد سے کم ہے۔ اور ہندوستان کی فی کس مجموعی قومی پیداوار ۱۹۹۲ء میں ۳۱۰ ڈالر تھی۔ جبکہ ۱۹۹۱ء میں یہ آمدنی ۳۳۰ ڈالر تھی"۔

اندرون ملک مہنگائی کی بہتات ہے جس کی چھوٹی سی مثال ہر انسان کی پہلی ضرورت چھوٹی سی چیز پیاز کی بے پناہ بڑھتی قیمت ہے، جنوری ۹۳ء میں جس پیاز کی قیمت ۳ روپے کیلو تھی وہ ہی اکتوبر، نومبر، دسمبر ۹۳ء میں ۱۲-۱۴ روپے کیلو تک پہنچ گئی یعنی ۴۰۰ فیصدی تک اضافہ اشیائے خورد ونوش سے لیکر دوا تک ہر چیز کی قیمت آسمان کی بلندیوں تک پہنچ گئی — اس کمر توڑ مہنگائی کی مار سے غریب انسان غربت وافلاس کی دہلیز پر پڑا ہوا سسک رہا ہے۔ کیونکہ اسے عیش وآرام تو دور صرف اور صرف پیٹ بھرنے کے لئے دو وقت کی روٹی ہی میسر ہو جائے تو یہ لاکھ درجہ غنیمت بات ہوگی — کبھی ہماری سیاسی جماعتوں نے اسطرف توجہ نہیں دی کہ غریب کو روٹی کپڑا مکان کس طرح مہیا کرایا جا سکتا ہے اکثر سیاسی جماعتوں کے رہنما تو بس، کسی طرح داؤں وپیچ لگا کر اقتدار کی کرسی پر براجمان ہونا چاہتے ہیں۔ ان کی بلا سے غریب انسان اپنی زندگی کس طرح گذار رہا ہے وہ اس طرف دھیان دیکر کیوں اپنے لئے جو کھم بھرا کام کا بوجھ اپنے سر پر ڈھوئے۔ جب سیاسی

ناعتوں کے رہنماؤں کا یہ نظریہ ہوگا تو ہم یہ کیسے باور کریں کہ عام انسان کا معیار زندگی بلند ہوگا
۔ اس بیسویں صدی کے ترقی یافتہ دور میں خوشحال انسانوں کی طرح برابری کے ساتھ رہ سکیں گے؟

ایک طرف تو یہ حال ہے کہ عام انسان غریب سے غریب تر ہو رہا ہے اور دوسری طرف ملک میں کروڑوں اربوں روپے کے تمسکات کے لین دین میں جو گھپلا ہوا ہے وہ بھی ہمارے غریب ملک کی آزادی کے بعد محیّرالعقول مثال ہے۔ ہمارے ملک کی غریب آبادی کی غربت و افلاس کی طرح طرح کی کہانیاں و داستانیں غیر ممالک کے اخبارات و رسائل میں چھپتی رہتی ہیں جس سے ہمارے ملک کے عوام کی تصویر غیر ممالک کے لوگوں کے دل و دماغ میں کیسی حقیر منعکس ہوگی جس کا خیال ہی باعثِ شرم ہے اور جب ان کے سامنے ان تمسکات کے لین دین میں کروڑوں اربوں روپے کے گھپلوں کی خبریں پہنچی ہوں گی تو انہوں نے ہمارے بارے میں کیا کیا خیال دل و دماغ میں پیدا کیا ہوگا اس کا ہلکا سا اندازہ کر کے ہر غیرت مند ہندوستانی کا سر شرم سے نیچا ہونا قدرتی بات ہے۔

پورے عالم میں ۱۹۹۲ء کا سال ہندوستان کے لئے نیک نامی کا قطعاً نہیں رہا اس لئے کہ فرقہ پرست عناصر نے لاکھوں سادہ لوح عوام کو بہکا کر اور گمراہ کر کے ایودھیا میں اکٹھا کیا اور دنیا بھر کے ٹی وی کیمرہ، فیکس، ریڈیو، نیوز ایجنسیوں و اخبارات کے نمائندوں کی موجودگی میں ایک عبادت گاہ بابری مسجد کو جس طرح چشم زدن میں زمین دوز کیا اس پر تمام دنیا کے لوگ آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے اور ایک اقلیتی فرقہ کی عبادت گاہ کو اس طرح زمین دوز کرنے کے اقدام کو انتہائی نفرت و حقارت سے دیکھنے پر مجبور ہوئے ــــــ مقام شکر ہے سال ۱۹۹۳ء میں ہندوستانی عوام نے فرقہ پرست عناصر کے خلاف اسمبلی چناؤ میں اپنے حق رائے دہندگی (ووٹ) کا استعمال کر کے دنیا کے سامنے یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ ہندوستان کے عوام کی اکثریت ان قابل نفرت اقدامات اور کسی مذہب کی عبادت گاہ کی مسماری کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتی ہے، اور وہ ان غلط حرکات کے خلاف اپنا فیصلہ دینا اپنے ملک اور مذہب کی روایات کے عین مطابق سمجھتی ہے۔ اس لحاظ سے سال ۱۹۹۳ء ہندوستان اور ہندوستانی عوام کے لئے بہتر ہی رہا گو ۱۹۹۲ء کے آخری دنوں کے بابری مسجد کی مسماری کے عوض میں نامساعد حالات سے ۱۹۹۳ء میں بھی سابقہ پڑا۔ بقول وزیراعلیٰ بہار جناب لالو پرشاد "یہ ... والے بھی کس قدر دشمنِ ملک نکلے کہ نہ بابری مسجد توڑتے اور نہ ہی مہاراشٹر کے لاتور و عثمان آباد میں زلزلے کی

صورت میں قدرتی عذاب کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اس بھیانک زلزلے میں سرکاری اعداد و شمار ہی کے بموجب نو ہزار سے زائد افراد کے ہلاک ہونے کی بات ہے اور مالی نقصانات کا تو بس اندازہ ہی اندازہ ہے انسانی بس میں صحیح اندازہ کا احاطہ کہاں ہو پایا ہے؟۔

سال ۱۹۹۳ء مظلوم فلسطینیوں کے لئے اگر اچھا نہیں ہے تو برا بھی نہیں رہا ہے۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۹۳ء کو امریکی صدر مسٹر بل کلنٹن کی موجودگی میں امریکی ایوان صدر (وہائٹ ہاؤس) واشنگٹن میں اسرائیلی وزیر اعظم مسٹر اسحاق رابن اور پی۔ ایل۔ او کے سربراہ مرد آہن جناب یاسر عرفات نے امن معاہدے پر دستخط کئے جس کے نتیجے میں ٹوٹا پھوٹا ہی سہی ایک فلسطینی ملک، دنیا کے نقشہ پر دیر سویر میں دیکھنے کی امید تو دکھائی دی ــــ پچاس سال کی فلسطینیوں کی خونی جدوجہد بالآخر کسی نہ کسی صورت میں، ہلکی یا بھاری، کامیابی سے ہمکنار تو ہو کر رہی۔

ماہ جولائی میں پاکستان کے وزیر اعظم جناب نواز شریف نے استعفیٰ دیدیا۔ اور پارلیمنٹ کو توڑ دیا اس کے بعد اکتوبر میں پاکستان کی پارلیمنٹ کے انتخابات میں مذہبی جماعتوں کے امیدواروں کو سخت سخت بلکہ عبرت ناک شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور خاتون رہنما بے نظیر بھٹو ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کی دوبارہ وزیر اعظم منتخب ہو گئیں۔ یہ پاکستان سے متعلق دنیا نے چونکا دینے والا منظر دیکھا مگر پاکستان کے لاابالی قسم کے مذہبی رہنماؤں نے کیا سبق لیا اس کے بارے میں ہنوز ابھی تک کوئی خبر نہیں ہے ـــــ ۱۹۹۳ء میں ایک اور سب سے بڑی بات ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ برسہا برس سے چلی آ رہی سیاہ فام لوگوں کی جنوبی افریقہ میں گوری سرکار جو اقلیت میں ہے، کے خلاف جدوجہد کے نتیجہ میں ۲۲ دسمبر ۱۹۹۳ء کو جنوبی افریقہ کی سفید فام پارلیمنٹ نے ایک آئین منظور کر کے سیاہ فام کو مساوی درجہ دیدیا ہے۔ ۱۷ نومبر ۱۹۹۳ء کو جنوبی افریقہ کے لیڈروں نے ملک میں نسلی امتیاز ختم کرنے کے لئے نئے آئین کی جو توثیق کی تھی اس کے نتیجہ میں اب جنوبی افریقہ کی گوری آبادی جو اقلیت میں ہے نے بیویں صدی کی ضرورت اور صورتحال کے پیش نظر بغیر خون خرابے کے، جو تبدیلیاں کی ہیں اسے ہم جنوبی افریقہ کی گوری آبادی کے لیڈروں کی دوراندیشی و تدبر ہی پر محمول کئے بغیر نہ رہیں گے یعنی ۳۴۱ سال تک گورے شاہی کو وہاں جو فوقیت تھی وہ اب ۲۷ اپریل ۱۹۹۴ء کو عام انتخابات کے بعد بالکل ختم ہو جائے گی اور نسلی امتیاز کی جگہ گورے و سیاہ فام

درمیان میں مساوات کا دور شروع ہو جائے گا۔ صحیح قیادت وہی ہے جو حال اور مستقبل
حالات سے پوری طرح خبردار ہو۔ کاش! ایسی ہی دور اندیشی اور تدبر و فکر ہندوستان بلکہ صحیح
معنوں میں یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ عالم اسلام کی قیادت کو نصیب ہو جائے۔

۱۹۹۳ء کا سال عالم اسلام کے تعلق سے اچھا نہیں کہا جاسکتا ہے۔ افغانستان میں سوویت روس
روس کے خلاف وہاں کے مجاہدین نے جو جدوجہد کی اور جس کی وجہ سے دنیا کی دوسری بڑی طاقت بلکہ
بعض لحاظ سے پہلی طاقت سوویت روس پاش پاش ہوکر رہ گئی افسوس یہ ہے کہ اتنی زبردست کامیابی
کے بعد افغانستان کے مجاہدین جس طرح آپس میں ہی اقتدار کے حصول کے لئے برسر پیکار ہیں اسے دیکھ
کر دل و دماغ کو سخت تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔ ۲ رفروری ۱۹۹۳ء کو مجاہدین کے باغی گروپ نے
افغانستان کی راجدھانی کابل کا محاصرہ کرکے اس پر بموں کی بارش کی جس کی وجہ سے ۲۷ بے گناہ افراد
ہلاک ہو گئے۔ افغانستان میں مجاہدین کے آنیکے بعد ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ۱۴ سال سے جو افغانستان
میں تباہی و بربادی کا دور چلا تھا اور ہزاروں لاکھوں انسانوں کی تباہی و بربادی ہو رہی تھی اس کے
سدباب کی کوششیں کی جاتیں، لوگوں کی اجیرن زندگی میں خوشیوں و مسرتوں کی بہار پیدا کی جاتی اور
افغانستان کی تباہی و بربادی کو تعمیر و ترقی میں تبدیل کرنے کے منصوبے بروئے کار لائے جاتے برعکس
اس کے صرف اور صرف اقتدار کی رسہ کشی ہی جاری ہو گئی۔

صومالیہ میں مسلمان روٹی روٹی سے محتاج ہیں۔ بوسنیائی سربوں نے مسلمانوں پر ظلم و ستم کے
پہاڑ پہ پہاڑ توڑ رکھے ہیں۔ ادھر اسرائیل باوجود پی ایل او سے امن معاہدے کے فلسطینیوں پر ظلم و جبر کا
سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے عراق پر سے ابھی تک امریکہ کی منشا وایما پر اقوام متحدہ کی طرف سے
لگائی گئی اقتصادی پابندیوں کا خاتمہ نہیں ہوا ہے جبکہ عراق کو ہر طرح سے پریشان و ذلیل و خوار اور
ایٹمی ہتھیاروں کی کھوج بین کی آڑ میں اس کی خودداری اور اس کی سالمیت تک کو مجروح کیا جارہا ہے اس
کے باوجود اس کے لئے انسانیت و رحم کے تمام دوش بالائے طاق رکھ دیئے گئے ہیں۔ اس کے
ساتھ ایک اور ابھرتا ہوا مسلم ملک لیبیا کو اقتصادی ناکے بندیوں کے جال میں جکڑنے کی پلاننگ
کی جارہی ہے۔ اسی ضمن میں یہ خبر بھی پڑھ لی جائے تو بہتر ہوگی اور شاید اس میں مسلم رہنماؤں کو
مستقبل میں اپنی تدبیر کے لئے کچھ سامان وصالحہ دستیاب ہو جائے۔

عیسائی اور یہودیوں کی دو ہزار سالہ رقابت ۱۹۹۳ء میں ختم ہوگئی ہے اور دسمبر ۱۹۹۳ء میں عیسائیوں کے سب سے بڑے مذہبی رہنما پوپ پال دوم نے اسرائیل کے ساتھ ویٹیکن کے سفارتی تعلقات و دوستی میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا باب شروع کیا ہے۔ کیا اس کے بعد عیسائیت اور یہودیت دونوں مل کر اسلام کے خلاف مستعد عمل ہوں گے اس کا اندازہ و احساس عالم اسلام کے رہنماؤں کو اگر ہوگیا ہے تو سبحان اللہ! اور اگر خدانخواستہ وہ عیسائیت اور یہودیت کے میل جول سے آنے والے وقت میں جو اسلام کے خلاف منصوبے رو بہ عمل میں لائے جائیں گے اس سے بے باخبر نہیں تو ہم صرف یہاں اس موقع پر انا للہ وانا الیہ راجعون ہی پڑھنے کے اور کیا کر سکتے ہیں!

کیا عالم اسلام کی قیادت اب بھی سوئے رہے گی؟ اور کیا عالم اسلام میں کوئی ایسا رہنما یا قائد پیدا ہوگا جو اس سب صورتحال کی موجودگی میں کوئی مثبت لائحہ عمل مرتب کرے تاکہ عالم اسلام کو راحت نصیب ہو اور اس کے آنسو پونچھ سکیں۔

دعا ہے خداوند تعالیٰ سے کہ سال ۱۹۹۴ء بنی نوع انسانی کے لئے بہتری کا باعث ہو!

دیار اعظم گڈھ کے چند غیر معروف مشائخ

از:- قاضی اطہر مبارکپوری

آٹھویں صدی میں جونپور کی تاسیس ۷۷۲ھ کے بعد خصوصاً شرقی سلطنت کے قیام کے بعد دیار پورب کا قریہ قریہ علماء و مشائخ اور ارباب علم و فضل کا مسکن بن گیا جس میں موجودہ ضلع اعظم گڈھ کا علاقہ بھی شامل تھا۔ اس سرزمین سے بہت سے ایسے علماء و مشائخ اٹھے اور یہیں آسودۂ خاک ہوئے جنکے نام و نشان کا پتہ نہیں ہے، اور تذکرہ و تراجم کی نادر و نایاب کتابوں میں کہیں کہیں ان کا ذکر ملتا ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے۔ تلاش بسیار کے بعد ان غیر معروف مشائخ میں چند حضرات کے نام اور مختصر حالات مل سکے ہیں جنکو یہاں بیان کیا جاتا ہے۔ ان بے ترتیب اور منتشر تذکروں سے کچھ نہ کچھ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

حضرت شیخ یوسف حسن چڑیاکوٹی ۸۲۲ھ آپ علاقہ چڑیاکوٹ کے فاتح، اس کے بانی اور وہاں کے عباسی خانوادہ کے مورث اور جدِ اعلیٰ ہیں، ان کا تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں شیخ وجیہ الدین اشرف لکھنوی نے بحر زخار میں اور خزینۃ الاصفیاء کے مصنف نے کیا ہے۔ نیز ایک قلمی کتاب جو چڑیاکوٹ کے کسی عالم کی تصنیف ہے اور فارسی زبان میں ہے، اس کے اوراق مجھے مل گئے تھے اور میں نے ان کو نقل کر لیا تھا، اس میں شیخ یوسف حسن چڑیاکوٹ میں جنگ اور اس کی تاسیس کا ذکر ہے، ان ہی مراجع سے ان کا تذکرہ مرتب کیا جا رہا ہے، تین کتابوں میں ان کا مختصر تذکرہ ہے مگر نواحی چڑیاکوٹ کی جنگ و فتح وغیرہ کی تفصیل دوسری جگہ نہیں ملتی ہے اس لئے انکے [illegible] سے اس موضوع کی ابتداء کی جاتی ہے۔ شیخ یوسف حسن کی دینی و روحانی عظمت کا اندازہ [illegible] سے ہوتا ہے کہ وہ حضرت شیخ نصیر الدین اودھی چراغ دہلیؒ کے بھانجے حضرت شیخ نظام الدین

اولیاؒ کے عزیز ترین مرید اور دو واسطہ سے حضرت شیخ عبداللہ شطاریؒ کے فیض یافتہ ہیں۔
بحر زخار میں انکا تذکرہ ان القاب سے شروع ہوتا ہے: "آں شجر بر بار نظامی، وآں آب یافتہ
انہار جامی وآں واقف اسرار القاسی، یوسف حسن عباسی چریاکوٹی، فرزند اعزالدین، و خواہر
زادہ مخدوم نصیر الدین چراغ دہلوی است" حضرت شیخ نظام الدین کے محبوب ترین مریدوں
میں سے تھے، شیخ نظام الدین ان پر بے انتہا شفقت فرماتے تھے، ان کے علم و فہم کی وجہ سے
ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے، ان کی رائے صوفیہ کے بارے میں اس قدر صائب تھی کہ کوئی بات
ان کی روش اور قاعدہ کے خلاف نہیں کہتے تھے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کرنا چاہیئے کہ ایک
مرتبہ شیخ نظام الدین اولیار نزہۃ الارواح کا درس دے رہے تھے، اور ہر شخص کی عقل و استعداد
کے مطابق مطلب بیان کرتے تھے، شیخ یوسف حسن نے ایک مقام کی ایسی تشریح کی کہ شیخ
نظام الدین نے خوش ہوکر اپنا یہ دوھا سنایا۔

سات پانچ رن نربا پانچین بول کہیں قیاسی
ان سبھن میں سانچا پانچے یوسف حسن عباسی

ان کی وفات ۱۵ رجب ۸۲۲ھ میں ہوئی۔ (بحر زخار قلمی)

شیخ عبدالحق دہلوی لکھتے ہیں کہ شیخ یوسف چریاکوٹی مشرب شطاریہ کے درویش تھے
ان کا حلقۂ ذکر عجیب ہوتا تھا، حلقہ کے درمیان عاشقانہ اشعار پڑھتے تھے، اور وجد میں آ
تھے، تصوف و روحانیت میں بلند مرتبہ رکھتے تھے، دو واسطہ سے شیخ عبداللہ شطاری سے
نسبت رکھتے تھے۔ میرے والد ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے انکو ذکر کی تلقین کی
اس وقت ان کی اولاد دوآبہ کے بعض قصبات میں موجود ہے۔ (اخبار الاخیار ص ۲۳۶)

خزینۃ الاصفیار میں ہے کہ شیخ یوسف حسن عباسی چریاکوٹی شیخ نصیر الدین چراغ
کے بھانجے اور عمر میں ان سے بڑے تھے، یہ دو بھائی تھے، دوسرے کا نام شیخ کمال الدین
تھا۔ شیخ نصیر الدین کبھی کبھی اپنے مرشد و شیخ نظام الدین اولیا سے اجازت لیکر اپنی ہمشیرہ
محترمہ کی ملاقات کے لئے آیا کرتے تھے۔ (خزینۃ الاصفیار)

چریاکوٹی عالم نے بیان کیا ہے کہ شیخ کمال الدین حامد کا مزار اور خانقاہ

میں ہے، اور شیخ یوسف حسن شیخ اسماعیل کے نام سے مشہور ہیں جن کا مزار موضع رسول پور پرگنہ چریاکوٹ میں ہے۔

سلطان محمد بن تغلق کے دور سلطنت میں شیخ یوسف حسن کو جاگیر عطا ہوئی، اس کے بعد انھوں نے ایک زبردست لشکر لے کر علاقہ چریاکوٹ پر حملہ کیا، یہاں چریا (چیرد) قوم کی بہت بڑی آبادی تھی، او کا ایک مستحکم قلعہ تھا، یہ قوم سرکش اور ظالم تھی لوٹ مار اس کا پیشہ تھا اس کو زیر کرنے کے لیے یہ کارروائی ہوئی۔ اس قوم سے سلطانی لشکر کا سخت مقابلہ ہوا، باوجودیکہ چریا قوم بندوقوں سے جنگ کر رہی تھی سلطانی لشکر قلعہ کے دروازے تک پہونچ گیا مگر مقامی جنگ بازوں نے دروازہ بند کرا دیا، اس کے بعد سواروں کا ایک دستہ آیا جس نے قلعہ کو فتح کیا اور مقامی لوگوں نے اطاعت قبول کی۔ اس کے بعد شیخ یوسف حسن نے اس علاقہ میں امن وامان قائم کیا اور چریا قوم کے سرداران کے مطیع و معتقد ہو گئے، البتہ انھوں نے گذارش کی کہ ان کا نا باقی رکھا جائے۔ شیخ یوسف حسن نے ان کی خواہش پر اس بستی کا نام یوسف آباد عرف چریاکوٹ (چریا قوم کا قلعہ) رکھا، اس کے بعد اس پورے علاقہ میں اسلام اور مسلمانوں کو شان و شوکت حاصل ہوئی۔

مولوی نجم الدین چریاکوٹی نے یوسف آباد چریاکوٹ کے بارے میں کہا ہے۔

چریاکوٹ خوانندش عواش　　ولیکن یوسف آباد ست نامش
فلک تا طرح این آباد بنہاد　　زخاک پاک جنت کرد بنیاد
چراغ آسماں روشن ز دودش　　ز جنت می رسد ہر دم درودش

(تذکرہ علمائے ہند ص ۲۳۶) اعظم گڈھ گزیٹیر میں بھی چریاکوٹ کا اصل نام یوسف آباد بتایا گیا ہے۔

حضرت شیخ مبارک چشتی قدس سرہٗ

مولوی سید امام الدین نقوی گلشن آباد برکات الاولیا میں لکھتے ہیں کہ آپ مشاہیر اولیا ... یمن سے ہیں، عدن کے رہنے والے تھے، چشتیہ کی نعمت و خلافت رکھتے ہیں ... ہندوستان آئے، اور سکندر پور ضلع اعظم گڈھ میں سکونت اختیار کی جب

آپ کی بزرگی نے شہرت کی، اور خوارق عادات آپ سے ظاہر ہونے لگے، بادشاہ وقت آپ کا معتقد ہوا، چند زمینیں انعام آپ کے اخراجات خانقاہ کے لئے مقرر کیں، ہزاروں لوگوں نے آپ سے فیوضات باطنی اخذ کئے ۱۰۱۶ھ میں آپ کا وصال ہوا، سکندر پور میں آسودہ ہیں، تاریخ

بزرگے در سکندر پور مشہور | قناعت پیشہ در فقر مسرور
اگر سال وفاتش را بجوئید | مبارک رفت از دنیا بگوئید

شیخ تاج محمد چشتی آپ کے فرزند بھی بڑے صاحب علم و کمال تھے، ۱۰۴۷ھ میں انکی وفات ہوئی۔ اپنے والد ماجد کے متصل آسودہ ہیں۔ [۱]

حضرت میر سید علاء الدین سہروردی ماہلی رح

میر سید علاء الدین سہروردی حضرت میر سید علی قوام (میر علی عاشقان) کے معاصر صاحب کمال بزرگ تھے، شاہ محسن الزمان متوطن نور پور نواح ماہل کا بیان ہے کہ ان کا مزار قریہ مذکورہ میں ماہل کے علاقہ میں ہے، آپ قریہ مذکورہ میں اس کے ایک درخت کے سایہ میں فروکش ہوئے تو وہاں کے کافر زمیندار نے کئی بار وہاں پر قیام سے منع کیا مگر آپ وہاں سے نہ ہٹے، زمیندار نے خس و خاشاک جمع کر کے اس درخت کو آگ لگا دی، آپ نے کہا کہ یہ تدبیر بھی فقیر کے یہاں رہنے کی تدبیر ہے، اس جلے ہوئے درخت کی راکھ جہاں تک جائے گی وہاں تک فقیر کا عمل دخل ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا (بحر زخار کے مصنف وجیہ الدین اشرف کا بیان ہے کہ) آج تک ۱۲۰۱ھ ہے ایک کروہ تک اس علاقہ میں جنگل ہے، اور روز بروز یہ جنگل بڑھتا جا رہا ہے، شیر شاہ سوری ایام طفولیت میں اپنے والد کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کی خصوصی توجہ چاہی، اور ہندوستان کی بادشاہی کا متمنی ہوا۔ خدا کی شان کہ آخر ایسا ہی ہوا اور شیر شاہ دہلی کا بادشاہ ہوا۔ (بحر زخار ص ۱۱۳ ب)

حضرت شاہ راجہ اعظم ماہلی رح

ان کا تذکرہ ان القاب سے شروع ہوتا ہے احوال آن مالک کمال را سرور، آن اقلیم کرامت را افسر، آن بخلف

---

[۱] برکات الاولیاء ص ۹۲، ۹۳، افضل المطابع دہلی ۱۳۲۳ھ۔

رشد خواجہ حضرت شاہ راجا اعظم سلطان سید اشرف جہانگیر کے خلیفہ ہیں۔ ان کا مزار قصبہ مال میں ہے روضہ میں سرہانے کی دیوار میں شگاف ہے کہتے ہیں کہ شاہ راجا اعظم نے فرمایا ہے کہ جو شخص میری زیارت کے بعد اس راستے سے باہر جائے گا اس پر آتش دوزخ حرام ہے۔ ان کے مرقد سے ظاہری و باطنی تصرفات جاری ہیں ان کو راجہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ چند محال کے زمیندار تھے، جذبۂ حق کا غلبہ ہوا تو اس کو چھوڑ کر سلطان سید اشرف جہانگیر سے بیعت ہو گئے اور ان کی تلقین و تربیت سے مرتبۂ ولایت کو پہنچ گئے اس کے باوجود سید اشرف نے ان کے قدیم لقب راجہ کو موقوف نہیں کیا، اسی بنا پر اس لقب سے مشہور ہیں۔ کرامات الاولیاء میں ہے ایک مرتبہ سید اشرف جہانگیر ابراہیم مجذوب کی ملاقات کو گئے، شاہ راجا اعظم بھی ان کے ہمراہ تھے، مجذوب نے کھانا پیش کیا اور شاہ راجہ اعظم سے کہا کہ تم بھی کھاؤ چونکہ ان کے مرشد نے کہا تھا کہ تم تارک نماز کی ہمسائگی بھی قبول نہ کرنا اس لئے کھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں تارک نماز کے ساتھ کھانا نہیں کھاؤں گا، اس پر مجذوب کو غصہ آیا اور شاہ راجہ پر حملہ کرنا چاہا، سلطان سید اشرف نے معذرت کر کے بیچ بچاؤ کیا، اور وہاں سے اٹھنے کے بعد شاہ راجہ سے کہا کہ مرید کو مرشد کے ارشاد پر ایسا ہی اعتقاد رکھنا چاہیئے۔ البتہ موقع محل کا لحاظ ضروری ہے۔ (بحر زخار ص ۳۴۹، ۳۵۰)

حضرت شاہ منصور مٹھولیہ

شیخ وجیہ الدین اشرف ان کا تذکرہ یوں شروع کرتے ہیں آں والا آں صاحب کشف و کمال، آں باظہار کرامت عدیم المثال آں بہ نا کس خرق عادات معمور، مشہور روزگار حضرت شاہ منصور، تسبیح گردانی کی کثرت کی وجہ سے انکو منصور مٹھولیہ کہتے ہیں، ان کا وطن اصلی جونپور ہے اور شاہجہاں آباد (دہلی) کے محلہ بیچ منڈی میں رہتے تھے، خانوادۂ قادریہ میں شیخ عبداللہ بھٹوی کے مرید اور مخدوم جہانیاں سید جلال حسین بخاریؒ کی روحانیت سے فیض یافتہ صاحب فضل و کرامات اور بابرکت بزرگ تھے، ابتدا میں متاہل نہیں تھے، اور نہ کوئی ذریعہ معاش رکھتے تھے، مخدوم جہانیاں کے روحانی اشارہ پر اپنے وطن اصلی جونپور سے ضلع اعظم گڈھ میں چھ سو بیگھ بنجر زمین خرید کر جہانیاں پور کے نام سے بستی بسائی باقی زمین زراعت کر کے متاہل زندگی اختیار کی۔

یہ انکی عجیب کرامت ہے کہ اس بنجر زمین میں زرخیز زمین سے بہتر پیداوار ہوتی ہے بلکہ ایک

مرتبہ زعفران بھی اگا تھا، کسی حاکم کو یہ ہمت نہیں تھی کہ اس زمین کی لگان ان کے فرزندوں سے طلب کرے۔ جس نے اس زمین کی ضبطی کا ارادہ کیا اس کا ہاتھ سوکھ گیا اور جس نے اس قسم کی بات کی اسکو لقوہ کی بیماری ہوگئی۔

شاہ منصور کا مزار جہانیاں پور میں زیارت گاہ خلائق ہے، ان کے خلفاء میں یہ چار حضرات ترک و تجرید، عشق و صفا اور علوئے مقامات میں بڑا مرتبہ رکھتے ہیں۔ (۱) شاہ محمد مکی کا مزار جونپور میں ہے (۲) شاہ فانی کا مزار برسانٹھ؟ میں ہے (۳) شاہ بالا کا مزار نواح بغداد میں ہے اور (۴) شاہ شمران کا مزار بھی سواد بغداد میں ہے۔ (بحر زخار ص ۵۴۶)

میر سید حمید الدین محمد آبادیؒ

حضرت میر سید حمید الدین بن سید تاج الدین بن سراج الدین بن سید کمال الدین بن سید محمود بن سید اجل ترمذی محمد آبادی سلطان ابراہیم شرقی کے دور حکومت (۸۰۴ھ تا ۸۴۴ھ) میں تھے، محمد آباد میں سکونت رکھتے تھے قاضی شہاب الدین دولت آبادی، میر سید صدر جہاں اجل، اور مخدوم سید اشرف جہانگیر کے معاصر تھے، ان کے پانچ لڑکے تھے۔ (۱) سید محمد (۲) سید حسن (۳) سید محی الدین (خلیفہ دیوان محمد رشید جونپوری) (۴) سید پھول (۵) سید میران، یہ سب کے سب صاحب اولاد تھے (بیاض شاہ اجمل الہ آبادی) شاہ میران جان خلف اکبر سید شاہ علی جعفر نے اپنی کتاب تکملہ وفیات الاعلام میں لکھا ہے کہ حادثہ غدر ۱۸۵۷ء سے چند روز قبل میں اپنے چچا شاہ امین الدین قیصر کے صاحبزادے برادر عزیز شاہ محمد علیم کی شادی کی تقریب میں دلید پور گیا تھا، وہاں سے محمد آباد دو فرسنگ پر واقع ہے، درمیان میں ٹونس ندی جاری ہے، مقصد اپنے دادا میر سید حمید الدین کے مزار کی زیارت تھا، حکیم صاحب موصوف؟ اس وقت زندہ تھے، ان سے قبر کا نشان معلوم کیا جو حکیم صاحب کے مکان سے دو میل کے فاصلہ پر ہے، وہاں پہونچکر اپنے دادا کے مزار کی زیارت سے مشرف ہوا۔

سید خان محمد آبادیؒ

سید خان محمد آبادی اور محمد آباد کے دیگر اہل علم کا تذکرہ ایک واقعہ کے ضمن میں مشکوٰۃ النبوت تصنیف سید علی موسوی حیدر آبادی میں میر سید اشرف جہانگیر کے ذکر میں ہے کہ وہ اپنے پیر و مرشد شاہ علاء الدین کے حکم سے جونپور (کچھوچھہ) آئے۔ ایک مرتبہ وہاں سے قصبہ محمد آباد گئے اور وہاں کے علماء کی ایک جماعت ملاقات کے لئے آئی۔

تنازعے کی بحث گویا ایک رسالہ کی بات نکلی جسکو سید اشرف جہانگیر نے خلفائے راشدین کی منقبت میں لکھا تھا، سب لوگوں نے اس کے دیکھنے کی خواہش کی۔ ملا حسین کتابدار نے سید اشرف کی اجازت سے وہ رسالہ لوگوں کو دیا، جب علماء نے دیکھا کہ اس رسالہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب دوسرے خلفاء رضی اللہ عنہم سے زیادہ ہیں تو ان سے بحث و مباحثہ میں سخت رویہ اختیار کیا، سید اشرف نے معقولی و منقولی انداز میں سمجھایا مگر ان لوگوں نے ایک نہ سنی، اور واپس جاکر سید اشرف کی نسبت رفض کی طرف کی اور ایک استفتار تیار کیا تاکہ جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ اس کو پیش کریں سید خان نہایت عقلمند اور سرگروہ فضلا تھے، انہوں نے خواب دیکھا کہ سید اشرف جیسا کوئی نہیں ہے۔ جس کو خاطر میں لایا جائے، اور ان سے مقابلہ کر سکے، اگر دارین کی خیریت چاہتے ہو تو توبہ کرکے ان سے معذرت کرو، سید خان نے صبح کو پریشان حال سید اشرف کی خدمت میں ہوکر عرض کیا کہ استفتار کا جواب میں دوں گا، آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، چنانچہ نماز جمعہ کے بعد جب استفتار پیش کیا گیا تو سید خان نے سید اشرف سے کہا کہ لوگوں کے خیال میں آپ کی غلطی یہ ہے کہ رسالہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منقبت تھوڑی زیادہ ہے۔ سید اشرف نے اس کا اقرار کر لیا، اس پر سید خان نے کہا کہ یہ غلطی غیر سید کی طرف سے ہو تو قابل گرفت ہے نہ سید سے، اگر کوئی آدمی اپنے ماں باپ کی تعریف میں غلو کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، یہ سنکر علماء نے ان سے کہا کہ اس کی دلیل بیان کریں، سید خان نے کتاب جامع العلوم سے یہ عبارت پیش کی الناس ابناء الدنیا و لا یُلام الرجل علی حبّ ابویہ و بمدحھما۔ یعنی لوگ دنیا میں ایک دوسرے کے بیٹے ہیں اور کسی شخص کو اپنے والدین کی محبت اور ان کی تعریف پر ملامت نہیں کی جا سکتی ہے، اس کے بعد تمام معترضین خاموش ہو گئے، اور تمام لوگوں نے سید اشرف سے معذرت کی، سید اشرف نے سید خان کو اولاد کی بشارت دی۔ (مشکوٰۃ النبوت قلمی ص ۱۱۹) مخطوطہ میں قصبہ محمد آباد کے بجائے قصبہ محمد پور ہے مگر دیگر مراجع سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ قصبہ محمد آباد کا ہے۔

مولوی سید عبدالکریم

مولوی سید عبدالکریم بن مولوی سید برکت علی کا سلسلۂ نسب چار واسطے سے شاہ نثار علیؒ سے ملتا ہے ۱۲۴۶ھ میں ظفر آباد

میں پیدا ہوئے اور نشو ونما اعظم گڈھ میں ہوئی اور مدفن بھی یہیں ہے، والد مولوی سید برکت علی کے زیر تربیت میں فارسی کی تعلیم ان ہی سے حاصل کی، اس کے عربی کی تعلیم شرح تہذیب تک مولوی ساجد علی محمد آبادی سے پائی، شرح جامی سے شرح وقایہ تک مولوی ولی محمد سے، ملا جلال الدین حاشیہ میر زاہد مولانا سخاوت علی سے پڑھکر ملا فقیر شاہ کابلی سے سند فراغت حاصل کی۔ قرأت قاری نور محمد سے پڑھی اور مشق کی، قرآن شریف بہت خوش الحانی اور درد انگیز آواز سے پڑھتے تھے۔ خانوادۂ قادریہ نقشبندیہ میں قاضی عنایت حسین چریاکوٹی سے بیعت تھے، بہترین خطاط اور خوشنویس تھے، عربی وفارسی نظم ونثر میں مہارت تامہ رکھتے تھے، شاعری میں صوفی تخلص تھا اشعار میں فصاحت، بلاغت اور بدائع وصنائع کا اہتمام کرتے تھے، اور لفظی ومعنوی رعایت پر خاص توجہ دیتے تھے، نہایت جوان صالح اور ذی استعداد عالم تھے، فراغت کے بعد درس وتدریس کا سلسلہ جاری کیا، افسوس کہ جوانی ہی میں چھبیس[۲۶] سال کی عمر میں آٹھ محرم ۱۳۱۴ھ میں انتقال کیا۔ ان کی خام قبر اعظم گڈھ باغ عیدگاہ میں ہے" (تجلی نور ج ۲ صفحہ ۱۷ تا ۱۹)

قاضی نور اللہ گوپال پوریؒ اور ان کے بھائی قاضی خوب اللہؒ

مغل دور میں پرگنہ گوپال پور پرگنہ سگڑی کے مغرب میں تھا جس سے متعلق بہت سے گاؤں اور دیہات تھے، جن میں قاضی سرائے، شیخو پور، غلوہ نصیر الدین پور، بلیر گنج وغیرہ تھے۔ یہاں دو بزرگ اور عالم قاضی نور اللہ اور ان کے بھائی قاضی خوب اللہ گذرے ہیں، جنکا مختصر حال حضرت شاہ ابو الغوث گرم دیوان کے پردادا شاہ اسماعیل بن شاہ ابو الخیر بھیروی (ولادت ۱۰۳۴ھ اور وفات ۱۰۷۱ھ) کے ذکر میں شمس الدین حیدری نے مناقب غوثی میں بیان کیا ہے یہ کتاب شاہ ابو الغوث گرم دیوان بھیروی لہراویؒ کے حالات میں فارسی زبان میں ہے، شیخ شمس الدین حیدری مصنف مناقب غوثی لکھتے ہیں کہ راقم الحروف ایک تقریب میں قصبہ گوپال پور گیا تھا، اتفاق سے اس جگہ قاضی نور اللہ سے ملاقات ہوئی جو کہ مرد صادق تھے، باتوں باتوں میں قاضی صاحب نے بتایا کہ میں حضرت مخدوم شاہ اسمٰعیل کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، انہوں نے انتہائی توجہ کا مظاہرہ فرمایا اور میرے بھائی قاضی خوب اللہ نے بڑی محنت سے علم حاصل

کیا ہے، تعجب ہے کہ اس دیار ناپرساں میں کوئی شخص ان کا قدر شناس نہیں ہے، پھر فرمایا کہ میرا خیال ہوتا ہے کہ شیخ خوب اللہ کو بلا کر حاکم وقت سے کہوں کہ ان کے حالات کی درستگی پر پوری توجہ کرے، اگر وہ ان کی خدمت کرنے میں توقف کرے تو بادشاہ وقت سے کہوں کہ ان کے لئے وجہ معاش کے طور پر وظیفہ مقرر کردے، شاہ اسمٰعیل کی باتوں پر میں نے سوچا کہ دیکھنا چاہیئے ان کی باتوں کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ چند دن کے بعد دیکھا کہ راجہ عظمت خاں نے بڑی آرزو سے شیخ خوب اللہ کو اپنے یہاں عظمت گڈھ میں طلب کر کے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا، مگر کچھ دنوں کے بعد وظیفہ میں کمی کردی، اور شیخ خوب اللہ برداشتہ خاطر ہو کر شاہ جہان آباد (دہلی) چلے گئے، اور سلطان وقت نے ان کے احوال و کمالات پر مطلع ہو کر تعمیر احوال پر پوری توجہ دی، اور شیخ خوب اللہ بڑے سکون و اطمینان سے زندگی بسر کرنے لگے شیخ نور اللہ کا بیان ہے کہ اس واقعہ کے بعد مجھکو شاہ مخدوم اسمٰعیل کی باتیں یاد آئیں اور ان کی تصدیق ہوگئی۔

قاضی نور اللہ نے دوسرا واقعہ یہ بیان کیا کہ ایک مرتبہ میں اپنے بھائی شیخ خوب کے ہمراہ حضرت مخدوم شاہ اسمٰعیل کی خدمت میں حاضر ہوا اور فوری ضرورت کی وجہ سے جلد واپس ہونے لگا اور جب رخصت ہونے کی اجازت چاہی تو فرمایا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ فقیر کے یہاں نان خشک ملے گی، آگے جا کر عمدہ عمدہ غذا ملے گی، میں نے سوچا کہ حضرت مخدوم کی بات صحیح ہوگی اگرچہ یہاں سے گھر تک کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں خشک روٹی بھی ملے، عمدہ عمدہ غذا کہاں ملے گی، راستہ میں اتفاق سے ایک شخص ملا جس نے خبر دی کہ شیخ چھتن جونپوری ایک تقریب میں محی الدین پور تشریف لائے ہیں، (محی الدین پور رویدپور بھیرا کے قریب واقع ہے) میں نے اپنے بھائی خوب اللہ سے کہا کہ مولوی صاحب کی خدمت میں چلنا چاہیئے۔ میں نے مدتوں ان سے فیض پایا ہے، چنانچہ ہم دونوں مولوی صاحب کی ملاقات کے لئے روانہ ہوئے اور جب ہم وہاں پہونچے تو مولوی صاحب کے سامنے سفرۂ ضیافت بچھایا جارہا تھا، ہم نے بھی عمدہ اور لذیز غذائیں تناول کیں، سبحان اللہ مخدوم اسمٰعیل کے تصرفات کی کوئی حد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو روشن کرامتیں عطا فرمائی ہیں (مناقب غوثی قلمی) ان دو واقعات

میں پیدا ہوئے اور نشو ونما اعظم گڈھ میں ہوئی اور مدفن بھی یہیں ہے، والد مولوی سید برکت علی
کے زیر تربیت میں فارسی کی تعلیم ان ہی سے حاصل کی، اس کے عربی کی تعلیم شرح تہذیب تک
مولوی ساجد علی محمد آبادی سے پائی، شرح جامی سے شرح وقایہ تک مولوی ولی محمد سے، ملا جلال اور
حاشیہ میر زاہد مولانا سخاوت علی سے پڑھکر ملا فقیر شاہ کابلی سے سند فراغت حاصل کی، قرأت
قاری نور محمد سے پڑھی اور مشق کی، قرآن شریف بہت خوش الحانی اور درد انگیز آواز سے
پڑھتے تھے۔ خانوادۂ قادریہ نقشبندیہ میں قاضی عنایت حسین چریاکوٹی سے بیعت تھے، بہترین خطاط
اور خوشنویس تھے، عربی و فارسی نظم ونثر میں مہارت تامہ رکھتے تھے، شاعری میں صوفی تخلص تھا اشعار
میں فصاحت، بلاغت اور بدائع و صنائع کا اہتمام کرتے تھے، اور لفظی و معنوی رعایت پر خاص توجہ
دیتے تھے، نہایت جوان صالح اور ذی استعداد عالم تھے، فراغت کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ
جاری کیا، افسوس کہ جوانی ہی میں چھبیس ۲۶ سال کی عمر میں آٹھ محرم ۱۲۷۴ھ میں انتقال کیا۔ ان کی خام
قبر اعظم گڈھ باغ عیدگاہ میں ہے۔ (تجلی نور ج ۲ صفحہ ۱۷ تا ۱۹)

قاضی نور اللہ گوپال پوریؒ اور ان کے بھائی قاضی خوب اللہؒ

مغل دور میں پرگنہ گوپال پور پرگنہ سگڑی کے مغرب میں تھا جس سے متعلق بہت سے
گاؤں اور دیہات تھے، جن میں قاضی سرائے، شیخو پور، غلوہ نصیر الدین پور، بلیر گنج وغیرہ
یہاں دو بزرگ اور عالم قاضی نور اللہ اور ان کے بھائی قاضی خوب اللہ گذرے ہیں، جنکا مختصر
حال حضرت شاہ ابو الغوث گرم دیوان کے پردادا شاہ اسماعیل بن شاہ ابو الخیر بھیروی (ولادت
۱۰۳۴ھ اور وفات ۱۱۰۰ھ) کے ذکر میں شمس الدین حیدری نے مناقب غوثی میں بیان کیا ہے
یہ کتاب شاہ ابو الغوث گرم دیوان بھیروی لہراویؒ کے حالات میں فارسی زبان میں ہے۔ شیخ
شمس الدین حیدری مصنف مناقب غوثی لکھتے ہیں کہ راقم الحروف ایک تقریب میں قصبہ گوپال
پور گیا تھا، اتفاق سے اس جگہ قاضی نور اللہ سے ملاقات ہوئی جو کہ مرد صادق تھے، باتوں باتوں میں
قاضی صاحب نے بتایا کہ میں حضرت مخدوم شاہ اسمٰعیل کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، انہوں
انتہائی توجہ کا مظاہرہ فرمایا اور میرے بھائی قاضی خوب اللہ نے بڑی محنت سے علم حاصل

[illegible]یا ہے، تعجب ہے کہ اس دیار ناپرساں میں کوئی شخص ان کا قدر شناس نہیں ہے، پھر فرمایا کہ
[illegible]یرا خیال ہوتا ہے کہ شیخ خوب اللہ کو بلا کر حاکم وقت سے کہوں کہ ان کے حالات کی درستگی پر
[illegible]پوری توجہ کرے، اگر وہ ان کی خدمت کرنے میں توقف کرے تو بادشاہ وقت سے کہوں کہ ان
[illegible]کے لئے وجہ معاش کے طور پر وظیفہ مقرر کر دے، شاہ اسمٰعیل کی باتوں پر میں نے سوچا کہ
دیکھنا چاہیئے ان کی باتوں کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ چند دن کے بعد دیکھا کہ راجہ عظمت خاں نے
بڑی آرزو سے شیخ خوب اللہ کو اپنے یہاں عظمت گڈھ میں طلب کر کے ان کا وظیفہ مقرر
کر دیا، مگر کچھ دنوں کے بعد وظیفہ میں کمی کر دی، اور شیخ خوب اللہ برداشتہ خاطر ہو کر شاہ
جہان آباد (دہلی) چلے گئے، اور سلطان وقت نے ان کے احوال و کمالات پر مطلع ہو کر تعمیر احوال
پر پوری توجہ دی، اور شیخ خوب اللہ بڑے سکون و اطمینان سے زندگی بسر کرنے لگے شیخ نور اللہ
کا بیان ہے کہ اس واقعہ کے بعد مجھکو شاہ مخدوم اسمٰعیل کی باتیں یاد آئیں اور ان کی تصدیق
ہو گئی۔

قاضی نور اللہ نے دوسرا واقعہ یہ بیان کیا کہ ایک مرتبہ میں اپنے بھائی شیخ خوب کے ہمراہ
حضرت مخدوم شاہ اسمٰعیل کی خدمت میں حاضر ہوا اور فوری ضرورت کیوجہ سے جلد واپس
ہونے لگا اور جب رخصت ہونے کی اجازت چاہی تو فرمایا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ فقیر
کے یہاں نان خشک ملے گی، آگے جا کر عمدہ عمدہ غذا ملے گی، میں نے سوچا کہ حضرت مخدوم کی
بات صحیح ہوگی اگرچہ یہاں سے گھر تک کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں خشک روٹی بھی ملے، عمدہ عمدہ
غذا کہاں ملے گی، راستہ میں اتفاق سے ایک شخص ملا جس نے خبر دی کہ شیخ چھتن جونپوری ایک
تقریب میں محی الدین پور تشریف لائے ہیں، شرہا محی الدین پور رویدہ پور ہھیرا کے قریب واقع
ہے) میں نے اپنے بھائی خوب اللہ سے کہا کہ مولوی صاحب کی خدمت میں چلنا چاہیئے۔ میں نے
مدتوں ان سے فیض پایا ہے، چنانچہ ہم دونوں مولوی صاحب کی ملاقات کے لئے روانہ ہوئے
اور جب ہم وہاں پہونچے تو مولوی صاحب کے سامنے سفرۂ ضیافت بچھایا جا رہا تھا، ہم نے
بھی عمدہ اور لذیذ غذائیں تناول کیں، سبحان اللہ مخدوم اسمٰعیل کے تصرفات کی کوئی حد نہیں
[illegible] اللہ تعالیٰ نے ان کو روشن کرامتیں عطا فرمائی ہیں (مناقب غوث قلمی) ان دو واقعات سے

معلوم ہوتا ہے کہ قاضی نور اللہ اور قاضی خوب دونوں بھائی گیارہویں صدی کے مشرقی دیار کے علماء و مشائخ میں سے تھے، اور علماء و مشائخ سے ان کے گہرے تعلقات تھے (خاص طور سے مخدوم اسمعیل بھیروی ان پر خصوصی توجہ اور نظر رکھتے تھے۔ شیخ شمس الدین نے قاضی نور اللہ کو مرد صادق لکھا ہے اور مخدوم اسمعیل نے قاضی خوب کے بارے میں کہا کہ "قاضی خوب اللہ تحصیل علم مجد نہایت نمود، عجب کہ درین دیار نا پرساں کسے قدر شناس وے نیست" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد و دیار کے مشہور عالم دین تھے، اور عظمت گڈھ کے بعد دہلی گئے تو ان کے علمی جوہر کی قدر شناسی ہوئی۔ یہ دونوں بزرگ مشہور قومی رہنما قاضی کلیم الرحمن ممبر اسمبلی یوپی کے مورث اعلیٰ ہیں۔

شیخ محمود قریشی بایسی مبارکپوریؒ

شیخ محمود قریشی بایسی مبارک پوری شاہجہانی اور جہانگیری دور سلطنت میں مبارک پور کے رئیس اعظم اور بہت بڑے زمیندار و جاگیردار تھے۔ بائیس گاؤں کے مالک تھے، ساتھ ہی مشیخت و بزرگی سے حصہ وافر رکھتے تھے، تعجب ہے اعظم گڈھ ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں ان کا ذکر نہیں ہے جبکہ ان کی زمینداری کا ذکر مبارکپور خاص کے نام سے موجود ہے، وہ مولانا شاہ ابوالخیر بھیروی متوفی ۱۰۵۹ھ کے خسر تھے، جو شاہ جہاں کے درباری علماء میں سے تھے اور رشید و شکر نامی کتاب کے مصنف تھے۔ شمس الدین حیدری نے مناقب غوثی میں ان کے حال میں لکھا ہے۔

سہ زنی در سلک ازدواجیش در آمدہ بودند، اول دختر شیخ عبداللہ کہ از فرزندان قدوۃ العارفین شیخ اسماعیل قدس سرہ بود، دیگر دختر شیخ محمد اخت ملا محمود جونپوری، اما ازاں شرف گوہرے بساحل سلامت نرسید، دیگر دختر شیخ محمود قریشی المعروف بائسی مبارک پوری از دہم فرزندے باقی نماند۔ (مناقب غوثی باب ہشتم)

شاہ ابوالخیر کے تین بیویاں تھیں، پہلی دختر شیخ عبداللہ جس سے شیخ اسماعیل پیدا ہوئے، دوسری دختر شیخ محمد ملا محمود جونپوری کی بہن، ان سے کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی اور تیسری دختر شیخ محمود قریشی جو کہ بائسی مبارک پوری کے نام سے مشہور تھے، ان سے بھی کوئی اولاد باقی نہیں رہی۔

شیخ محمود قریشی پانچ کے مالک تھے، جن میں سے ایک جامع مسجد راجہ صاحب کے جنوب میں

تھا۔ اس کے پاس خندق نامی گڑھی اب تک موجود ہے اور ایک قلعہ املو میں تھا۔ وہاں ان کے نام سے محمود پورہ ایک محلہ ہے۔ ان کے دو بیویاں تھیں، ایک بیوی کی اولاد کو نور پور، حاجی سرائے کا علاقہ دیا جس میں چک احمد (چکیا) نور پور، آدم پور، پیارے پور وغیرہ گاؤں ہیں اور دوسری بیوی کی اولاد کو نور ہیو تات کا علاقہ دیا جو مبارک پور کے مشرق میں ہے، اسی میں مبارک پور کالج ہے سرکاری کاغذات میں یہ دونوں علاقے اپنے ان ہی ناموں سے ابتک درج کئے جاتے ہیں۔ آخری دور میں ان کی اولاد میں شیخ گدا حسین مشہور رئیس و زمیندار تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

شیخ محمود قریشی راجہ اعظم خاں کے معاصر تھے اور دونوں میں رقابت رہا کرتی تھی، حتیٰ کہ راجہ اعظم خاں نے ایک بہانہ سے انکو دریائے ٹونس کے اس پار اپنے علاقہ میں بلاکر قتل کر دیا، اور ان کی اولاد پر بڑا ظلم وستم کیا جس کی وجہ سے وہ املو کے قلعہ میں روپوش ہو گئے تھے۔ اور لوگ ان کا پتہ بتانے سے ڈرتے تھے، وہاں ابتک یہ مثل مشہور ہے "کون کہے کون بیری ہو، محمود کے بیٹے کوٹھے پر"۔ شیخ محمود قریشی کی قبر دریائے ٹونس کے کنارے لکرہٹا کے پاس وہاں کے نالے کو عوام "سیکھنڈ کا نالا" کہتے ہیں جو شیخ محمود کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔　　(۱۲ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ)

شیخ عبدالحکیم خاں صدیقی

امیر تیمور کی یلغار میں جو اہل علم وفضل ولایت بالا سے ہندوستان آئے، ان میں ایک بزرگ شیخ عبدالحکیم صدیقی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے وہ اپنے خاندان کے اٹھارہ لڑکوں اور رجوانوں کے ساتھ سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے دور سلطنت (۸۰۴ھ تا ۸۴۴ھ) میں جونپور تشریف لائے، جو ان دنوں سلطان موصوف کی وجہ سے دہلی ثانی اور دارالعلوم بنا ہوا تھا سلطان ابراہیم نے ان کی آمد کو غنیمت عظمیٰ سمجھکر ان کی پذیرائی کی اور ان کے لئے بہتر سے بہتر انتظام کیا۔ گذر بسر کے لئے جاگیر دی، شیخ صاحب کے فضل وکمال کی وجہ سے سلطان کا اعتماد ان کے بارے میں روز بروز بڑھتا گیا اور وہ مقربین بارگاہ سلطانی میں شمار ہونے لگے۔ صاحبزادگان پختہ عمر کو پہونچکر رزم وبزم میں سلطان کے ساتھ ساتھ رہنے لگے، حتیٰ کہ سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے ان کی خدمات جلیلہ کیوجہ سے خان کے خطاب سے نواز کر نحو پور (سیاہ گوسی) اور دیگر قرب وجوار کے چند پرگنہ جات کی مدار المہامی کا پروانہ عطا کیا، شیخ عبدالحکیم نے اپنی صلاحیت وقابلیت سے

اپنے حلقۂ امارت و حکومت کا بہترین انتظام کر کے مجونی سے بہار تک کا علاقہ شرقی سلطنت کے زیر نگیں کیا جو ابتک شرقی سلطنت میں شامل نہ تھا اور سلطان کے نام کا سکہ و خطبہ جاری کیا۔ شیخ صاحب کی ان خدمات جلیلہ سے سلطان بہت خوش ہوا۔ سلطان حسین شاہ شرقی کے زمانہ تک شیخ صاحب نہایت کامیابی اور نیک نامی سے مدار المہالی کے فرائض انجام دیتے رہے، مگر جب سلطان حسین شاہ سلطان سکندر لودھی ——————

جونپور لودھی امراء و حکام کے زیر تصرف آئی۔ اور شیخ عبدالحکیم معزول کر دیئے گئے۔ اس انقلابی دور کے عزل و نصب اور انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مقامی غیر مسلموں نے مور و ملخ کی طرح ہر طرف سے جمع ہو کر جنگ و جدال کا بازار گرم کیا۔ شیخ عبدالحکیم بھی مع فرزندان و اعوان و انصار کے ان کے نرغے میں پڑ گئے اور بڑی بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔

شیخ فتح خاں اولیارؒ شیخ فتح خاں اولیار بن شیخ عبدالحکیم خاں صدیقیؒ اس معرکہ کے بقیۃ السلف ہیں۔ ان کے بارے میں مناقب غوثی کے مصنف کا بیان ہے کہ اس حادثہ سے پہلے ہی وہ جہاد اصغر کی رعایت کرتے ہوئے جہاد اکبر کے صدر نشین تھے۔ نہایت نیک اور صالح بزرگ تھے۔ ماسوی اللہ سے بے تعلق تھے ان کی ذات بابرکات طبقۂ صوفیہ کے اشغال و اعمال کا مجموعہ تھی، اپنے زمانہ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، ستر کرامت کے باوجود ان سے عجیب و غریب خوارق کا ظہور ہوا۔ یہاں تک کہ ان کا خطاب اولیار پڑ گیا۔ اسی لئے ان کو فتح خاں اولیار کہتے ہیں۔ آخر دم تک خدا پرستی و خدارسی میں زندگی بسر کی، اور نتھو پلور میں انتقال کیا۔

شیخ میر خاںؒ ان کی اولاد میں شیخ میر خاں صدیقیؒ حضرت شاہ ابو الغوث گرم دیوان فاروقی لہرویؒ کے نانا ہیں، نہایت شان و شوکت کے بزرگ تھے، بڑے جاہ و حشم اور منصب کے آدمی تھے۔ امارت و ریاست کے باوجود دنیا سے بے تعلق رہکر عبادت و ریاضت میں زندگی بسر کی، نتھو پور عرف سیاہ میں سکونت رکھتے تھے۔ (مناقب غوثی باب ہشتم قلمی)

حضرت مخدوم شیخ ابراہیم دانشمند محمد آبادیؒ شیخ مخدوم ابراہیم دانشمند حضرت شیخ جمال الدین احمد خطیب حنفی ہانسوی مرید خلیفہ حضرت گنج شکر کی اولاد میں سے ہیں، شرقی سلطنت جونپور کے دور میں قصبہ محمد آباد گوہنہ میں سکونت اختیار کی، اکبر بادشاہ تسخیر بنگالہ کے سفر میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور ان کی زبان

سے فتح کی بشارت سنی تھی، ان کے خوارق و کرامات مشہور ہیں، شیخ مخدوم ابراہیم کا مزار محمد آباد کے پاس موضع کھرانٹی میں ہے، کسی زمانہ میں ۸ صفر کو ان کا عرس ہوتا تھا۔ مخدوم شیخ بوڈھن ساکن اپچولی (ضلع غازی پور) ان کے خلفائے کاملین میں سے ہیں (مرأة الاسرار قلمی از شیخ عبدالرحمن چشتی)

مولوی کرامت علی متولی محمد آبادی

ان کا وطن اصلی محمد آباد گہنہ ہے سید حمیدالدین محمد آبادی کی اولاد سے ہیں اثنا عشری شیعہ تھے، رکھگاؤں ضلع جونپور میں رشتہ داری تھی، وہیں نشو ونما ہوئی۔ صرف ونحو اور متوسطات کی تعلیم مولوی ذاکر علی جونپوری سے حاصل کی، معقولات مولوی ولی اللہ فرنگی محلی لکھنوی سے اور اصول فقہ مولوی نادر علی لکھنوی سے پڑھا علمائے عرب وعجم سے علمی فیض اٹھایا، ان کی تصانیف میں اردو میں ایک رسالہ ماخذ علوم ہے اور فارسی میں رسالہ عروض وقوانی ہے، شاہ ایران فتح علی شاہ کے عہد میں مشہد کے مدرسہ میں تدریسی خدمت انجام دی۔ پھر زرید میں انگلشیہ میں میر منشی اس کے بعد اجمیر میں صدر امین ہوئے، آخر میں امام باڑہ ہوگلی کے متولی بنائے گئے اور تنخواہ ساڑھے نوسو ہوئی۔ ۱۲۸۵ھ میں انتقال کیا اور امام باڑہ حاجی محسن ہوگلی میں دفن کئے گئے۔ (تجلی نور، صہ ۱۴۶)

حضرت شیخ ظہیرالدین محمد آبادیؒ

شیخ مخدوم ظہیرالدین صدیقی محمد آبادی متوفی ۱۰ر ذلحجہ ۸۴۵ھ رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت تاج پور سارن (بہار) میں ہوئی تھی کچھ دنوں حکومت وقت سے منسلک رہکر حضرت شیخ الاسلام بہاءالدین زکریا ملتانیؒ کے پوتے شیخ ابوالفتح رکن الدین ملتانیؒ کی خدمت میں پہونچے اور ان سے بیعت و خلافت کا شرف حاصل کر کے دیار پورب کا رخ کیا اور محمد آباد گوہنہ میں اقامت اختیار کی، اس وقت تعلق خاندان حکمراں تھا۔ ان کا مزار محمد آباد اور خیرآباد کے درمیان شاہراہ کے شمال میں ایک ٹیلے پر ہے جہاں مسجد بھی ہے، اس مقام کو روضہ کہتے ہیں۔ ان کی اولاد میں آگے چل کر ایک بزرگ پیرزادہ محمد ماہ نے املو (مبارک پور) میں سکونت اختیار کی، اور حکومت وقت کی طرف سے رسول پور، موضع ملک شدنی، اور موضع رسول پور بیورا (کھٹورا) کی جاگیر عطا کی گئی، ۱۸۳۶ء کے سرکاری کاغذات میں اس جاگیر کا تذکرہ ہے، ان کا مزار غالباً رسول پور بیورا میں ہے اور مبارک پور کے پورہ دولہن کے شمال مشرق میں پیرزادے کے نام سے مشہور ہے۔ ماضی قریب میں پیرزادہ خاندان میں شاہ مقصود عالم اور شاہ رشید عالم نامور شخص گذرے ہیں، شاہ مقصود عالم کے لڑکے مولانا حکیم شاہ فیاض عالم مولانا عبدالعلیم صاحب رسول پوری کے شاگرد تھے۔ اسی خاندان سے شاہ مخدوم عالم تھے۔ جنکے دو لڑکے ظہور عالم اور علی بخش تھے، مؤخرالذکر کی اولاد سارین (اہرولہ) میں اب تک موجود ہے۔

علی محمود طٰہ کی شاعری میں عورت کا مقام :

علی محمود طٰہ نے عورت کو عظمت و تقدس سے نوازا۔ اس نے شراب کو روحانی لذت اور عورت کو جسمانی لذت کا درجہ دیا ہے۔ اس نے اپنے جن قصائد میں عورتوں کا ذکر کیا ہے، اگر ان کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں اہم قصائد "راقصۃ الحانۃ" جیسا کہ آپ ان اشعار میں دیکھیں گے۔ (۱)

یامن قتلت شبابی فی یفاعتہ   ورحت تسخر من قلبی و اناتی

حرمت ایامی الاولی مفارحها   فما نعمت باوطاری و لذاتی

طاع فوادی معجزونا یرف علی   ماضی لیالی وانعم انت بالآتی

وعنی علی صخرۃ الماضی فان بہا   من الصبابۃ والتحنان مناتی (۲)

قصائد الوصف الغنائی :

ان قصائد میں علی محمود طٰہ کو مہارت حاصل ہے۔ اس نے ایسے الفاظ استعمال کیے کہ جن سے اشعار میں غنائیت پیدا ہوگئی۔ الفاظ کے مناسب استعمال پر اسے قدرت ہے۔ یہ چیز اس کے تمام اشعار بالخصوص قصائد الوصف الغنائی میں موجود ہے۔ مثلاً

این انت الان ام این انا

---

(۱) معاضرات فی شعر علی محمود طٰہ ص ۴۴-۴۵۔

(۲) الملاح التائہ ۱۳۸ بحوالہ معاضرات فی الشعر علی محمود طٰہ ص ۴۴-۴۵

یہاں حرف لام چار بار آیا ہے اور من پانچواں ہے۔ ان حروف میں بڑی ہی لطیف موسیقی ہے اس طرح کی موسیقی اس کے یہاں زیادہ ہے۔ کیونکہ اس کی طبیعت میں موسیقی رچ بس گئی تھی۔ (۱)

الشعر الفکری:

اس کے فکری قصائد میں عشق و محبت کی داستان اور جذبات نہیں ملیں گے۔ ان میں فلسفیانہ اور روحانی شاعری ہے۔ ان میں اس نے روداد سفر بھی بیان کی ہے۔ ان میں فکری، طبعی اور صوفیانہ شاعری کے ساتھ ایسے قصائد بھی ہیں جن میں شجاعت اور شاعر کی آفاقیت و رفعت فکر کا ذکر بھی ہے۔

علی محمود طٰہٰ کی فکری شاعری کے مطالعہ کے لئے ضروری ہے کہ "الملاح التائہ" کا پس منظر معلوم کیا جائے کہ اس نے دیوان کا یہ نام کیوں رکھا۔ یہ نہ صرف عنوان ہے بلکہ عنوان کے حوالے سے اس کی روح اور زندگی کی گہرائیوں اور شاعری کی حقیقت تک پہنچنا آسان ہے۔

"الملاح التائہ" دو لفظ ہیں۔ ایک "الملاحہ" جس کا مفہوم سمندر میں گردش کرنا ہے۔ اور "التیہ" کے معنی گمراہ یا سمندر میں غرق ہونے کے ہیں۔ ان دونوں لفظوں سے یہ بات آشکارا ہوئی کہ اسے دریا سے غیر معمولی محبت تھی اور اس کا اس کی طبیعت اور اس کی شاعری پر گہرا اثر پڑا۔ اس نے اپنے اشعار میں سمندر اور موجوں کی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔ جگہ جگہ اپنی شاعری میں سمندر سے استدلال کیا ہے۔ (۲)

قف من اللیل مصغیا والعباب	وتأمل فی الزبدات الغضاب
صاعات تلوک فی شدتھا الصخر	وترمی بہ صدور الشباب
ھابطات تئن فی تبعثة الریح	ترغی علی الصخور الصلاب (۳)

اس نے "التیہ" سے اپنی شاعری میں کنایۃً بہت کچھ بیان کیا۔ اس کے حوالے سے اس نے حقیقت

---

(۱) محاضرات فی شعر علی محمود طٰہٰ ص: ۸۲۔

(۲) " " " " " ص: ۸۳-۸۴۔

(۳) علی محمود طٰہٰ شعر و دراسۃ ص: ۸۵

شعر اور روحانی مسائل پر روشنی ڈالی۔ وہ کہتا ہے۔

یقودھن علی الامواج من موج   ملاح واد لہ بالتیہ اغراء (۱)

فلسفہ اور رمز۔

علی محمود طہٰ کی فلسفیانہ شاعری سے پہلوتہی نہیں کی جاسکتی۔ ان قصائد میں بنی نوع انسان کی موت و زیست اور بہت سے دیگر دنیاوی مسائل سے اس نے بحث کی ہے۔ ان قصائد میں بہت سے مختلف فیہ اور لاینحل مسائل کو بھی زیر بحث لے آیا۔ حیات انسانی کا تجزیہ روحانی نقطۂ نظر سے کیا۔ اس موضوع کے تحت ازل و ابد اور روح پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ قصیدہ "قلبی" کہتا ہے۔ (۲)

کالنجم فی خفق و فی رمض   متفرداً بعوالم السدم

حیران یتبع حیرۃ الارض   و مصارع الایام والامم

مستوحشاً فی الافق منفردا   وکانہ فی سامر الشعب

ھذا الزحام حبالہ احتشدا   ھو عندہ ناء جد مغترب

متـرنما کالعاشق الـثمل   ریان من بھج و من حزن

نشوان من الم و من امل   مستھزاً بالکون والـزمن

تلک السماء علی جوانبہ   بجو الحیاۃ الغائر الـزبد

کم راح یلتمس القرار بہ   ھیمان بین شواطئ الابد (۳)

قصائد البطولۃ:

وہ شجاعت اور بہادری کو بہت پسند کرتا تھا۔ وہ ہر موقع پر بہادری کو سراہتا۔ وہ جس کام میں بہادری دیکھتا اس کا اپنی شاعری میں ضرور تذکرہ کرتا۔ شجاعت سے فطرت انسانی میں انسیت

---

(۱) علی محمود طہٰ شعر و دراسہ ص: ۸۹

(۲) محاضرات فی شعر علی محمود طہٰ ص: ۹۵

(۳) علی محمود طہٰ شعر و دراسۃ ص: ۳۷۹ - ۳۸۰۔

پیدا ہوتی ہے۔ شجاعت انسان کو تنگنائیوں سے نکال کر روحانیت سے آشنا کرتی ہے۔ یہ صرف ان لوگوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ جن کے اندر روحانی بصیرت موجود ہو اور قوت ارادی منضبوط ہو۔ انہیں چیزوں کی وجہ سے انھیں معاشرہ میں امتیاز حاصل ہوتا ہے۔ ذوق شجاعت بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے، عظیم کارنامے وہی حضرات انجام دیتے ہیں جو صفت شجاعت سے متصف ہوں۔

علی محمود طٰہٰ کو بہادروں سے خصوصی دلچسپی ہے۔ ان لوگوں کی اس نے تعریفیں کیں۔ اس نے مصر کے دو عظیم بہادروں کی موت پر مرثیے کہے اور ان پر رنج و غم کے آنسو بہائے۔ ایک ہی قصیدہ میں دونوں کی صفات بیان کی ہیں۔ (۱)

أنا من يغني بالمصارع في العلى	ويشيد بالاٰلام والأحزان
ماذا وراء الدمع من امنيــة	أو ما وراء النوح من نشدان
اصبحت ذا القلب الحديد الىٰ الّتى	في الناس ذالك الشاعر الانسانى
ووهبت قلبى للغطار فللهوى	شطر وللعلياء شطر ثانى
وعشقت موت الخالدين وعفتُ من	عمرى حقارة كل يوم فان
لولا الضحايا الباذلون دماءهم	طوت الوجود غيابة النسيان (۲)

القصائد الروحانيه:

اس کی شاعری میں متصوفانہ جذبات وخیالات بھی ملتے ہیں۔ تصوف وعبادت سے وہ اعراض نہیں کرتا۔ یہ خیالات ونظریات اس کے قصیدہ "میلاد الشاعر" میں ملیں گے یہاں وہ ایک صوفی شاعر کی شکل میں نظر آتا ہے۔

ادخلوا الان ايها المحسنونا	جنة كنتم بها توعدونا
اجعلوها من البدائع زونا	واملؤها من الجمال فنونا
املؤها نشاو ليس فتو تا	وانشروا الصفو فوقها والسكونا (۳)

(۱) محاضرات فى شعر على محمود طه ص: ۹۹ — ۱۰۰۔

(۲) على محمود طه شعر و دراسة ص: ۵۳۱ — ۵۳۲۔

(۳) ايضاً ص: ۶۳۲۔

القصائد الانسانیہ والقومیہ؛

علی محمود طہٰ بہت ہی درد مند اور رحمدل انسان تھا۔ قومی خدمات کے جذبات اس کے اندر بہت تھے۔ وہ بہت ہی رقیق القلب اور غمگسار تھا۔ زندگی کے نشیب و فراز سے وہ بہت جلد متاثر ہوتا۔ اس کی شاعری میں ایک حصہ ایسا ہے کہ جس کا تعلق دوسروں کی تکالیف اور المناک واقعات سے ہے۔ اس طرح کے واقعات اس کے ذہن و قلب پر بڑے گہرے اثرات چھوڑتے۔

ان قصائد میں اس کا ایک شاندار قصیدہ ایک نابینا لڑکی سے متعلق ہے وہ نابینا لڑکی سارنگی کے ساتھ گاتی ہوئی اسے ایک محفل میں ملی۔ اس معذور لڑکی پر اسے بڑا ترس آیا۔ اس نے اس فرشتہ صفت لڑکی اور اس کے پژمردہ حسن کی بڑی اچھی عکاسی کی ہے۔ اس کی شعر گوئی کا یہ انداز قائین کے لئے بڑا سبق آموز اور نصیحت آمیز ہے۔ نابینا لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا۔ (۱)

خذی الازھار فی کفیک — فاشواک فی نفسی
اذا ماذابت الانداء — فوق الورق النضر
وصب العطر فی اکمام — ابریق من التبر
دعوت عرائس الاحلام — من عالمھا السحری
تذیب اللحن فی جفنیک — والاشجا صدری (۲)

(باقی آئندہ)

---

(۱) محاضرات فی شعر علی محمود طہٰ ص: ۱۱۳-۱۱۴۔

(۲) علی محمود طہٰ شعر و دراسہ ص: ۳۴۸

عہد مغلیہ یورپی سیاحوں کی نظر میں

(۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۷ء)

قسط ۶

ڈاکٹر محمد عمر شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

اُجین:

جس سرزمین میں یہ شہر واقع تھا وہ علاقہ مالوہ کہلاتا تھا۔ خوبصورت ایک شہر تھا۔ زیر زرخیز تھی اور کثرت سے افیون پیدا ہوتی تھی۔ یہاں کا ایک کوس انگریزی دو میل کے برابر مانا جاتا تھا۔

سارنگپور: یہ ایک بڑا شہر تھا، اس کے جنوب مغرب میں ایک قلعہ تھا۔ اس کے اندر بہت سے خوبصورت مکانات بنے ہوئے تھے۔ یہاں عمدہ پگڑیاں اور سوتی کپڑا بنایا جاتا تھا۔

سرونج: یہ ایک بہت بڑا شہر تھا۔ پھل پان کے بہت سے باغات پائے جاتے تھے۔

ناروار: یہاں "ڈھلاؤ" پہاڑ کی چوٹی پر ایک قلعہ تھا۔ پتھری ایک راستہ اس کے چوٹی تک جاتا تھا۔ اس کے دروازے پر سپاہی پہرا دیتے تھے۔ وہ بادشاہ کی اجازت کے بنا کسی کو اندر داخل ہونے نہیں دیتے تھے۔ یہ شہر بہت بڑا اور خوبصورت تھا۔ پہاڑ کی چوٹی کی ایک وادی پر عجیب و غریب طریقے سے واقع ہونے کی وجہ سے "اوپر کی طرف سے بہت عمدہ معلوم ہوتا تھا" یہ چاروں طرف سے دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔

گوالیار شہر اور قلعہ:

گوالیار ایک "خوشنما شہر" تھا۔ فنچ کا کہنا ہے کہ "اس شہر کے مشرقی سمت وہ عمارت واقع

القصیدۃ الانسانیہ والقومیہ:

علی محمود طٰہٰ بہت ہی درد مند اور رحمدل انسان تھا۔ قومی خدمات کے جذبات اس کے اندر بہت تھے۔ وہ بہت ہی رقیق القلب اور غمگسار تھا۔ زندگی کے نشیب و فراز سے وہ بہت جلد متاثر ہوتا۔ اس کی شاعری میں ایک حصہ ایسا ہے کہ جس کا تعلق دوسروں کی تکالیف اور المناک واقعات سے ہے۔ اس طرح کے واقعات اس کے ذہن و قلب پر بڑے گہرے اثرات چھوڑتے۔

ان قصائد میں اس کا ایک شاندار قصیدہ ایک نابینا لڑکی سے متعلق ہے وہ نابینا لڑکی سارنگی کے ساتھ گاتی ہوئی اسے ایک محفل میں ملی۔ اس معذور لڑکی پر اسے بڑا ترس آیا اس نے اس فرشتہ صفت لڑکی اور اس کے پژمردہ حسن کی بڑی اچھی عکاسی کی ہے۔ اس کی شعر گوئی کا یہ انداز قارئین کے لیے بڑا سبق آموز اور نصیحت آمیز ہے۔ نابینا لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا۔ (۱)

خذی الازہار فی کفیک فاشوالک فی نفسی
اذا ماذابت الانداء فوق الورق النضر
وصب العطر فی اکمام ابریق من التبر
دعوت عرائس الاحلام من عالمہا السحری
تذیب اللحن فی جفنیک والاشجا صدری (۲)

(باقی آئندہ)

---

(۱) محاضرات فی شعر علی محمود طٰہٰ ص: ۱۱۳-۱۱۴۔

(۲) علی محمود طٰہٰ شعر و دراسہ ص: ۳۴۸

عہد مغلیہ یورپی سیاحوں کی نظر میں

(۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۷ء)

قسط (۹)

ڈاکٹر محمد عمر شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

اُجین: جس سرزمین میں یہ شہر واقع تھا وہ علاقہ مالوہ کہلاتا تھا۔ خوبصورت ایک شہر تھا۔ زمین زرخیز تھی اور کثرت سے افیون پیدا ہوتی تھی۔ یہاں کا ایک کوس انگریزی دو میل کے برابر مانا جاتا تھا۔

سارنگپور: یہ ایک بڑا شہر تھا۔ اس کے جنوب مغرب میں ایک قلعہ تھا۔ اس کے اندر بہت سے خوبصورت مکانات بنے ہوئے تھے۔ یہاں عمدہ پگڑیاں اور سوتی کپڑا بنایا جاتا تھا۔

سرونج: یہ ایک بہت بڑا شہر تھا۔ یہاں پان کے بہت سے باغات پائے جاتے تھے۔

ناروار: یہاں "ڈھلاؤ" پہاڑ کی چوٹی پر ایک قلعہ تھا۔ پتھری ایک راستہ اس کے چوٹی تک جاتا تھا۔ اس کے دروازے پر سپاہی پہرا دیتے تھے۔ وہ بادشاہ کی اجازت کے بنا کسی کو اندر داخل ہونے نہیں دیتے تھے۔ یہ شہر بہت بڑا اور خوبصورت تھا۔ پہاڑ کی چوٹی کی ایک وادی پر عجیب و غریب طریقے سے واقع ہونے کی وجہ سے " اوپر کی طرف سے بہت عمدہ معلوم ہوتا تھا" یہ چاروں طرف سے دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔

گوالیار شہر اور قلعہ:

گوالیار ایک "خوشنما شہر" تھا۔ فنچ کا کہنا ہے کہ " اس شہر کے مشرقی سمت وہ عمارت واقع

جس میں طرح طرح کے بڑے لوگ دفنائے گئے ہیں؛ اس کے مغرب میں قلعہ واقع تھا جس کے چاروں طرف مضبوط دیوار بنی ہوئی تھی اور یہ قلعہ شہر کے سامنے واقع تھا۔ وہاں سخت پہرہ تھا۔ بلا اجازت نامے کے کسی کو اندر داخل نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ ایک پتھری راستہ، جس کے دونوں طرف دیواریں کھڑی تھیں، قلعے کے اوپر تک جاتا تھا۔ اس کے دروازے پر پتھر کا بنا ہوا ایک ہاتھی کھڑا تھا۔ یہ دروازہ بھی بہت پرشکوہ تھا۔ اس کی دیوار میں نیلے اور ہرے پتھر جڑے ہوئے تھے۔ ہر شخص کو قلعہ کے اندر ایک اچھا میدان، چار تالاب اور بہت سی عمدہ عمارتیں نظر آتی تھیں۔

شہر کے شمال مغرب میں پتھر کی دیواروں سے گھرے ہوئے بہت سے وسیع سبزہ زار تھے۔ ان میں باغات اور تفریح گاہیں تھیں۔ جنگ کے زمانے میں انہیں بطور اصطبل استعمال کیا جاتا تھا۔

فتحپور سیکری:

اکبر کے شاندار دارالخلافہ کا اس سیاح نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے: "ان تمام کھنڈرات کے وسط میں ویران ایک ریگستان واقع ہے۔ اور رات کو اس میں سے گذرنا بہت خطرناک ہے بلا سکون کے عمارتیں ویران پڑی ہیں۔ وہاں کی بہت سی زمین میں باغات لگا دیئے گئے ہیں اور بہت سی زمین میں نیل اور دوسرے اناج پیدا کئے جاتے تھے۔ کوئی آدمی وہاں کھڑے ہو کر یہ بات بڑی مشکل سے سوچ سکتا تھا کہ وہ ایک شہر کے وسط میں کھڑا تھا۔ وہاں کی مشہور جامع مسجد کے بارے میں اس نے یہ لکھا ہے کہ "اس کے "مشرقی" سمت یہ عمدہ ترین مسجد واقع تھی"۔ بلند دروازہ کا ذکر اس نے اس طرح کیا ہے۔ (میرا خیال ہے) کہ "ساری دنیا میں یہ سب سے زیادہ اونچا دروازہ ہے"۔

آگرہ:

آگرہ شہر، وسیع اور بہت آباد ہے جسکی آبادی کا اندازہ کرنا ممکن نہ تھا۔ اس کی گلیوں میں اتنی بھیڑ تھی کہ کوئی شخص بآسانی گذر نہیں سکتا تھا۔ وہاں کی گلیاں بہت تنگ اور گندی تھیں سوائے بازار کی بڑی سڑک کے؛ جو بڑی اور عمدہ تھی۔ یہ شہر نصف ایک قمر کی شکل میں آباد تھا۔ امیروں کے مکانات کیوجہ سے ندی کے کنارے کی آبادی گنجان تھی۔ مشرق کی "قابل تعریف"

اور شاندار ترین عمارتوں میں اس قلعہ کا شمار ہوتا تھا۔ یہ حصار پتھر کی ایک مضبوط دیوار سے محصور تھا۔ مئی اور جون کے مہینوں میں اس شہر میں آگ لگنے کے کئی واقعات پیش آجاتے تھے۔ اور دن اور رات کو آگ کا زور دیکھا جا سکتا تھا۔ لہٰذا بہت سی عورتیں اور بچے اس آگ کی نذر ہو جاتے تھے اور بڑی ایک تعداد میں جل کر جانور مر جاتے تھے اور جل کر خاک ہو جاتے تھے۔ آگرہ کے قریب واقع تالاب سنگھاڑے کی بیلوں سے پُر تھے۔ سنگھارہ، ہرے، نرم اور ملائم (اندر) سے سفید اور ذائقے میں مخلوط المزا اور ان کا اثر بہت ٹھنڈا ہوتا تھا۔

لاہور:

مشرق کے سب سے بڑے شہروں میں فنچ نے لاہور کا شمار کیا ہے۔ اس شہر میں واقع حصار چاروں طرف سے اینٹ کی ایک مضبوط دیوار سے گھرا ہوا تھا۔ اس میں ۱۲ دروازے تھے، ۹ خشکی کی طرف اور ۳ ندی کی طرف۔ وہاں کے باشندے زیادہ تر بنیا اور دستکار تھے۔ اس نے لکھا ہے کہ "تمام اہم سفید فام لوگ" شہر کے نواح میں رہتے تھے۔ اینٹوں کی بنی ہوئی اس کی عمارتیں عمدہ اور اونچی تھیں جن میں عجیب و غریب کھڑکیاں تھیں۔ وہ اس طرح کی بنی ہوئی تھیں کہ باہری طرف سے گذرنے والا راہ گیر اندر کی طرف نہیں دیکھ سکتا تھا۔

(۳) بادشاہ۔ اس کے ذاتی حالات

آگرہ کا شاہی محل: آگرہ کے قلعہ کا فنچ نے جزوی اور کلی طور پر کیا ہے۔ جہاں بادشاہ کی رہائش تھی۔ اس نے لکھا ہے کہ اس قلعہ کے چار دروازے تھے۔ ایک شمال میں واقع تھا جبکہ دوسرا بازار کے مغرب میں واقع تھا جو کچہری دروازے کے نام سے موسوم تھا۔ اس کے اندر حاضری لکھی جانے کی کچہری تھی۔ جہاں تین گھنٹے صبح لگانوں، زمینوں کے دینے، زمینوں، فرمانوں اور قرضوں وغیرہ کے بارے میں کام ہوتا تھا۔ ان دونوں دروازوں کے آگے تیسرا دروازہ تھا جس کے سامنے اس نے دو راجاؤں کے مجسمے کھڑا کروا دیئے تھے۔ وہاں سے گذر کر وہاں جانے والا ایک بڑی گلی

...ں داخل ہوتا تھا جس کے ساتھ ساتھ دونوں طرف مکانات اور اسلحہ خانے تھے۔ اس سڑک کے
...رے پر ایک دوسرا دروازہ تھا جو شہنشاہ کے دربار تک جاتا تھا۔ اس دروازے پر ہمیشہ
...نجیریں بندھی رہتی تھیں۔ بادشاہ اور اس کے بچوں کے علاوہ کوئی بڑا آدمی وہاں نہیں اترتا
تھا: یہ دروازہ جنوب میں واقع تھا اور اکبری دروازہ کہلاتا تھا۔ اس دروازہ کے اندر چوک
...قع تھی جہاں چوبیسوں گھنٹے سیکڑوں رنڈیاں رہتی تھیں۔ یہ کہ" تاکہ وہ اس بات کے لئے تیار
...یں کہ نہ جانے کب بادشاہ یا اسکی بیگمات انھیں اپنے محل میں رقص یا گانے کے لئے بلالیں"۔ ایک
...ور دروازہ ندی کی طرف واقع تھا۔ اور وہ "درشنی" دروازے کے نام سے موسوم تھا جہاں سے
...دشاہ نکلتا ہوا سورج دیکھا کرتا تھا اور امیروں کی طرف سے تسلیمات قبول کیا کرتا تھا۔ دوپہر
...ور روزانہ وہ ہاتھیوں، شیروں اور بھینسوں وغیرہ کی جنگوں کا تماشا دیکھا کرتا تھا۔

تیسرے دروازے سے گذرنے کے بعد ایک وسیع دربار ملتا تھا جہاں آتش خانہ تھا۔
...س آتش خانہ کے چاروں طرف سپہ سالار رہتے تھے جو اپنے" عہدوں کے مطابق وہاں سات
...نوں تک چوکی قائم کرتے تھے"۔ اس کے تھوڑے اور آگے کٹہرہ دار ایک دربار تھا جہاں اہادیوں
(فوجی گھوڑسوار دستے) کے علاوہ کسی اور کے جانے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ اس سے گذر کر کوئی
...خص کٹہرہ دار ایک چھوٹے دربار میں پہونچتا تھا جس کے اوپر ایک شامیانہ لگا ہوتا تھا۔
...ہاں "اوپر" ایک "دالان" تھا جہاں شاہی کرسی پر بادشاہ جلوہ افروز ہوتا تھا۔ اس کرسی کے
...اہنی طرف عیسٰی مسیح اور اس کے بائیں سمت کنواری مریم عذرا کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ چہار
...دی سوار کے" منصبداروں سے کم منصب والے کو اس کٹہرہ دار دربار میں داخل ہونے کی
...جازت نہ ہوتی تھی"۔ اس دربار خاص کے آگے کی سمت سونے کی گھنٹیاں لٹکی ہوتی تھیں"۔

لاہور کا محل، آکاش دیا اور دیوار پر پچہ کاری:

آگرہ کے مقابلے میں لاہور کے محل کا زیادہ وضاحت سے ذکر کیا گیا ہے۔ محل کی دیواروں
...ے FERESCDSS کا بیان بہت دلچسپ ہے۔ ایک کمرہ جس کا اس نے ذکر کیا ہے وہ بادشاہ کے
...ونے کے کمرے میں تھی۔ وہاں جہانگیر پلتھی مار کر تخت پر بیٹھا کرتا تھا۔ اس کے دائیں سمت

زادہ پرویز، خرم اور جلیل کھڑے ہوتے تھے، ان کے بعد شاہ مراد اور دانیال: پھر خان
م کلاں عالی مرزا شریف، اس کے بعد مرزا رستم خان خانان، قطب الدین کوکا، راجا مان سنگھ
ن اعظم، آصف خاں، شیخ فرید، خلیج خاں اور راجا جگن ناتھ۔ اس کی بائیں سمت راجا بھاؤ سنگھ
با رام داس، جو اپنے ہاتھ میں اپنی تلوار لئے ہوتا تھا، شریف خاں، خانِ جہاں، زمانہ بیگ
ہ باسو، راجا رائے سنگھ، راجا کیشو داس، اور رالہ بیر سنگھ۔

قارئین کی دلچسپی کے لئے لاہور کے قلعے کے بارے میں فنچ کا بیان نقل کیا جاتا ہے۔

"ندی مشرق کی طرف سے بہتی ہوئی آتی ہے اور شہر کے شمال کی طرف سے مغرب کی سمت
تی چلی جاتی ہے۔ ندی کی سمت جانے والے دروازے کے اوپر قلعہ کے اندر بادشاہ کے لئے
ہائش گاہ ہے۔ شہر کے اندر بائیں ہاتھ کی طرف ایک مضبوط دروازے سے ہو کر جانا پڑتا ہے۔ اور ایک
دکور بڑے میدان میں ایک دستی بندوق کی زد کی دوری پر دوسرا ایک چھوٹا محل واقع ہے۔ اسمیں
شاہی محافظ دستے کے لئے آتش خانہ ہے۔ بائیں سمت ایک دوسرے دروازے سے ہو کر اندرونی
یک دربار میں جانا ہوتا ہے، وہاں بادشاہ دربار کرتا ہے۔ اس دربار کے چاروں طرف اعلیٰ آدمیو
کے دیکھنے کے لئے بھی آتش خانے ہیں۔ اس کے وسط میں روشنی کے لٹکانے کے لئے ایک کھمبا
کھڑا تھا۔ یہاں سے آگے چل کر ایک عمدہ دیوان خانہ ملتا تھا۔ دو یا تین خلوت خانے تھے۔ جہاں بادشاہ
رات کے پہلے حصے میں بالعموم ۸ بجے سے ۱۱ بجے تک بیٹھا کرتا تھا۔ یہ بات بھی دھیان میں رکھنی چاہئے
کہ داخل ہوتے ہی اس دالان میں بادشاہ کے دائیں ہاتھ کی سمت دروازے کے اوپر ہمارے
نجات دہندہ (عیسیٰ مسیح) اور دوسری طرف بائیں سمت کنواری مریم عذرا کی تصویر لگی ہوئی ہے۔ یہ
دیوان خانہ ایک فرح بخش مقام پر واقع ہے جہاں سے راوی ندی دکھائی دیتی ہے۔ یہاں سے مغرب
کی سمت چھوٹے سے ایک دروازے سے گذر کر ایک دوسرا چھوٹا دربار تھا جہاں بیٹھنے کے لئے
پتھر کا ایک چبوترہ تھا جس کے اوپر ایک خوشنما شامیانہ لگا ہوا تھا۔ یہاں سے آگے ایک دالان
میں داخل ہونا پڑتا ہے جس کے سرے پر، ندی کے اس پار، چھوٹی سی ایک کھڑکی سے بادشاہ اس
کے درشن کرنے کے لئے آنے والے لوگوں کو دیکھتا ہے، یہاں سے ندی کے کنارے پر واقع سبزہ زار
میں درندوں کی جنگیں بھی دیکھا کرتا تھا۔ اس دالان کی دیوار پر اکبر کی ایک ایسی تصویر بنائی گئی ہے

جیسے وہ تخت پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سامنے اس کا بیٹا شاہ سلیم اپنی کلائی میں ایک باز کو لئے کھڑا تھا اور اس کے بازو میں سلطان خسرو، سلطان پرویز، سلطان خرم اور اس کے تین بیٹے کھڑے تھے۔ اس دیوان خانے کے سرے پر چھوٹا سا ایک دوسرا دیوان خانہ ہے جہاں بادشاہ جلوہ افروز ہوا کرتا تھا۔ اس کے عقب میں اس کے قیام کے لئے کمرہ تھا۔ اس کے دائیں سمت ایک کھلا احاطہ تھا جہاں سے دو منزلہ چھوٹا سا ایک محل شروع ہوتا ہے جسکی ہر منزل میں کئی عورتوں کے رہنے کے لئے آٹھ عمدہ کمرے ہیں۔ ان میں ندی اور دریا کی سمت دالان اور کھڑکیاں تھیں۔ ان تمام کمروں کے دروازے باہر سے بند کئے جاتے تھے اور اندر سے نہیں۔ اس دالان کے اوپر جہاں بادشاہ بیٹھا کرتا تھا۔ فرشتوں کی بہت سی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ اس احاطہ کے اندر ایک خوشگوار دیوان خانہ اور ٹھہرنے کے لئے کمرے تھے اور دوسرے محل میں بادشاہ کے جانے کے لئے راستہ تھا جس سے کوئی دوسرا شخص نہیں جا سکتا تھا۔"

"اب پہلے دربار میں واپس آیئے۔ جہاں محافظ فوجی دستہ (راہ دیس) پہرا دیتا ہے وہاں دائیں ہاتھ کی سمت ایک نیا دربار بھی ہے اور اس کے ذرا آگے دوسرا دربار مع آتش خانہ ہے اور دوسرے ایک دروازے سے گذر کر شاندار چوکور ایک بڑا محل تھا جو نیا محل کہلاتا تھا۔ وہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں دو سو عورتیں قیام کر سکتی تھیں۔ اس طرح بڑے دربار کی طرف واپس آ کر دائیں سمت سے جا کر بائیں سمت فرش بندی کیا ہوا ایک دوسرا چھوٹا دربار ملتا تھا اور اس کے بعد ایک دوسرا محل تھا جو ان تینوں میں سب سے زیادہ باعظمت تھا جس میں سولہ مختلف النوع قیام گاہیں تھیں۔ ان میں سے ہر ایک میں علیحدہ علیحدہ کمرے، دیوان خانے، فرش بندی کیا ہوا ایک احاطہ ایک تالاب، وہ محل ایک عورت کے لئے برائے عیش چھوٹی ایک دنیا کے مثل تھا۔ یہ سب محلات دریا کے کنارے واقع تھے۔ سلطان خسرو کی والدہ کے محل کے سامنے جیسا کہ بادشاہ کے محل کے سامنے تھا، ایک اونچا کھمبا کھڑا تھا جس پر دیا روشن کیا جاتا تھا۔ کیونکہ اس کے بطن سے بادشاہ کا پہلا بیٹا اور وارث پیدا ہوا تھا۔ وسط میں بادشاہ کے بیٹھنے کے لئے ایک شاندار دالان تھا جس کے اوپر پہلے کی طرح بدنما تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ ان کے ایک سرے پر بادشاہ کی بہت سی ایسی تصاویر تھیں کہ وہ بیگمات کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک شراب کی بوتل

لئے کھڑی تھی دوسری تولیہ اور تیسری پیالہ پیش کر رہی تھی، پیچھے سے ایک پنکھا جھل رہی تھی، ایک اس کی تلوار پکڑے ہوئی تھی، ایک دوسری بیگم اس کی کمان اور دو تین تیر پکڑے ہوئی تھی" فنچ نے وہاں کے دوسرے محلات کی دوسری تفصیلات کا بھی ذکر کیا ہے جن کا بیان طوالت سے خالی نہیں ہے۔

سرہند میں شاہی باغ:

سرہند میں ایک خوشنما تالاب تھا۔ اس میں پندرہ پتھروں کا ایک پل تھا جو اس کے وسط میں موسم گرما میں قیام کے لئے بنی ہوئی بارہ دری سے منسلک تھا۔ شاہی باغ کے لئے اس تالاب سے کاٹ کر چھوٹی ایک نہر نکالی گئی تھی جو کچھ فاصلے پر واقع تھا۔ شاہی باغ کو جانے والے راستے کے دونوں طرف درخت لگے ہوئے تھے۔ اینٹوں کی بنی ہوئی ایک چہار دیواری کے اندر وہ باغ تھا اس میں ہر قسم کے پھلدار درخت اور پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے۔ اس باغ کو سالانہ پچاس ہزار روپے پر اٹھایا جاتا تھا۔ یہ باغ چار مربع نما حصوں میں منقسم تھا اور ہر ایک مربع کی لمبائی ایک کوس تھی۔ ان کو خاص دو راستوں سے پار کیا جاتا تھا جو چالیس فٹ چوڑے اور آٹھ فٹ اونچے تھے۔ ان کے بیچ سے پتھریلی نالیوں سے پانی بہتا تھا۔ ان کے دونوں طرف گھنے خوشنما سرو کے درخت لگے ہوئے تھے۔ فنچ نے لکھا ہے کہ "ان سنگ بستہ راستوں میں سے ایک میں کنکروں کا فرش تھا جو ایک دوسرے سے عجیب و غریب طریقوں سے جڑے ہوئے تھے، اس دوراہے پر جہاں وہ ایک دوسرے کو قطع کرتے تھے ایک محل تھا" جس پر پتھر کے عجیب و غریب کام تھے اور ساتھ ساتھ خوشنما نقاشی اور مصوری تھی۔

شکار:

آگرہ کے قرب وجوار میں جہانگیر بادشاہ شکار کھیلنے جایا کرتا۔ شکار کھیلنے کا بندوبست اس طرح کیا جاتا تھا کہ پہلے سارے جنگل کو چاروں طرف سے گھیر لیا جاتا تھا اور بعد ازیں اس گھیرے کو دھیرے دھیرے تنگ تر کرتے جاتے تھے۔ اس شکار میں جتنے جانور مارے جاتے

تھے وہ سب کے سب بادشاہ کے شکار کئے شمار ہوتے تھے۔ اگر وہ ایسے جانوروں کو مار لیتے تھے جن کا گوشت قابل فروخت ہو سکتا تھا تو وہ اسے فروخت کر کے روپیہ حاصل کر لیتے اور اس رقم کو غرباء میں تقسیم کر دیتے۔ (جن مجرموں نے جنگل میں پناہ لے لی تھی) اگر ایسے لوگ پکڑے جاتے تو انھیں کابل اور قندھار بھیج دیا جاتا اور ان کے بدلے میں کتے اور گھوڑے لے لئے جاتے تھے۔

(۴) دربار اور وہاں کے ضابطے

بادشاہ کی سرگرمیاں؛

اتوار کے علاوہ بادشاہ روزانہ جانوروں کی جنگوں کا مشاہدہ کیا کرتا تھا۔ "لڑنے والے جانوروں اور سزا یافتہ لوگوں کے لئے " منگل کا دن "خونی" دن سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح بادشاہ سماعت کرتا تھا اور لوگوں کو قتل ہوتے بھی دیکھا کرتا تھا۔ جہانگیر تین اور چار بجے کے درمیان دیوان عام میں جلوہ افروز رہتا، جہاں وہ مقدموں کی سماعت کرتا، اسے ملک کے بارے میں خبریں سنائی جاتیں، خطوط پیش کئے جاتے اور وہ خلعتیں عنایت کرتا۔ اس کے بعد وہ محل سرا میں چلا جاتا اور دو گھنٹے کے بعد" اپنے محل سے ملحق چھوٹے سے اندرونی دربار میں" دوبارہ آتا جس میں منصب داروں کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں جا سکتا تھا اور وہ لوگ بھی اجازت لے کر جاتے تھے جن کے پروانوں کی چاند کی پہلی تاریخ کی تجدید کی جاتی تھی۔ یہاں جہانگیر شراب نوش کیا کرتا تھا۔

(باقی آئندہ)

برہان

شمارہ ۲	فروری ۱۹۹۴ء مطابق رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ	جلد ۱۱۳

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

ہر سال کی طرح اس سال بھی ۳۰ جنوری کو مہاتما گاندھی کا یوم وفات منایا گیا اور ہندوستان کے متعدد رہنماؤں، صدر جمہوریہ ہند سمیت سب ہی نے مہاتما گاندھی کو یاد کرکے ان کو خراج عقیدت پیش کیا۔ مہاتما گاندھی کی تعلیمات اور ان کے اہنسا وادی نظریات کی زور و شور سے تشہیر بھی کی گئی۔ مگر جو چیز گاندھی جی کو پسند تھی اس پر کسی بھی رہنما کی توجہ مبذول نہ ہو سکی اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت ہی محسوس کی گئی۔ گاندھی جی آزاد ہندوستان میں کیا چاہتے تھے اور کس چیز کو ہندوستان کی تعمیر و ترقی اور بقا کے لئے مفید سمجھتے تھے اس پہلو سے گاندھی جی کو کسی نے بھی یاد نہیں کیا ـــــ آزادی سے قبل ہندو مسلمان، سکھ عیسائی سب کو ساتھ لیکر گاندھی جی نے ملک کی آزادی کی تحریک چلائی جو بالآخر کامیابی سے ہمکنار ہوئی گاندھی جی کا خواب تھا آزاد ہندوستان میں چھوا چھات نام کی کوئی شئے باقی نہ رہے گی اور ہندوستان میں تمام مذاہب کے ماننے والے اپنے اپنے مذہب کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ملک کی تعمیر نو میں جُٹے رہیں گے۔ سب باشندوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے کوئی بڑا چھوٹا نہ ہوگا۔ ہندو مسلمان سکھ عیسائی سب بھائیوں کی طرح میل ملاپ سے رہیں گے۔ اور ہندوستان کا آئین آئیڈیل ہوگا جسمیں سب مذاہب کا احترام کرتے ہوئے سب کو اپنی اپنی جگہ ترقی و کامیابی حاصل کرنے کے مواقع فراہم ہوں گے ـــ گاندھی جی کا یہ خواب کتنا سچا ہے یہ ہم سب اپنے اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں گے تو اس کا جواب ہمیں خود بخود مل جائے گا۔ گاندھی جی نے بھارت میں تمام لوگوں کو مساوات کے ساتھ زندہ رہنے کے حق کی تلقین پر زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس ملک کی ترقی و تعمیر کے لئے تمام لوگوں کا اطمینان سب سے مقدم ہے اگر ملک کا کوئی بھی طبقہ اپنے آپ میں بے چینی سی محسوس کرتا ہے تو یہ صرف اسی کے لئے نہیں بلکہ آزاد بھارت میں رہنے والے تمام لوگوں کے لئے فکر و تشویش کی بات ہونی چاہیئے۔ مگر آج جب آزادی کو حاصل ہوئے ایک عرصہ بیت چکا ہے اور ہمارے آئین کو نافذ ہوئے ۴۵ سال ہو چکے ہیں اور ابھی ہم نے ۲۶ جنوری کو اپنے آئین کی ۴۵ ویں سالگرہ منائی ہے مگر سچ پوچھیے تو آج ہم [illegible]

رہے کہ حالات بدل رہا ہے کیا کیا سوچا تھا اور اب ہو کیا رہا ہے؟ جس مقصد کے لئے گاندھی جی نے اپنی راہ منزل متعین کی تھی گاندھی جی اسی مقصد کی خاطر کوششوں میں مستغرق تھا ایک سرپھرے پاگل کی گولی کا شکار ہوگئے۔ اور آج ان کے انتقال کے ۴۴ سال پورے ہو چکے ہیں جس مقصد کے لئے گاندھی نے اپنی جان کی قربانی دی تھی اس مقصد کی حصولیابی تو کھٹائی میں پڑ گئی۔ الٹے اس مقصد کو قائم رکھنے ہی کے لئے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ اگر ۳۰ جنوری ۱۹۴۹ء میں گاندھی جی کو گولی مارنے والا ایک ناتھو رام گوڈسے تھا تو ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو مہاتما گاندھی کے اصول، مقصد، قاعدہ وقانون کی دھجیاں اڑانے والے "ناتھو رام گوڈسے" کے دماغ سے پیدا ہوئے بھارت ماتا کے نام نہاد رہنماؤں کے پُرفریب بھاشنوں سے متاثر ہو کر ہزاروں لاکھوں کے جم غفیر نے سینکڑوں سالوں سے کھڑی ایک مقدس عبادتگاہ کو دنیا بھر کے ہزاروں اخباری، ٹی وی وخبر رساں ایجنسیوں کے نمائندوں اور کیمرہ مینوں کی موجودگی میں گھمنڈ وتکبر سے مزین فخر وانبساط میں جھوم جھوم کر سینہ تان کر زمین دوز کر دیا۔ اس کے بعد بھی کیا ہمیں گاندھی جی کا یوم پیدائش یا یوم وفات مناتے ہوئے کوئی شرم وجھجک اور عار محسوس نہیں ہوتا ہے؟ —— اب مہاتما گاندھی کی تعلیمات زندہ ہی کہاں ہیں۔ اگر کہیں نیم مردہ حالت میں پڑی سسکتی ہوئی دکھائی دے جائیں تو خدا کے واسطے اسے کسی میوزیم یا آثار قدیمہ کے کھاتوں میں آنے والی نسلوں کے لئے تبرک کے طور پر جمع کرا دینا ہی زیادہ بہتر ہوگا۔ ورنہ گاندھی جی کی یہ تعلیمات وروایات کہیں گمشدہ اوراق کی طرح نایاب نہ ہو جائیں۔ اور مورخین جب ہندوستان کے بارے میں معلومات اکٹھا کریں اور پھر جب انھیں کسی طرح اس ملک کی آزادی کے سب سے بڑے رہنما کے بارے میں کچھ جاننے کی ضرورت پڑ جائے تو وہ انہیں ڈھونڈنے سے بھی دستیاب نہ ہو سکیں گی۔

ہمارے خیال میں مہاتما گاندھی بھارت کے عوام کے لئے صرف رسمی طور پر یاد کرنے کے لئے رہ گئے ہیں اگر یہ بات غلط ہے تو ہمیں سمجھایا جائے کہ گاندھی جی کی تعلیمات کی جب سر عام مٹی پلید کی جا رہی ہو اور بھارت کے آئین کی لاکھوں کے مجمع عام میں کھلم کھلا خلاف ورزی کی جا رہی ہو تو ہندوستان کے گاندھی وادی جو آپ گاندھی جی کو ان کے یوم وفات پر خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں اس وقت کہاں سو گئے تھے۔ اس آئین کی حفاظت کرنے کے لئے جسے گاندھی جی کے آدرشوں پر بنایا گیا تھا، وہ میدان عمل میں کیوں نہیں نکلے —— جنوری ۱۹۴۹ء کو مہاتما گاندھی ایک سرپھرے کی گولی سے قتل ہوئے اور ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو مہاتما گاندھی [illegible]، مقصد، تعلیم وروایات لاکھوں سرپھروں کے ہاتھوں نیست ونابود کیا گیا اور ستم بالائے ستم یہ کہ گاندھی

کے جسم کا قاتل اپنے کیفر کردار کو پہنچا دیا گیا مگر ان کے آدرشوں کے قاتل گاندھی جی کے آزاد بھارت مہان میں ہیرو بنے دندناتے پھر رہے ہیں ۔ اور اب توڈھٹائی کے ساتھ گاندھی واد کی جگہ ناتھورام گوڈسے واد کا جس طرح سکہ چلانے کی کوششیں کی جارہی ہیں اسے سمجھنے کے لئے کیا ہمارے ملک کے سیکولر وادی یا گاندھی وادی صرف آرام سے بیٹھ کر یہ نظارہ دیکھتے رہیں گے؟ اور کیا اس طرح وہ اپنا نام گاندھی کے ہندوستان کو مٹانے والوں میں لکھوائیں گے؟ اب بھی وقت ہے اے سونے والو! جاگو اور گاندھی جی کے ہندوستان کو بچالو ان بھیڑیوں سے جو تشدد اور فرقہ وارانہ ذہنیت کے بیج بو کر اور اس کے بل بوتے ہندوستان کو اپنے ناپاک پنجوں میں جکڑ لینے کے درپہ ہیں ۔ تقسیم ملک کے وقت کے نازک حالات میں گاندھی جی نے جس طرح اپنی جان جوکھوں میں ڈالکر برت رکھ کر نامساعد حالات کا مقابلہ کیا جس میں انھیں کسی قدر کامیابی بھی نصیب ہو گئی۔ اب گاندھی جی کے پرستاروں، ملک سے محبت رکھنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ملک کو بچانے کی خاطر ناتھورام گوڈسے کی ذہنیت کا جواب سیاست میں بھی پوری طرح دخیل ہو چکی ہے ۔ پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کریں ۔ اسی میں ہندوستان کی بقاء و سلامتی اور ترقی و تعمیر کا راز مضمر ہے ۔ تمام ہندوستانی گاندھی جی کی تعلیمات سے روشناس ہو جائیں اور اس پر عمل پیرا ہونے کا عہد کریں تو پھر گاندھی جی کا یوم پیدائش یا یوم وفات منانے کا صحیح معنوں میں ہمیں حق حاصل ہو گا ۔

مغربی تہذیب کی وکالت کرنے والے اب یہ بات تسلیم کرنے لگے ہیں کہ مشرقی تہذیب ہی انسانیت کے لئے صحیح اور ضروری ہے جس کر و فر کے ساتھ مغربی تہذیب والوں نے اپنی ہی معاشرت و تہذیب و تمدن کو انسانیت کے لئے آب حیات کہا تھا، آج مغربی تہذیب والے اپنی تہذیب کی خامیوں کے اجاگر ہونے پر رو رہے ہیں، سر پیٹ رہے ہیں اور وہ اپنی نسل کو بچانے کے لئے مشرقی تہذیب کی خوبیوں اور اچھائیوں کی دوہائی دیتے ہوئے اس کی اوٹ میں اپنی پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ جو کل تک مشرقی تہذیب کو مضحکہ خیز بتلاتے تھے اب اپنی تہذیب پر نہ صرف شرمندہ ہی ہیں بلکہ کوشاں ہیں کہ نئی نسل اس تہذیب و معاشرت کی برائیوں سے آگاہ ہو کر اسے نہ اپنائے ۔

مغربی تہذیب کو اپنانے والی یا مغربی تہذیب کو جنم دینے والی زیادہ تر غیر مسلم اقوام ہی ہے اور مشرقی تہذیب کے علمبردار یا مشرقی تہذیب کو معرض وجود میں لانے والے مذہب اسلام کے ماننے والے ہیں اس لحاظ سے آسانی کے لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ عیسائی اکثریتی علاقہ یوروپ بمعنی مغربی تہذیب اور مشرقی تہذیب

ومعاشرت یعنی مسلمانیت۔

اب جہاں کہیں بھی دیکھیں ہمیں صاف نظر آجائے گا کہ یورپی اقوام نے اپنے تعصب و تنگ نظری کی وجہ سے مشرقی تہذیب و معاشرت کا مذاق اڑا کر اس کی جو تذلیل کی، آج نہ چاہتے ہوئے بھی خود اسی مغربی تہذیب و معاشرت کی تذلیل وہ قوم ہی کر رہی ہے جو کبھی اس کی دلدادہ تھی اور اسی مشرقی تہذیب و معاشرت کی خوبیوں کا برملا اظہار کرنے پر مجبور ہے جو کبھی اس کا تمسخر اڑانا ہی اپنا فرض سمجھتی تھی۔

برطانیہ میں آجکل جنسی آزادی کے لئے آواز اٹھ رہی ہے کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ہمبستری آج اس قسم کا گناہ نہیں رہا جیسا کسی وقت تھا اس لئے اسے درگذر کر دینا چاہیئے۔ برطانیہ کے ولی عہد سلطنت پرنس چارلس اور شہزادی ڈائنا کی ازدواجی زندگی میں ہلچل مچی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ پرنس چارلس ایک برگیڈیر جنرل مسٹر اینڈریو بارکر باؤس کی بیوی کی محبت وعشق میں بری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔ جس پر شہزادی ڈائنا کو سخت ترین اعتراض ہے۔

اسلام نے مرد و عورت کو جو مقام دیا ہے وہ کسی بھی مذہب میں ہمیں نہیں دکھائی دیتا ہے۔ اور اسلام میں مجرد زندگی کو کبھی بھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا سکتا ہے مگر غالباً گرجا گھر میں پادریوں کا غیر شادی شدہ ہونا ضروری ہے لا حول ولا قوۃ! یہ کیسا ظلم ہے انسانیت پر کہ اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت کو ایک دوسرے کے لئے بنایا ہے پیدا کیا ہے مگر یہ کیسی بدقسمتی ہے ان لوگوں کی جو قدرت کے اس انعام واکرام سے اپنے کو محروم کر کے ہی نیکی کے حقدار بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ نفسانی خواہشات عورت میں بھی خدا نے دی ہے تو مرد میں بھی اسی طرح نفسانی خواہشات پیدا کی ہے۔ اب اس خواہش نفسانی کو دبایا جاتا ہے تو اس کا صاف مطلب ہے کہ بندوں پر پروردگار کی مہربانیوں سے ہم منہ موڑے ہوئے ہیں۔ جسکی وجہ سے انسانیت کے مزاج میں خلل واقع ہوتا ہے اور اس میں بے شمار خرابیاں گھر کر جاتی ہیں۔ برطانیہ میں پادریوں کی محبوباؤں کے بھی بڑے چرچے ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے کئی کیتھولک پادریوں اور گرجا گھروں کا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے۔ مبینہ طور پر بہت سی غیر شادی شدہ خواتین کے یہاں پادریوں کے معاشقے کی وجہ سے بچے پیدا ہوگئے ہیں مگر ان بچوں کے باپ کا نام کسی کو بھی معلوم نہیں ہے۔ برمنگھم کے ایک وکیل مسٹر رچرڈ پوپ نے چرچ کے اعلیٰ عہدیداران کے کالے کارناموں کو چھپانے کا الزام لگایا۔ مسٹر رچرڈ کا دعویٰ ہے کہ ایسی بہت سی خواتین نے اسے اپنے مقدمے کی پیروی کے لئے منتخب کیا ہے جن کے بچوں کا باپ کوئی کیتھولک پادری

ہے۔ مسٹر رچرڈ کے پاس پادریوں کی محبوباؤں میں سے ایک گل ڈیولن کا مقدمہ بھی ہے بس گل ڈھائی سال
تک کیتھولک پادری فادر شان ٹکر کے چکر میں رہی جس کے نتیجہ میں اس نے ایک بیٹی سیان کو جنم دیا۔ یہ کہانی
جب اخبارات نے شائع کی اور فادر ٹکر کے معاشقے کا پردہ فاش کیا تو فادر ٹکر ایسے غائب ہوئے کہ آج
تک ان کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ اس کی محبوبہ اپنا درد بتاتی ہے کہ جب میری بچی سیان مجھ سے دریافت کرتی ہے
کہ ڈیڈی کہاں ہیں؟ تو میں یہ کہکر ٹال دیتی ہوں کہ ڈیڈی ضروری کام سے دور گئے ہوئے ہیں اور تیرے لئے
بہت ڈھیر سے کھلونے لیکر آئیں گے۔ پادریوں کے عشق و محبت کے قصے نہ معلوم کب سے چل رہے ہوں گے
مگر اب پادریوں کی محبت اور کالے کارناموں کے راز افشا ہونے شروع ہوئے ہیں دیکھئے آگے آگے کیا کیا گل
کھلتے ہیں اور کیسے کیسے واقعات سامنے آتے ہیں؟

اسلامی نقطۂ نظر سے ایک مسلمان شادی شدہ زندگی گذارتے ہوئے متقی و پرہیزگار اور اللہ تعالیٰ کا مقرب
بندہ ہو سکتا ہے، نیک عمل و بداعمال سے اس کا محاسبہ کیا جا سکتا ہے۔ شادی کو شریعت میں ضروریاتِ زندگی
کہا گیا ہے آج کے سائنسی دور میں اس کی تصدیق ہو چکی ہے۔ شریعت محمدیہ میں شادی کا اس قدر احترام کیا گیا
ہے کہ اگر کوئی شادی شدہ غیر مسلم حلقۂ اسلام میں داخل ہوتا ہے تو اس کے لئے جہاں کلمہ پڑھنا اور ایمان کی
تجدید ضروری ہے وہاں دونوں میاں بیوی کا از سر نو نکاح ضروری نہیں ہے غیر اسلامی حالت کے وقت کے
نکاح ہی کو تسلیم کیا جائے گا۔ مگر عیسائیت یا ہندو رہبانیت یا برہمچاریت میں شادی شاید نیک عمل میں
رکاوٹ ہے۔ جائز شادی نیک اعمال میں رکاوٹ کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ ہماری عقل و فہم کی دسترس سے
دور بات ہے۔ بغیر شادی کے انسان نیکی و پاکی کی بلندی پر بیٹھا ہوا ہے۔ معاً اس کی نفسانی خواہش کا عنصر
جاگ جاتا ہے اور ہچکولے لینے لگتا ہے تو اب وہ اپنی اس جاگی ہوئی نفسانی خواہشات کو مطمئن کرنے کے
لئے کیا عمل کریگا؟ اس کے پاس دو ہی راستے ہیں ایک راستہ ہے اپنی زندگی ہی کو ایک چھلانگ میں اونچی
منزل سے کود کر ختم کرلے، جسے اسلام اور موجودہ دنیاوی قوانین میں بھی ممنوع قرار دیا گیا ہے یا پھر کسی غیر فطری
عمل کو اپنائے اور اس پر بھی اسے قابو نہ رہے تو پھر کسی عورت کو اپنے دام فریب میں لاکر اس سے ہمبستری
کر ڈالے۔ اب اگر وہ عورت کوئی شادی شدہ ہے تو اس کا دامن داغدار ہو گیا اور اگر وہ غیر شادی شدہ
ہے تو تمام عمر کے لئے داغی کنواری بن کر رہ گئی۔ پہلی عورت اپنے خاوند کی مجرم، پروردگار کی مجرم، قانون
و سماج کی مجرم۔ دوسری عورت شیطانیت کی شکار ہو کر انسانیت و سماج سے شرمسار ہو کر سسک سسک کر

ہی اپنی زندگی تمام کر ڈالے ۔ اسلام کی تعلیمات کو اپنانے والا کبھی بھی ان حالات کا شکار نہیں ہو سکتا ہے اس کی خواہش نفسانی کا قدم قدم پر لحاظ رکھا گیا ہے اور اس کے لئے جائز طریقے سے راستے پیدا کئے گئے ہیں ان جائز طریقوں پر چلتے ہوئے بندۂ خدا اپنے پروردگار کے انعام واکرام سے ملتفت ہوتا رہتا ہے بیسوی صدی میں مغربی استعماریت و مغربی تہذیب و معاشرت کی خرابیوں نے جس طرح بنی نوع انسانی کو اپنی گرفت میں لے کر اس میں تباہیاں اور خرابیاں پیدا کر دی ہیں اس سے نجات کا واحد راستہ اسلامی تہذیب و معاشرت کو اپنانے ہی میں ہے ۔ اسلامی تعلیمات پر مضبوطی سے گامزن رہنے والا بندہ کبھی بھی غلط راہ پر نہیں بھٹک سکتا ہے ۔ اسلامی قوانین و اسلامی شریعت صحیح معنوں میں ہر انسان کی فطری ضرورت ہے اور جو اس پر عمل پیرا ہوگا اسے کبھی بھی صحیح راہِ عمل سے بھٹکنے کا خطرہ نہیں ہو سکتا ہے !۔

ابو العباس[1]۔ احمد بن محمد بن مفرج بن عبد اللہ اموی[2]، نباتی، معروف بہ ابن الرومیہ[3] کا شمار علم حدیث اور علم نباتات کے ممتاز ماہرین میں ہوتا ہے — ابو العباس النباتی کی پیدائش محرم الحرام ۵۶۱ھ/ ۱۱۶۵ء یا ۱۱۶۶ء[4] اور ایک روایت کے مطابق ۵۶۷ھ/ ۱۱۷۲ء[5] میں اشبیلیہ میں ہوئی اور وفات دوشنبہ ۳۰، ربیع الآخر ۶۳۷ھ[6]/ ۱۲۳۹ء اور ایک روایت کے مطابق ۶۳۸ھ/ ۱۲۴۰ء[7] میں اشبیلیہ میں ہوئی۔ اسلامی علوم و فنون میں مہارت کی وجہ سے مشرق میں "محی الدین" کے لقب سے ملقب ہوئے ۸۔ اور نباتات میں دسترس کی وجہ سے "نباتی" اور "عشاب" کہلائے۔ اشبیلیہ کو ان کی وجہ سے بہت شہرت حاصل ہوئی، بلکہ بقول الوزیر محمد لسان بن الخطیب مولف الاحاطہ فی اخبار غرناطہ" اشبیلیہ کی شہرت بھی زیادہ تر انہی کی وجہ سے ہے"۔[10]

ابو العباس النباتی کے پردادا عبد اللہ اموی کو نباتات میں زبردست مہارت حاصل تھی۔ گو انکو قرطبہ کے ایک طبیب[11] نے متبنی لیا تھا۔ اور علم النباتات کی تعلیم دی تھی[12]۔ النباتی انتہائی دیندار، مخیّر اعلیٰ انسانی صفات کے حامل۔ حدیث کے امام، حافظ و نقاد اور علم الانساب میں زبردست مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے علوم دینیہ اور طب کی باضابطہ تعلیم حاصل کی تھی۔ اور قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ الاحاطہ فی اخبار غرناطہ کے مولف نے نباتی کے اساتذہ کی ایک مختصر فہرست مرتب کی ہے[13]۔ اس فہرست کے بموجب اس نے اندلس کے جن شیوخ سے روایت کی ہے ان کی تعداد ۱۸، اندلس اور مغرب کے جن اساتذہ سے تحریری اجازت ملی ان کی تعداد ۸، اہل مشرق کے اساتذہ کی تعداد ۲، بغداد اور عراق کے شیوخ کی تعداد ۱۶ ہے۔ — النباتی نے سیاحت کے دوران شیوخ سے ملاقاتیں بھی کیں، ان کی فہرست بھی ابن الخطیب نے مرتب کی ہے۔ ان کی تعداد ۱۲ ہے۔ ایسے شیوخ کا نام بھی

تذکرہ میں ملتا ہے جن سے النباتی نہ مل سکے تاہم روایت کی اجازت حاصل کرلی تھی، اسکندریہ کے ابو محمد عثمانی اور مصر کے محمد بن سحنون غماری ان میں شامل ہیں[14]

ابوالعباس النباتی کے علمی اساتذہ کی نشاندہی تذکروں اور اخبار و تواریخ کی کتابوں میں نہیں ملتی، البتہ اس فن میں اس کے مرتبہ کی تعیین ضرور کی گئی ہے۔ ابن الخطیب کے بقول:

علم نبات کی واقفیت، جڑی بوٹیوں کی تمیز و تحلیل اور ان کے اصول کے اثبات میں وہ نہ صرف اپنے زمانے میں بلکہ متقدمین و متاخرین کے مقابلہ میں بھی نوع انسانی کے عجیب تر شخص تھے، جڑی بوٹیوں کی پیداوار مشرق میں ہو یا مغرب میں اور اس کی جائے پیدائش کے حالات میں جس قدر اختلافات ہوں۔ ان تمام باتوں کو تحقیق۔ مشاہدہ اور حس کے ذریعہ معلوم کرلیتے تھے۔ اس میں کوئی شخص نہ ان کی تردید کرسکتا تھا اور نہ تکذیب، وہ سراپا حجت تھے[15]

ابن الخطیب مزید لکھتے ہیں:

"علم نبات میں وہ مسلم اور مرجع قرار دیئے گئے تھے، حدیث اور علم نبات دونوں میں ان کو یکساں مہارت حاصل تھی، کیونکہ دونوں کا قدر مشترک بھی واحد ہے، مختلف مقامات کی سیر کرنا، ہر چیز کو لکھنا، لفظی مشکلات کی تحقیق کرنا اور رادیان و ایران کے اصول کو محفوظ رکھنا از یں قبیل دوسری باتیں دونوں علم کے لئے ضروری ہیں"[16]

ابوالعباس النباتی، علم حدیث اور علم نباتات کے حصول اور تحقیق تجسس کے لئے ملکوں، ملکوں اور شہروں شہروں پھرے تھے اور جو کچھ معلوم کرتے۔ اس کو سن وعن قبول نہ کرتے بلکہ لوگوں سے اس بابت مناظرہ بھی کرتے ——— ابن الخطیب، عبدالملک کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں۔

"عشاب (ابوالعباس النباتی) اپنے فن میں سارے مغرب کے امام تھے۔ وہ اندلس اور مغربی ممالک کے علاوہ (افریقہ) کے چپہ چپہ میں پھرے۔ مشرق کی سیاحت کی، افریقہ، مصر شام، عراق اور حجاز کے مشہور لوگوں سے ملے۔ ان سے استفادہ کیا اور جو چیزیں ملک مغرب میں نہیں ہوتی تھیں ان کا بہ چشم خود معائنہ کیا"[17] ——— "وہ ہمیشہ چیزوں کے حقائق کے متعلق بحثیں کیا کرتے تھے اور ان کے اسرار و غوامض کے پردے فاش کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ جس کی وجہ سے انھیں اشیاء کے متعلق اس قدر اطلاع اور آگاہی حاصل تھی کہ متقدمین

اسلام میں کوئی شخص ان کا ہم پلہ نہیں گزرا، اسی وجہ سے وہ فرد روزگار اور اپنے عہد میں یکتا تسلیم کئے گئے ہیں۔ اس پر سب کا اجماع ہے، کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا ہے۔"[18]

ابن الخطیب نے ابو العباس النباتی کے بارے میں اپنے یا دوسروں کے جو خیالات یا تاثرات نقل کئے ہیں ان میں بہرحال جانبداری عناصر پائے جاتے ہیں ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ نباتات کے حوالے سے اس کے شاگرد ابو محمد عبداللہ بن احمد ضیاء الدین ابن بیطار متوفی ۱۲۴۸ء نے اپنی کتاب الجامع لمفردات الادویہ والاغذیہ میں بعض مقامات پر زبردست نقد کیا ہے، اور تلاش و جستجو سے کام لیا جائے تو فن حدیث میں بھی اس کی کاوشیں گرفت میں آجاتی ہیں۔

دوائی نباتات کی تحقیق کے بارے میں ابو العباس نباتی کی کاوشوں کا اندازہ اس طور پر بھی کیا جاسکتا ہے کہ ۶۱۲ھ/۱۲۱۶ء میں اس نے حج کا سفر کیا اور ۶۱۳ھ/۱۲۱۷ء میں زیارت بیت اللہ سے فارغ ہوا، اس کے بعد تین سال تک وہ مختلف ملکوں اور شہروں کی سیاحت کی، ایک روایت کے مطابق وہ مراکش کے راستہ ۶۱۳ھ/۱۲۱۷ء [19] میں مصر پہنچا۔ یہاں لوگوں سے علم سیکھتا، سکھاتا اور احادیث روایت کرتا۔ ایوبی حکمراں سیف الدین عادل [20] (۱۱۹۹ء — ۱۲۱۸ء) ان دنوں قاہرہ میں تھا۔ اس کو جب نباتی کے فضل و کمال اور نباتات سے گہری آگہی کا علم ہوا تو اسکندریہ سے طلب کیا اور بہت اعزاز بخشا، اور ایک فرمان کے ذریعہ مشاہرہ، بھتہ اور رہائش وغیرہ کی سہولتیں بھی فراہم کیں۔ مگر نباتی نے قاہرہ میں مستقل قیام سے معذرت چاہی اور کہا کہ وطن سے حج بیت اللہ کے ارادہ سے نکلا ہوں، حج کے بعد اندلس لوٹ جاؤں گا، تاہم اس نے کچھ دنوں الملک العادل کے یہاں قیام کر کے "تریاق کبیر" کے اجزاء حاصل کئے اور تیار کر کے سلطان کی خدمت میں پیش کیا [21] اور اجازت لے کر شام و عراق چلا گیا۔ یہاں روئیدگیوں (نباتات) سے متعلق علم حاصل کرتا ہوا حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہوا اور اس فریضہ کو ادا کر کے اشبیلیہ لوٹ گیا[22]۔ بعض تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے کم و بیش دو سال مصر، شام اور عراق میں گذارے تھے[23]۔

اس طرح ایک روایت کے مطابق اس نے ۶۱۳ھ/۱۲۱۷ء میں حج بیت اللہ سے فارغ ہوا تو دوسری روایت کے مطابق ۶۱۴ھ/۱۲۱۸ء میں مصر پہنچا اور پھر الملک العادل کے ایماء پر کچھ عرصہ قیام

کرکے بیت اللہ کے لئے روانہ ہوا۔

اندلس پہونچکر ابوالعباس النباتی نے اپنے اس سفر کی روئیداد کو "کتاب الرحلۃ المشرقیہ یا کتاب "الرحلۃ النباتیہ المستدرکہ" ۲۶ کے نام سے مرتب کیا۔ اس کے اس سفرنامہ کے اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ نباتی ادویہ سے متعلق اس کی معلومات روایتی نہیں تھیں اور نہ ہی دیسقوریدوس (پہلی صدی عیسوی) اور جالینوس (متوفی ۱۳۸۳ء) کی کتابوں کی رہین، بلکہ براہ راست نباتات کے مطالعہ سے حاصل ہوتی تھیں۔ اور اس بابت اس بحث و مباحثہ ذاتی مشاہدہ پر ہی ہوتا ہے عمر کے آخری ایام میں اس نے نباتی ادویہ کے فروخت کے لئے ایک دوکان بھی کھول لی تھی ۲۷۔

ابوالعباس النباتی کا معیار زندگی بہت بلند تھا، ان کے پاس ہر وقت کتابوں کا ذخیرہ رہتا تھا، بقول لسان الدین ابن الخطیب۔

"وہ ہر علم و فن کی کتابیں برابر فراہم کرتے رہتے تھے اکثر اپنی کتابوں سے اصل و نفیس نسخہ جو نادرالوجود ہوتا تھا، جب کسی نے مانگا ثواب اور تعلیمی اعانت کے خیال سے اسکو دیدیتے تھے، اس بات میں بکثرت واقعات ان کے فضل و کرم کے شاہد ہیں" ۲۸۔

درج ذیل اقتباس سے بھی ابوالعباس النباتی کے علمی اور فنی اشتغال کا پتہ چلتا ہے۔

"وہ راتوں کو جاگا کرتے تھے کیونکہ دوسرے اوقات میں لوگوں کی ضرورتیں ان سے وابستہ رہتی تھیں، جس کی وجہ یہ تھی کہ طبی علاج میں وہ بہت خوبیوں کے آدمی تھے اور اپنی وثاقت و تدین کے سبب سے مرجع عام بنے ہوئے تھے" ۲۹۔

تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے بغداد، شام، مصر اور دوسرے ملکوں سے نادر کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ اندلس منتقل کر لیا تھا۔ ۳۰

ابوالعباس النباتی کو ابو محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم سے بڑی عقیدت تھی جو غلو کی حد تک پہونچ رہی تھی۔ ایک طرف اس نے جہاں نادر و کمیاب کتابوں کا ذخیرہ جمع کر لیا تھا تو دوسری طرف ابن حزم کی تصانیف کی اشاعت میں بھی کافی حصہ لیا ہے بقول لسان الدین ابن الخطیب ابن حزم کی یہ

"تصانیف انھیں اس قدر پسند خاطر تھیں کہ بصرف زر کثیر پوری توجہ کے ساتھ زاویہ خمول سے نکال کر لوگوں سے ان کو روشناس کرایا، یہاں تک کہ ابن حزم کی تمام کتابیں ایک ایک کرکے فراہم

گیں اور کوئی کتاب ان کی دسترس سے باہر نہ رہی، بجز ان کتابوں کے، جن کی کوئی اہمیت ان کے دل میں نہ تھی۔"[۳۱]

ابوالعباس النباتی کا شمار اپنے عہد کے کثیر التصانیف اور معتبر اصحاب قلم میں ہوتا ہے۔ ابن الخطیب قاضی ابو عبداللہ مراکشی کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

"ابوالعباس النباتی نے اپنے نوشتہ جات کا تذکرہ تین قسم کی فہرستوں میں کیا ہے۔ (۱) بسیط (۲) متوسط (۳) مختصر، ــــ ان میں سے میں نے بعض کو خود مصنف کے قلم کا لکھا ہوا اور بعض کو ان کے شاگردوں کا منقولہ پایا۔"[۳۲]

علم حدیث اور علم نباتات میں النباتی کی متعدد تصانیف کی نشاندہی تذکرہ نگاروں نے کی ہیں، ان میں ابن ابی صیبعہ نے صرف دو طبی کتابوں (شرح اسمار ادویۃ المفردہ لکتاب دیسقوریدوس اور کتاب ترکیب الادویہ کا نام تحریر کیا ہے۔ مولوی عبدالرحمٰن خاں کی کتاب میں بھی انھیں دونوں کا تذکرہ ہے۔ اس ذیل میں سب سے جامع فہرست ابن الخطیب نے مرتب کی ہے ان کی تحریر کے بموجب النباتی کی علم حدیث کی کتابوں کی تعداد ۸ اور طبی کتابوں کی تعداد ۵ ہے۔ مزید لکھتے ہیں:

"ان کتابوں کے علاوہ النباتی کی اور بھی جامع تصانیف۔ مفید مقالات اور گوناگوں حواشی ہیں۔"

علم حدیث :

لسان الدین ابن الخطیب نے اس ذیل میں درج ذیل کتابیں تحریر کی ہیں:

۱۔ کتاب المعلم: اس میں صحیح مسلم سے جو زائد حدیث بخاری میں مذکور ہیں، ان کو جمع کیا گیا ہے۔
۲۔ دارقطنی کی غریب حدیث مالک کا اختصار۔
۳۔ نظم الدراری: اس میں صحیح مسلم کی ان مفردات کو فراہم کیا ہے جو صحیح بخاری میں نہیں ہے۔
۴۔ طرق حدیث اربعین۔
۵۔ حکم الدعا فی ادبار الصلوات۔
۶۔ کیفیۃ الاذان یوم الجمعہ۔
۷۔ الحافل فی تذییل الکامل: یہ ابواحمد بن علی کی "الکامل فی الضعفاء والمنکرین" کا اختصار ہے۔

۸ - اخبار محمد بن اسحاق۔[۳۴]

علم النبات:

اس ذیل میں ان کتابوں کے نام تحریر کئے ہیں:

۱- شرح خسائکس ویسقوریدوس۔

۲- شرح ادویہ جالینوس۔

۳- الرحلۃ النباتیہ المستدرکہ۔

یہ کتاب اپنی شان میں مخصوص، اپنے فن میں معجز اور نہایت نادر تھی۔ لیکن مصنف کی وفات کے بعد مفقود ہوگئی ــــ یہ حقیقت ہے کہ میری معلومات کی حد تک کسی بھی لائبریری میں اس کی موجودگی کا پتہ نہیں چلتا، تاہم اس کے شاگرد رشید ابو محمد عبداللہ بن احمد ضیاء الدین ابن بیطار (۱۱۹۷-۱۲۴۸ء) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب الجامع لمفردات الادویۃ والاغذیہ میں کم و بیش ۹۲ اقتباسات نقل کرکے طبی دنیا پر بالعموم اور نباتاتی دنیا پر بڑا احسان کیا ہے۔ جس کے تناظر میں ادویہ، بالخصوص شناخت ادویہ کی حد تک اس کے فنی مقام کو بخوبی متعین کیا جاسکتا ہے۔

۴ - ایک کتاب ان اوہام کی تنبیہ میں، جو ادویۂ جالینوس کے ترجمے میں پیش آئے تھے۔

۵ - ایک کتاب غافقی کے اغلاط کی تنبیہ میں۔[۳۵]

۶ - کتاب فی ترکیب الادویہ[۳۶]

ذیل میں ان ادویہ کی فہرست نقل کی جارہی ہے جن کا اقتباس ابن بیطار نے اپنی جامع میں تحریر کیا ہے۔

الجامع لمفردات الادویہ والاغذیہ جلد اول:

آکثار، آملیلس، آافسروا، ارجنقتہ، اسرار، اشراس، اکرالبحر، اکرار، اغدریان، ام غیلانی، ام کلبہ، ایہقان، بابونج، بامیہ، باریلومایں، بردی، بشام، بشمہ، بطرہ، بقلۃ الاوجاع، بکاء، بلان، تامسافت، ترمد، تنوم، ثافشیا، ثمام، جنہات، جنی، جوذر (کل تیس دوائیں)

جلد دوم :

حاج، حب القلت، حجر السلوان، حجر البرر، حجر البارق، حدق، حزاموة، خمز، خیارشنبر، دلاغ دلبوث، ادوسر، دافتی اندرانی، دنب الخروف، زبل، زقوم، زفشتہ (کل اٹھارہ دوائیں)

جلد سوم :

سطرونیون، سطاجیس، سعوط، سعدان، شبرم آخر، ششتر، شطیبہ، شورہ، صالبیہ، صدف البواسیر صغرار، صلیان، صبنین، صوف البحر، صوطلہ، عرطنشیا، عشرق، عضرس، عفاز، علقم، علمان، عنب الدب عنم، علقی (کل چوبیس دوائیں)

جلد چہارم :

تاودند، فرو سانا، قرصعنہ، قشبہ، قضاب مصری، قلانش، قللجہ، قلوجہ، کبتینہ، کف مریم، کف الکلب محیس الاکلیلہ، لم لم، لوفا، لیفیہ، ماشیا، مثنان آخر، ملوخیا، ورس، ہشیر (کل بیس دوائیں)

ابوالعباس النباتی کی کتاب الرحلۃ المشرقیہ / المستدرکہ نایاب ہے۔ اس لئے نمونے کے طور پر نباتی کی چند دوائی تحقیقات کا جائزہ ابن بیطار کی الجامع کے حوالہ سے پیش کیا جا رہا ہے تاکہ دوائی پودوں کی دنیا میں اس کے فن کی پرکھ کا نیا معیار قائم کیا جا سکے۔

اشراس :

اس دوا کے ذیل میں ابن بیطار، ابوالعباس النباتی کی تحقیق پیش کرتے ہیں " اندلس کے کچھ لوگ اسے " برواق " کہتے ہیں جو یکسر غلط ہے۔ اور کچھ لوگ اس کو " مغاث " کی جڑ کہتے ہیں۔ چونکہ دونوں ہی چپکانے کی صلاحیت اور خاصیت رکھتے ہیں۔ اس لئے مشرقی علاقوں کے لوگ " مغاث " کی جڑ کو " اشراس " کہنے لگے۔ مشرقی ایشیاء کا پودا جسے " برواق " کہتے ہیں، دوسری چیز ہے جس کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک اور تیسری قسم " ھکی " نام کی بیت المقدس میں پیدا ہوتی ہے ؛ ۳۷

بارطولمان :

اس دوا کے ذیل میں نباتی لکھتے ہیں :

" کچھ لوگ اسے " صریمۃ الجدی " کہتے ہیں ۔ لیکن یہ درست نہیں ہے ۔ اندلس کے بعض پہاڑی علاقوں میں یہ " عینیہ " اور " ذات العین " کے نام سے مشہور ہے " ۳۸

اقشروا :

اس ذیل میں النباتی لکھتے ہیں :

" اندلس کے بعض ماہرین نباتات کے نزدیک یہ " قنطوریون اصغر " کے نام سے مشہور ہے لیکن یہ غلط ہے ۔ کیونکہ افعال وخواص اور مزاجی اعتبار سے بھی یہ پودا " قنطوریون " سے کوئی مشابہت نہیں رکھتا " ۳۹

خمخم :

اس ذیل میں ابن بیطار النباتی کی تحقیق کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" بعض ماہرین نباتات کا خیال ہے کہ " خمخم " " لسان الثور " کو کہتے ہیں ۔ یہ خیال درست نہیں ہے اس ذیل میں کتاب الرحلہ کے مصنف ابوالعباس نباتی کی بات صحیح ہے ، مشرقی ایشیا ، اور بکر کے لوگ " لسان الثور " کو " حمحم " (ح م ح م) کہتے ہیں ۔ اور چونکہ " خمخم " اور " حمحم " دونوں میں لفظی مماثلت بہت زیادہ ہے ، اس لئے یہ غلط فہمی ہوگئی ہے " ۴۰

معاون ادویہ کے تعلق سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں :

جنی :

" جنی احمر قطلب[۴۱] کے پھول کو کہتے ہیں ، اور اس سے مشہور بھی ہے ۔ اہل قیروان اسے " شابری " اہل عرب " برقہ " اور بیت المقدس کے باشندے " تیقیان " کہتے ہیں ۔ بعض اصحاب " تیقب " بھی کہتے ہیں " ۴۲

حجر السلوان :

" افریقہ کا مشہور پتھر ہے ۔ کتاب فقہ اللغۃ کے مؤلف کے مطابق پانی میں رکھنے سے پانی جذب کر لیتا ہے ۔ راقم[۴۳] میں واقع بشکرہ کے کچھ لوگوں نے مجھے بتایا کہ یہ ان کے یہاں کا مشہور و معروف سفید پتھر ہے ۔

ہ پانی میں تحلیل ہو کر دودھ کی طرح سفید ہو جاتا ہے۔ غم کو زائل کرنے اور دوسرے بہت سے امراض
ں اس کے محلول کا نوش کرنا مجرب ہے۔ تونس کے بعض ماہرین مجربات نے مجھے بتایا کہ یہ پتھر تونس کی
رطاجانہ نامی شہر میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس کی ایک قسم بلور سے ملتی جلتی ہے اور دوسری سے مختلف اور
ہلک زہر ہے"[۴۴]

نب الخزوف:

"ذنب الخزوف" اس کا اندلسی نام ہے۔ چنانچہ اندلس کے مشرقی علاقوں میں ایک ایسے پودے
ذنب الخزوف کہتے ہیں جو شکلاً گول ہوتا ہے اور جس کے پھول "خرف" کے پھولوں کے مشابہ مگر اس سے
ے ہوتے ہیں، اس کی جڑ یونانی زبان کے "سطرونیون" نامی پودے کی جڑ کی طرح لمبی ہوتی ہے اس کے
ولوں بیجوں اور پتوں کا ذائقہ مولی اور رائی کے مزے سے ملتا جلتا ہے، اس کا تذکرہ دیسقوریدوس
دوسرے اور جالینوس نے تیسرے مقالے میں "مندیون" کے نام سے کیا ہے۔ جس کے ضمن میں "ذنب
زوف" بھی درج ہے۔ اہل افریقہ اور اہل شام "ذنب الخزوف" کو ایک دوسرا پودا بتاتے ہیں جس کا
مندیون" سے کوئی تعلق نہیں ہے "ذنب الخزوف" کے مزے میں تلخی ہوتی ہے اور لزوجت بھی کسی قدر
رتی ہے۔ اس کے پتے اندلس کے "امتن" نامی پودے کے پتوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ پھول نرم اور
کلاً گول ہوتے ہیں۔ البتہ اس کی ٹہنیاں گنجان، مڑی ہوئی، بالائی کنارے پتلے اور سفید ہوتے ہیں
رزیریں حصہ موٹا ہوتا ہے۔ بیج انتہائی چھوٹے ہیں، اہل اندلس اس کے پتوں کے عصارہ کو آنکھوں کی
ی میں مجرب بتاتے ہیں۔ میں نے اسے بیت المقدس میں دیکھا ہے۔ وہاں کے لوگ بھی اس کا نام "ذنب
زوف" اور پاگل کتے کے کاٹے میں مجرب بتاتے ہیں"[۴۵]

ابوالعباس النباتی بلاشبہ ان خوش نصیب لوگوں میں ہیں جن کے شاگردوں نے ان کے فن اور
نفی اوصاف پر کافی کچھ لکھ کر محفوظ کر دیا۔ جن کے تناظر میں اس کی شخصیت اور فنی مقام کی تعین دشوار
ں، ــــ ابوعبداللہ بن سعید لوشی، ابومحمد بن الجزیری، ابوامیہ اسماعیل بن عیفر، ابوالاصبغ عبدالعزیز
سوری، ابوبکر محمد بن جابر سقطی ابوالعباس بن سلیمان اور ضیاء الدین الشہیر بہ ابن البیطار وغیرہ ابوالعباس
باتی کے انہیں شاگردوں میں سے ہیں۔

ابن الحریر کو بیاض ہے النباتی کی وفات کے بعد ان کے تلامذہ کی ایک جماعت نے رثائیہ بھی لکھا
یا۔ ابو محمد بن الحریری (جو خود بھی محدث اور نقاد تھے) نے نہایت توجہ اور خالص اہتمام کے ساتھ
باتی کے حالات و مناقب و ماثر کو ایک مجموعہ میں جمع کیا ہے اور اس کے شاگردوں کے "رثائیہ" بھی
ہمد شامل ہیں۔

ابو العباس النباتی کی شاعری کا تذکرہ ابن الخطیب نے ابو الحسن بن سعید کے "القدح المعلی" کے
الے سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ابو العباس (النباتی) جب مشرقی اور مغربی شہروں کی سیاحت کر کے اشبیلیہ واپس آئے تو میں
نکی صحبت میں بیٹھا کرتا تھا۔ اس وقت انھیں ادب سے بڑی دلچسپی لیتے ہوئے دیکھا۔ اس فن میں وہ
س طرح لطف اندوز ہوتے تھے جس طرح بحتری حلب میں اس فن سے حظ حاصل کرتا تھا، وہ اپنی شاعری
کا اظہار نہیں کرتے تھے، تاہم ان کے احباب و اصحاب ان کے اشعار سنتے اور روایت کرتے تھے ... وہ
کثر اپنے اشعار میں دمشق کے محاسن کو نہایت بسط و اطناب سے بیان کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے اشعار
بھی ختم نہیں ہوتے تھے اور میرے دل میں دمشق کی تصویر کھنچ جاتی اور شوق دل میں گدگدی پیدا کرتا
تھا کہ پیام اجل کو لبیک کہنے سے پہلے وہاں جا کر اپنی تمنائیں پوری کروں اور ہزار مرتبہ بھی دمشق کو دیکھوں
جب بھی آنکھیں اس کے محاسن سے سیر نہ ہوں۔"[۲۳]

اس سرسری جائزہ کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابو العباس النباتی العشاب الحافظ کا مرتبہ علم حدیث
اور علم النبات میں بہت بلند تھا، علم النبات میں دسترس کی وجہ سے صیدلہ میں بھی امتیازی شان رکھتا
تھا اور شناخت ادویہ میں وہ اپنے معاصرین میں بلند و فائق تھا[۲۴] اور عصر حاضر میں اس کی تحریروں اور
تحقیقات کے تناظر میں دونوں پہلوؤں پر انفرادیت کے ساتھ کام کیا جا سکتا ہے!!!

توضیحات و کتابیات

۱۔ ابو العباس کنیت ہے ۔ ابن فرتون نے ان کی کنیت "ابو جعفر" لکھی ہے۔ ملاحظہ کریں
الاحاطہ فی اخبار غرناطہ" ۱/۸۹، الوزیر محمد لسان الدین بن الخطیب رحمہ، مرتبہ محمد عبد اللہ ندوی
دار الطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی، حیدر آباد دکن سنہ اشاعت ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۹م طبع اول۔

۲ء ان کا شمار اموی خاندان کے موالی میں ہوتا ہے۔ اسی لئے "اموی" بھی کہلاتے ہیں الیضاً ۱/۸۹۔

۳ء ابن المرومیہ کی وجہ تسمیہ معلوم نہ ہوسکی۔ تحقیق جاری ہے (وسیم احمد اعظمی)

۴ء الیضاً ۱/۹۵۔

۵ء عبد العزیز بن عبد اللہ کا عربی مقالہ "طب اسلامی اور جدید سائنس" مترجم رضی الاسلام ندوی شائع شدہ "آیات" سہ ماہی صفحہ ۱۰۰، جلد ۲، شمارہ ۱، علی گڑھ ۱۹۹۱ء۔

۶ء الیضاً صفحہ ۱۰۱، جلد ۲، شمارہ ۱۔

۷ء الاحاطہ فی اخبار غرناطہ ۱/۹۵، شذرات الذہب فی اخبار من ذہب ۵/۱۸۳، مو ابو الفلاح عبد الحی بن العماد الحنبلی المتوفی ۱۰۸۹ھ، مکتبہ التجاری للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت لبنان معجم الاطباء ۱۲۳-۱۲۴ احمد عیسیٰ بک، مطبع فتح اللہ الیاس نوری واو لادہ، مصر الطبعۃ الاولیٰ ۱۹۴۲ء المورد صفحہ ۳۵، جلد ۱۲، شمارہ ۳ رسالہ۔

۸ء آیات سہ ماہی، صفحہ ۱۰۱، جلد ۲، شمارہ ۱، قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کی علمی خدمات ۲/۱۸۵ مولوی عبد الرحمٰن خاں، مدن موہن پریس۔ دہلی، طبع اول ۱۹۵۰ء

۹ء الاحاطہ فی اخبار غرناطہ ۱/۹۲۔

۱۰ء الیضاً ۱/۸۹۔

۱۱ء میری معلومات کی حد تک اس طبیب کا نام کسی تذکرے میں مذکور نہیں ہے۔ (وسیم احمد اعظمی)

۱۲ء الیضاً الاحاطہ فی اخبار غرناطہ ۱/۸۹۔

۱۳ء تفصیلی فہرست قاضی ابو عبد اللہ مراکشی نے مرتب کی ہے۔ ابن الخطیب نے اس کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ (وسیم احمد اعظمی)

۱۴ء ملاحظہ کریں اردو ترجمہ الاحاطہ فی اخبار غرناطہ ۱/۹۲-۹۱۔

۱۵ء الاحاطہ فی اخبار غرناطہ (اردو ترجمہ) ۱/۹۰۔

۱۶ء الیضاً ۱/۹۱۔

۱۷ء الیضاً ۱/۹۰۔

۱۸ء الیضاً ۱/۹۱۔

۱۹ ایضاً ۱/۹۱، عیون الانباء فی طبقات الاطباء (اردو ترجمہ) ۲/۲۰۶، طب اسلامی اور جدید سائنس وشناسی میں ایک جگہ ۱۱۰۰ء تحریر ہے۔

۲۰ عیون الانباء فی طبقات الاطباء مؤلفہ ابن ابی اصیبعہ متوفی ۶۶۸ھ/۱۲۷۰ء/ عبدالمجید اصلاحی (اردو ترجمہ) شائع کردہ مرکزی کونسل برائے تحقیقات طب یونانی نئی دہلی، مطبوعہ انٹر گرافیکا، گووند پوری نئی دہلی طبع اول ۱۹۹۲ء۔ قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کی علمی خدمات ۲/۱۸۶، طب اسلامی اور جدید سائنس (مقالہ) آیات سہ ماہی، صفحہ ۱۰۱ جلد ۲، شمارہ ۱ میں "الملک الافضل" تحریر ہے (وسیم احمد اعظمی)

۲۱ عیون الانباء فی طبقات الاطباء (اردو ترجمہ) ۲/۲۰۶۔

۲۲ ایضاً ۲/۲۰۶۔

۲۳ تاریخ الاطباء ۱۱۰، حکیم غلام جیلانی، لاہور، عیون الانباء فی طبقات الاطباء (اردو ترجمہ) ۲/۲۰۶۔

۲۴ ملاحظہ کریں مقالہ طب اسلامی اور جدید سائنس، آیات صفحہ ۱۰۱، جلد ۲، شمارہ ۱، علی گڑھ ۱۹۹۱ء

۲۵ ابن بیطار نے ابوالعباس النباتی کی اس کتاب کا نام کتاب الرحلہ اور کتاب الرحلۃ المشرقیہ، دونوں ہی لکھا ہے۔ ملاحظہ کریں کتاب الجامع لمفردات الادویہ والاغذیہ ۲/۱۴، ۲/۷۵، ۳/۱۲۶، ۴/۷۴۔

۲۶ لسان الدین ابن الخطیب کی کتاب الاحاطہ فی اخبار غرناطہ ۱/۹۳۔

۲۷ (مقالہ) طب اسلامی اور جدید سائنس "آیات" علی گڑھ ۱۹۹۱ء صفحہ ۱۰۱، جلد ۲، شمارہ ۱۔

۲۸ الاحاطہ فی اخبار غرناطہ (اردو ترجمہ) ۱/۹۱۔

۲۹ ایضاً ۱/۹۱،

۳۰ ایضاً ۱/۹۳۔

۳۱ ایضاً ۱/۹۲۔

۳۲ ایضاً ۱/۹۲۔

۳۳ ایضاً ۱/۹۳

۳۴ ایضاً ۱/۹۳

۳۵ ایضاً ۱/۹۳

۳۶ عیون الانباء فی طبقات الاطباء ۲/۲۰۶۔

۳۷؎ الجامع لمفردات الادویہ والاغذیہ ۱/۸۶ (اردو ترجمہ)
۳۸؎ ایضاً ۱/۲۳۳۔
۳۹؎ ایضاً ۱/۷۔
۴۰؎ ایضاً ۲/۱۵۸۔
۴۱؎ ایک رو ئیدگی۔ جو عام طور سے بانسوں کے جنگلات اور پانی کے کنارے پیدا ہوتی ہے۔ آذربائیجان میں بکثرت پائی جاتی ہے۔
۴۲؎ الجامع لمفردات الادویہ والاغذیہ ۱/۴۳۲ (اردو ترجمہ)
۴۳؎ جنوبی جزائر کا ایک پہاڑی علاقہ۔
۴۴؎ الجامع لمفردات الادویہ والاغذیہ ۲/۱۷ (اردو ترجمہ)
۴۵؎ ایضاً ۲/۲۶۸
۴۶؎ الاحاطہ فی اخبار غرناطہ ۱/۹۵
۴۷؎ ایضاً ۱/۹۴-۹۳۔
۴۸؎ (مقالہ) طب اسلامی اور جدید سائنس۔ آیات سہ ماہی صفحہ ۱۰۱، جلد ۲ شمارہ ۲ علی گڑھ ۱۹۹۱

ابوسفیان اصلاحی ۔ علی گڑھ

قسط ۲

قصائد المناسبات

ان میں اس کے وہ قصائد شامل ہیں جن کا تعلق مراثی سے ہے ۔ یا کسی کی یاد میں لکھے گئے ہیں ۔ یا یا کسی کی شان سے متعلق ہیں ۔ حافظ اور شوقی پر لکھے گئے مراثی کا شمار اس زمرے میں ہے ۔ انکے علاوہ "دو زن مصری بہادر" حجاج "اور" روس" کی تعریفیں اس میں شامل ہیں ۔ شاعرم ۔ ع الہشری، عدلی یکن، محمد توفیق نسیم، شکیب ارسلان، امین عثمان، جبرئیل اور سعد زغلول کی شخصیات پر اس نے جو کچھ اظہار خیال کیا وہ بھی انہیں قصائد میں شامل ہیں ۔ ان میں سے کچھ قصائد عربوں کی شان میں کہے گئے ہیں ۔ مثلاً شاہ عبدالعزیز آل سعود، مجاہد فوزی القاوقجی اور فلسطین کے مفتی اعظم امین الحسینی پر کہے گئے قصائد ۔

اس کے بیشتر قصائد انسانیت و قومیت پر مبنی ہیں ۔ ان قصائد کو اسالیب اور فنی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو شاعری کے معیار پر پورے نہیں اترتے ۔ ان میں کچھ قصائد مثلاً ماساۃ اور " رجل" میں اچھی تصویر کشی اور فطری جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے ۔ لیکن بعض قصائد مثلاً حافظ ابراہیم پر کہے گئے مرثیہ میں تصنع ہے اور ایسے ہی بعض میں تقلید کا رنگ نمایاں ہے، مثلاً مجاہد العربی القاوقجی کی شان میں جو قصیدہ ہے اس میں تقلید کا رنگ موجود ہے ۔ وہ ان کے استقبال میں کہتا ہے ۔ (۱)

وقیل دنا وحوم فاشْرَأَبَّتُ   صفاف النیل تستھدی حیامه

وعانقة الصباح علی رباھا   غضیض الطرف ینتقض منامه

وملائکه علی سیناء برق   بعین الملھمین ونافشافة (۲)

---

(۱) محاضرات فی شعر علی محمود طه ص: ۱۲۸ - ۱۲۹ -

(۲) شرق وغرب ص ۱۳۲ بحوالہ محاضرات فی شعر علی محمود طه ص ۱۲۸ - ۱۲۹ -

۳۷ الجامع لمفردات الادویہ والاغذیہ ۱/۸۹ (اردو ترجمہ)

۳۸ ایضاً ۱/۲۳ ۔

۳۹ ایضاً ۱/۷ ۔

۴۰ ایضاً ۲/۱۵۸ ۔

۴۱ ایک رو ئیدگی۔ جو عام طور سے بانسوں کے جنگلات اور پانی کے کنارے پیدا ہوتی ہے ۔ آذربائیجان میں بکثرت پائی جاتی ہے ۔

۴۲ الجامع لمفردات الادویہ والاغذیہ ۱/۴۳۲ (اردو ترجمہ)

۴۳ جنوبی جزائر کا ایک پہاڑی علاقہ ۔

۴۴ الجامع لمفردات الادویہ والاغذیہ ۲/۱۷ (اردو ترجمہ)

۴۵ ایضاً ۲/۲۶۸

۴۶ الاحاطہ فی اخبار غرناطہ ۱/۹۵

۴۷ ایضاً ۱/۹۴-۹۳ ۔

۴۸ (مقالہ) طب اسلامی اور جدید سائنس ۔ آیات سہ ماہی صفحہ ۱۰۱ جلد ۲ شمارہ ۱ علی گڑھ ۱۹۹۱

قسط ۴

قصائد الماسیات

ان مماس کے وہ قصائد شامل ہیں جن کا تعلق مراثی سے ہے۔ یا کسی کی یاد میں کہے گئے ہیں۔ یا یا کسی کی شان سے متعلق ہیں۔ حافظ اور شوقی پر کہے گئے مراثی کا شمار اسی زمرے میں ہے۔ انکے علاوہ دونوں مصری بہادر "مجاج" اور "روس" کی تعریفیں اس میں شامل ہیں۔ شاعر ع الہشری، علی یکنمد محمد توفیق نسیم، شکیب ارسلان، امین عثمان، جبرئیل اور سعد زغلول کی شخصیات پر اس نے جو کچھ اظہار خیال کیا وہ بھی انہیں قصائد میں شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ قصائد عربوں کی شان میں کہے گئے ہیں۔ مثلاً شاہ عبدالعزیز آل سعود، مجاہد فوزی القاوقجی اور فلسطین کے مفتی اعظم امین الحسینی پر کہے گئے قصائد۔

اس کے بیشتر قصائد انسانیت و قومیت پر مبنی ہیں۔ ان قصائد کو اسالیب اور فنی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو شاعری کے معیار پہ پورے نہیں اترتے۔ ان میں کچھ قصائد مثلاً مأساۃ اور "رحل" میں اچھی تصویر کشی اور فطری جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ لیکن بعض قصائد مثلاً حافظ ابراہیم پر کہے گئے مرثیہ میں تصنع ہے اور ایسے ہی بعض میں تقلید کا رنگ نمایاں ہے، مثلاً مجاہد العربی القاوقجی کی شان میں جو قصیدہ ہے اس میں تقلید کا رنگ موجود ہے۔ وہ ان کے استقبال میں کہتا ہے۔ (۱)

وقیل دنا وحوم فانشرأبّت	ضفاف النیل تستہدی حیامہ
وعانقۃ الصباح علی رباھا	غضیض الطرف ینقض منامہ
ولاکبہ علی سیناء برق	بعین الملہمین ونافشا قہ (۲)

---

(۱) محاضرات فی شعر علی محمود طہ ص: ۱۲۸ - ۱۲۹ -

(۲) شرق مغرب ص ۱۳۲ بحوالہ محاضرات فی شعر علی محمود طہ ص ۱۲۸ - ۱۲۹ -

علی محمود طٰہٰ کا اسلوب

علی محمود طٰہٰ کی شاعری کا موازنہ ابو شادی، شکری اور ناجی کی شاعری سے نہیں کیا جا سکتا۔ علی محمود طٰہٰ کا مطالعہ ان لوگوں کے مقابلے میں کم تھا۔

مغربی ادب سے اس کی واقفیت تھوڑی تھی۔(۱) یہی وجہ ہے کہ مصری حیات اور جدید تقاضے اس کے یہاں بہت کم ملتے ہیں۔ ابو شادی اور شکری کا نے جدید شاعری کے میدان میں اپنی اہمیت کو تسلیم کرا لیا اور ان کا اپنا ایک اسلوب ہے۔ علی محمود طٰہٰ کے یہاں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی کہ جس کی وجہ سے اس کی انفرادیت قائم ہو سکے۔ پھر بھی اس نے ایک حد تک اسلوب میں منفرد ہونے کی کوشش کی ہے۔ نازک الملائکہ نے اس کے اسلوب کو ان عناوین کے تحت تقسیم کیا ہے۔

(۱) علی محمود طٰہٰ کی شاعری میں بے پناہ موسیقیت اور نغمگی ہے۔ یہاں اس کا مقلدانہ رویہ نمایاں ہے۔ روایتی شعراء کا رنگ اس کے یہاں واضح ہے۔ (۲) الصورۃ الشعریہ (۳) اللفظیۃ العیۃ (۴) الرمز (۵) الضور واللون (۲)

الفاظ کے مناسب استعمال کی وجہ سے اس کی شاعری میں بڑی لطیف غنائیت پیدا ہوگئی ہے۔ عربی شاعری بالخصوص جاہلی شاعری میں جو ایک ملامت کا رجحان چلا آ رہا تھا اس سے اس نے انحراف کیا۔ فکری اور فنی قصائد میں اس نے ایک طریقہ اپنایا۔ اس نے رقت اور موسیقی پیدا کرنے والی بحروں کو استعمال کیا۔ شراب کی عظمت کو بیان کرتے وقت اس نے ایک قافیہ کی پابندی کو توڑ دیا۔ بیشتر قصائد میں عورتوں کی عظمت و فوقیت کو بیان کیا اس نے بتایا کہ عورت ایک حسین آواز، فنکار اور لذّت کو عام کرنے والی ہے۔ اس نے خاص عورت کو یہاں متعین نہیں کیا۔ اس نے فطرت کی عظمت پر روشنی ڈالی اور نہایت خشوع کے ساتھ اس کے سامنے جھک گیا۔ یونانی قصوں کا بھی اس کی شاعری میں ذکر ہے۔ خاص کر اس کے دیوان " ارواح واشباح " میں۔ یہاں اس کی فکر میں سطحیت اور افق شاعری

---

(۱) تاریخ الادب العربي فی العصر الحاضر ص: ۲۷۲۔

(۲) محاضرات فی شعر علی محمود طه ص: ۱۴۱

میں نظر آتی ہے۔ (۱)

اس کے کلام کے محاسن و معائب کا ذکر کیا جائے تو بہت طول پکڑ جائے گا۔ اس کے الفاظ و معانی میں ایک ایسا حسن اور موسیقی ہے جس کی وجہ سے حسن دو بالا ہو گیا۔ بیشتر جگہوں پر لفظی و معنوی حسن موجود ہے۔ وہ جدید یت کے بین بین ہے۔ اس کے بیشتر دواوین میں قواعد کا پاس و لحاظ موجود ہے البتہ "ماسیات" میں یہ چیزیں نہیں ملتیں۔ اسے فطرت سے بہت محبت ہے۔ فطرت و انسانیت کا ترجمان ہے۔ مناظر فطرت سے اسے بہت دلچسپی ہے۔ وہ کسی خاص جماعت کا شاعر اور ترجمان نہیں ہے وہ اپنی ذات کا مغنی ہے۔ جماعت و سوسائٹی کے حدود سے بلند تر ہے۔ بعض چیزیں اس کے یہاں ایسی ہیں جن سے گرانی ہوتی ہے۔ وہ موسیقی کا شیدائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوافی پر اس نے زیادہ خیال نہیں کیا۔ اس کے یہاں قافیوں میں بڑی خرابیاں ہیں۔ (۲)

علی محمود طٰہٰ کے دواوین

(۱) "الملاح التائہ" اس کا پہلا دیوان ہے۔ اس میں اس نے اپنے رومانی خیالات کو پیش کیا ہے۔ اسے کائنات سے بڑا گہرا لگاؤ تھا۔ لامرتین "کا قصیدہ" البحیرہ" اس میں شامل ہے یہ فرانسیسی، رومانی شاعری کا زبردست شاعر ہے۔ قصیدہ "اللّٰہ والشاعر" میں علی محمود طٰہٰ نے خدا سے اپنے تعلق کا اظہار کیا ہے۔ جس میں اس نے اپنے رب سے سرگوشی کی ہے۔ لامرتین کے خیالات سے متاثر ہونے کی وجہ سے مادی نقطۂ نظر کو زیر بحث لایا۔

اس دیوان میں زیادہ تر عہد شباب کی داستان سرائی کی ہے۔ "رمیاط" "شہر" "السنانیہ" کے قدرتی مناظر پر روشنی ڈالی ہے۔ بحیرہ "المنزلہ" اور وہاں کے بر و بحر کے مشاہدات پر بڑی اچھی روشنی ڈالی ہے۔ اس میں سب سے خوبصورت قصیدہ "علی الصخرۃ البیضاء" ہے۔ وہ کائنات کی چیزوں کو حیرت سے دیکھتے ہوئے اس میں کھو جاتا ہے وہی اس کے لیے سکون و اطمینان کا باعث ہے۔ یہاں اس کے افکار کھل کر سامنے آتے ہیں۔

---

(۱) تاریخ الشعر العربی الحدیث ص: ۲۸۶

(۲) حدیث الاربعاء ۱۴۶/۳

اس دیوان میں مصری شاعری کی تقلید نہیں کی۔ بلکہ اپنے خیالات و احساسات اور زندگی کے تجربات کو اپنے رنگ میں پیش کیا ہے۔ "فرختہ الشاعر" اس دیوان کا عظیم الشان قصیدہ ہے۔ (۱)

ایہا الشاعر الکئیب مضی اللیل ... مازلت غارقاً فی شجونک

مسلماً رأسک الحزین الی الفکر ... وللسہد ذابلات جفونک

وفم ناضب بہ حر انفاس ... ملک یطفس علی ضعیف انینک

وقد تمسک الیراع واخری ... فی ارتعاش تمر فوق جبینک (۲)

یہ دیوان ۱۹۳۴ء میں منظر عام پر آیا۔ درج ذیل خصوصیات پر یہ دیوان مشتمل ہے۔

(۱) شاعر کو اپنے فن پر ناز ہے۔ اس نے خود کو بنی نوع سے بڑھ کر فرشتہ قرار دیا۔ شاعر کا ہبوط آسمان سے ہوا ہے۔ وہ قصیدہ "میلاد الشاعر" میں گویا ہے۔

ہبط الارض کالشعاع السنی ... بعصا ساحر و قلب نبی

لمحۃ من اشعۃ الروح حلت ... فی تجالید ھیکل بشری (۳)

(۲) کائنات کی ہر شئی ایک شاعر کی آمد پر جشن طرب مناتی ہے۔

حینما شارفت بہ افق الدر ... ض زھا الکون بالولید الصبی

وسری الکائنات نور محیا ... ضاحک البشر عن فواد رضی (۴)

(۳) ایک شاعر کا دل بغض و فساد سے پاک اور خیر و سعادت کا منبع و مصدر ہوتا ہے۔

لا تقل کم اخ لک الیوم فی الا ... رض شقی الوجدان اسوان حائر

وان تکن سادرتہ فی الارض آلام ... معلت بہ الحسد ودن العواثر (۵)

(بقیہ آئندہ)

---

(۱) الادب العربی المعاصر فی مصر ص: ۱۲۵

(۲) علی محمود طہ شعرہ دراسہ ص: ۱۴۵

(۳) ایضاً ص: ۶۲۰

(۴) ایضاً ص: ۶۲۰

(۵) علی محمود طہ شعرہ و دراسۃ ص: ۶۳۰

ڈاکٹر محمد عمر شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علیگڈھ

شاہی محل میں خدمت کرنے کے اوقات

فنچ نے لکھا ہے کہ "قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ دربار اور یہاں ان باغوں میں نہ کسی درباری یا باغبانوں کو مستقل حاضر رہنے کے لئے تعینات کیا گیا ہے لیکن سب باری باری سات دن اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہیں؛

سرکاری جیل خانے؛

گوالیار، رنتھبھور اور رہتاس، ان تین جگہوں پر سرکاری جیل خانے تھے۔ رنتھبھور صرف ان منصبداروں کو بھیجا جاتا تھا جنہیں وہاں پہونچنے کے دو ماہ بعد قتل کر دیا جاتا تھا۔ جب وہ پوست کھاکر بالکل مدہوش ہو جاتے تھے تو انھیں دیواروں کی منڈیروں سے نیچے گرا دیا جاتا تھا تاکہ وہ نیچے کی چٹان سے ٹکراکر مر جائیں۔ رہتاس صرف ان منصبداروں کو بھیجا جاتا تھا جن کو عمر قید کی سزا دی جاتی تھی، شاذ و نادر ہی ان میں کوئی وہاں سے زندہ واپس آتا تھا۔

سر کی کھوپڑیوں کا مینار؛

پانی پت میں فنچ نے "کئی سو چوروں کی کھوپڑیوں کا بنا ہوا ایک مینار دیکھا تھا اور ایک میل کی دوری تک ان کے دھڑ پھانسی کے تختوں پر لٹکے ہوئے تھے"۔

اس دیوان میں مصری شاعری کی تقلید نہیں کی۔ بلکہ اپنے خیالات واحساسات اور زندگی کے تجربات
نہ رنگ میں پیش کیا ہے: غرفة الشاعر اس دیوان کا عظیم الشان قصیدہ ہے۔ (۱)

ایها الشاعر الکئیب مضی اللیل   ما زلت غارقاً فی شجونک
مسلماً رأسک الحزین الی الفکر   وللسهد ذابلات جفونك
ویدٌ ناضب به حر انفاء   سك یطفن علی ضعیف انینك
وقد تمسک الیراع واخری   فی ارتعاش تمر فوق جبینك (۲)

یہ دیوان ۱۹۳۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔ درج ذیل خصوصیات پر یہ دیوان مشتمل ہے۔

) شاعر کو اپنے فن پر ناز ہے۔ اس نے خود کو بنی نوع سے بڑھ کر فرشتہ قرار دیا۔ شاعر کا ہبوط
نہ سے ہوا ہے۔ وہ قصیدہ "میلاد الشاعر" میں گویا ہے۔

هبط الارض کالشعاع السنی   بعصا ساحر و قلب نبی
لمحة من اشعة الروح حلت   فی تجالید هیکل بشری (۳)

) کائنات کی ہر شئ ایک شاعر کی آمد پر جشن طرب مناتی ہے۔

حینما شارفت به أفق الدر   ض زها الکون بالولید الصبی
وسبی الکائنات نور محیا   ضاحك البشر عن فواد رضی (۴)

) ایک شاعر کا دل بغض و عناد سے پاک اور خیر و سعادت کا منبع و مصدر ہوتا ہے۔

لا تقل کم اخ لك الیوم فی الا   رس شقی الوجدان أسوان حائر
وان تکن ساورته فی الارض آلا م   وحلت به الجسد و ن العواثر (۵)

(بقیہ آئندہ)

---

۱) الادب العربی المعاصر فی مصر ص: ۱۲۵
۲) علی محمود طہٰ شعرہ و دراسہ ص: ۵۴۱
۳) ایضاً ص: ۶۲۰
۴) ایضاً ص: ۶۲۰
۵) علی محمود طه شعره و دراسة ص: ۹۳۰

عہدِ مغلیہ یورپی سیاحوں کی نظر میں

(۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۷ء) قسط ۷

ڈاکٹر محمد عمر شعبۂ تاریخ ۔ مسلم یونیورسٹی ، علیگڈھ

شاہی محل میں خدمت کرنے کے اوقات

فنچ نے لکھا ہے کہ "قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ دربار اور یہاں ان باغوں میں نہ کسی درباری یا
باغبانوں کو مستقل حاضر رہنے کے لئے تعینات کیا گیا ہے لیکن سب باری باری سات دن اپنی
ڈیوٹی انجام دیتے ہیں :

سرکاری جیل خانے :

گوالیار، رنتھمبور اور رہتاس، ان تین جگہوں پر سرکاری جیل خانے تھے۔ رنتھمبور صرف
ان منصبداروں کو بھیجا جاتا تھا جنہیں وہاں پہونچنے کے دو ماہ بعد قتل کر دیا جاتا تھا۔ جب وہ
دست کھا کر بالکل مدہوش ہو جاتے تھے تو انھیں دیواروں کی منڈیروں سے نیچے گرا دیا جاتا تھا
تاکہ وہ نیچے کی چٹان سے ٹکرا کر مر جائیں۔ رہتاس صرف ان منصبداروں کو بھیجا جاتا تھا جن کو
عمر قید کی سزا دی جاتی تھی، شاذ و نادر ہی ان میں کوئی وہاں سے زندہ واپس آتا تھا۔

سر کی کھوپڑیوں کا مینار :

پانی پت میں فنچ نے "کئی سو چوروں کی کھوپڑیوں کا بنا ہوا ایک مینار دیکھا تھا اور ایک میل
کی دوری تک ان کے دھڑ پھانسی کے تختوں پر لٹکے ہوئے تھے"

مغل بادشاہوں کے مقبرے؛

آگرہ میں اکبر اور دہلی میں ہمایوں کے مقبروں کو دیکھنے کے لئے فنچ گیا تھا۔ ان مقبروں کے بارے میں اپنے تاثرات کا اس نے ذیل میں ذکر کیا ہے۔

ہمایوں کا مقبرہ؛

پرانی دہلی کی طرف سے اگر کوئی شخص وہاں جاتا تھا تو اسے ہمایوں کے مقبرے تک پہونچنے کے لئے ایک محراب دار پل سے جانا پڑتا تھا۔ جس کمرہ میں اس کی قبر واقع تھی وہاں بیش بہا قالینیں بچھی ہوئی تھیں۔ اس نے لکھا ہے کہ: "وہ مقبرہ بھی ایک سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا، اس پر تکلف ایک شامیانہ لگا ہوا تھا اور اس کے سامنے چھوٹے تختوں پر کتابیں رکھی ہوئی تھیں جن کے بغل میں اس کی تلوار، دستار اور جوتے رکھے ہوئے تھے۔"

اکبر کا مقبرہ؛

فنچ نے لکھا ہے کہ جب وہ اسے دیکھنے گیا تھا تو اس کی تعمیر نامکمل تھی۔ وہ عمارت پانچ منزلہ تھی۔ پہلی منزل میں سنہری ایک گول کفن میں لپٹی ہوئی اس کی نعش رکھی ہوئی تھی۔ دوسری منزل میں "بطور ایک یادگار" اس کے کپڑوں کی الماری رکھی ہوئی تھی۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ "میرے وہاں سے واپس آنے کے وقت تک وہ قبر مکمل نہ ہوئی تھی لیکن جنازہ کی صورت میں وہاں اس کی میت رکھی ہوئی تھی جس کے اوپر سنہری پھولوں سے منقش ایک سفید چادر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے سرہانے اس کی تلوار اور ڈھال رکھی ہوئی تھی۔ چھوٹے سے ایک تکیئے پر اس کی دستار رکھی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ دو تین کتابیں جن کی جلدیں ملمع تھیں۔ اس کے پیتانے اس کے جوتے رکھے ہوئے تھے اور ایک خوشنما چلمچی اور ایک لوٹا رکھا ہوا تھا۔ جو شخص اس قبر کے نزدیک جاتا تھا تو وہ اظہار احترام کیا کرتا تھا اور جوتے اتار لیتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ تھوڑی سی مٹھائی، خوشبودار پھول لے جاتا تھا۔ وہ یا تو ان چیزوں کو فرش پر ڈال دیتا تھا یا پھولوں سے اس قبر کو سجاتا تھا۔" فنچ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس قبر کو ہندو اور مسلمان دونوں ایک ہی طرح

پرستش کرتے تھے جو اسے ایک موتی سمجھتے تھے۔

بر کی بیواؤں کے لئے انتظامات!

اپنے سیاحت نامہ میں فنچ نے یہ بھی لکھا ہے کہ مقبرے کی چار دیواری کے اندر اکبر کی بیگمات کے رہنے کے لئے چھوٹا سا ایک محل بنا ہوا تھا جس میں وہ کران سے اپنی زندگی گذارنے کی توقع کی جاتی تھی۔ ان کے اخراجات کے لئے روزینہ مقرر کر دیا گیا تھا۔

(۵) امراء

برہان پور میں خان خاناں کا باغ!

برہان پور شہر سے دو کوس کی دوری پر خان خاناں کا لگوایا ہوا باغ واقع تھا جو "لال باغ" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ شہر سے باغ تک جانے والے راستے کے دونوں طرف سایہ دار درخت لگوائے گئے تھے۔ اس میں کئی مسرت افزا مقامات تھے۔ جیسے چار درختوں کے درمیان چھوٹا سا چوکور ایک تالاب اور ایک ضیافت خانہ۔ وہ باغ ایک دیوار سے گھرا ہوا تھا۔

لاہور میں آصف خاں کا باغ:

لاہور میں آصف خاں کا لگوایا ہوا باغ قلعہ کے مشرقی جانب واقع تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ راستے صاف ستھرے تھے، غوطہ خوری کے لئے تالاب اور پانی کی ہودیاں تھیں۔ جب کوئی شخص خوشنما ایک دیوان خانہ میں داخل ہوتا تھا جو پتھریلے کھمبوں پر کھڑا تھا، اس کے وسط میں چار میناروں پر بنا ہوا ایک تالاب تھا اور اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے ایک ہودی تھی۔ اس کے آگے دوسرے دالان اور راستے تھے۔ غوطہ خوروں کی عمارتیں اس کی بیگمات کے لئے صاف ستھری بنائی گئی تھیں اور چھوٹے ایک باغ کے عقب میں ایک بارہ دری تھی۔ اس باغ کے وسط میں پر عظمت ایک ہودی تھی، جس کے اوپر عمدہ عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے مقابل ایک تالاب تھا جس میں بڑے اچھے دالان تھے۔ جس کے چاروں کنارے میناروں پر سدھے ہوئے تھے۔

(۶) متفرقات

ایک راجپوت کی جوانمردانہ قربانی:

۶ر جنوری ۱۶۱۱ء کو شکار کھیلنے کے موقع پر ایک شیر نے بادشاہ پر حملہ کر دیا۔ راجپوت سرداروں میں سے ایک نے اپنی بانہہ اس شیر کے منہ میں ٹھونس دی۔ اس طرح اس نے جہانگیر کی جان بچالی جبکہ خرم اور راجہ رام داس نے اس درندہ کا کام تمام کر دیا۔ اس بہادری کا اتنا صلہ دیا گیا کہ اس راجپوت کو اس بنا پر" بادشاہ نے اپنی پالکی میں سوار کر لیا، اور اپنے ہاتھ سے اس کے زخموں کو صاف کیا اور مرہم پٹی کی"

ملک عنبر اور مغل بادشاہ:

جس زمانے میں فنچ برہانپور میں مقیم تھا تو ملک عنبر دس ہزار سپاہیوں اور چالیس ہزار دکھنی سپاہیوں کے ساتھ وہاں سے تیس کوس کی دوری پر تھا۔ اس بات کا بہت خطرہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ برہانپور تاخت وتاراج کر دیا جائے۔ سلطان پرویز اور راجا مان سنگھ کی قیادت میں آئی ہوئی کمک نے شہر کو بچالیا۔ بہر حال، جب یہ سیاح برہانپور پہونچا تو اسے یہ خبریں ملیں کہ دکھنیوں نے رائے واری کو لوٹ لیا۔ جولائی کے مہینے میں جہانگیر کی دکھن میں تعینات افواج نے احمدنگر کا محاصرہ اٹھا لیا۔ چارے اور پانی کی قلت کیوجہ سے وہ فوج لوٹ آئی پانی کی کمیابی کا یہ عالم تھا کہ پانی کی ایک مشک ایک روپے میں ملتی تھی۔

بزدل لوگوں کو سزا:

جس زمانے میں فنچ آگرہ میں موجود تھا تو پٹنہ کے تاخت وتاراج کئے جانے کی خبر آگرہ پہونچی۔ پٹنہ پورب میں بڑا ایک شہر تھا۔ ایک امیر نے اسے بچالیا" بارہ مخصوص شہریوں کو بادشاہ کی خدمت میں بھیجا۔ جہانگیر نے" ان کی داڑھیاں، مونچھیں اور سر کے بال منڈوالئے زنانہ لباس میں ملبوس گدھوں پر بٹھا کر آگرہ کی گلیوں میں گشت لگوانے اور دوسرے دن، ان

کے سر قلم کر دینے ' کا حکم دیا۔

دانیال کے بیٹوں کا بپتسما (اصطباغ)

دانیال کے تینوں بیٹوں، تہمرس اور ہوشنگ کا مذہب تبدیل کیا گیا اور ان کے نام ڈون فیلیپو، ڈون کارلو اور ڈون ہنریز رکھے گئے۔ بڑے ایک جلوس میں انھیں گرجہ گھر میں لے جایا گیا۔ اس کی پیشوائی پاکنس کر رہا تھا جس کے ہاتھ میں سینٹ جون کا علم تھا۔

شہزادہ خسرو کو نابینا کرنا؛

شہزادہ خسرو کے نابینا کئے جانے کے بارے میں اس نے لکھا ہے کہ بادشاہ نے "جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایک شیشے سے جلوا کر اس کی آنکھیں باہر نکلوا لی تھیں، دوسرے لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ پیچھے سے اس کی آنکھوں میں رومال باندھ کر اسے اندھا کر دیا گیا تھا اور راہبی مہران پر تثبیت کر دی گئی۔"

انارکلی کا فرضی افسانہ؛

معاصر سب سیاحوں میں صرف ہی ایک ایسا سیاح ہے جس نے اس قصے کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بارے میں اس نے یہ لکھا ہے۔ اس کے آگے بطور یادگار دون شاہ اور اس کی ماں کا ایک خوشنما مقبرہ ہے۔ جس کا شمار اکبر کی بیبیوں میں ہوتا تھا اس خاتون سے (جس کا نام انارکلی تھا) شاہ سلیم محبت کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر بادشاہ نے اسے اپنے محل کی ایک دیوار میں چنوا دینے کا حکم صادر کیا جہاں وہ مر گئی۔ بادشاہ نے شہزادے سے اس کی محبت کو ظاہر کرنے کی غرض سے ایک چوکور باغ کے وسط میں، جس کی دیواریں بہت خوشنما تھیں، پتھر کا ایک شاندار مقبرہ تعمیر کرنے کا حکم دیا جس میں ایک دروازہ تھا اور اس کے اوپر کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔

جون جورڈین (۱۶۰۸ء تا ۱۶۱۷ء)

سوانح عمری؛ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت قبول کرنے سے پہلے جون جورڈین کے بہت کم

حالات معلوم ہوتے ہیں۔ ڈورسٹ سنائر میں واقع لائم ریجس نامی مقام کے تاجر جون جورڈن کا وہ چھوٹا بیٹا تھا۔ اس کی اصلی تاریخ ولادت کا بھی پتہ نہیں ملتا ہے۔ یا تو اس کی ولادت ۱۵۷۲ء کے نصف آخری زمانے میں یا ۱۵۷۳ء کے اوائل میں اس کی ولادت ہوئی تھی ۱۵۸۸ء کے موسم خزاں میں اس کے والد کا انتقال ہوا تھا۔ ۱۶۰۶ء سے پہلے جورڈن کی زندگی کا زمانہ "بالخصوص یا تو پرتگال یا اس سے متعلقہ نوآبادیات کے لئے بحری تجارتی سفر میں گذرا تھا۔ یا تو گرتی ہوئی تجارت یا کمپنی کے گماشتے کی اس نفع بخش ذاتی تجارت کی کشش کی وجہ سے جس سے وہ ان حدود کے اندر اور باہر جو ان کے مالکوں نے ان کے لئے مقرر کر رکھے تھے۔ دونوں طرح سے استفادہ اٹھا رہے تھے، اس نے اپنا ذاتی پیشہ ترک کر دیا اور نو تشکیل شدہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کرلی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے خانگی زندگی کی تفکرات سے نجات پانے کی غرض سے یہ نئی ملازمت اختیار کرلی کیونکہ اپنی بیوی سوسن سے اس کے تعلقات خوشگوار نہ تھے۔

کمپنی کے چوتھے بحری سفر میں جورڈن نے شرکت کی۔ سینٹ اگسٹائن خلیج کے جانے کے لئے وہ رفیع سیسح (ASCENSION) میں بحری سفر پر روانہ ہوا۔ اس کا بحری جہاز اول وچ سے ۲۴ مارچ ۱۶۰۸ء کو روانہ ہوا اور یونین (نامی جہاز) کے ساتھ خلیج ٹیبل میں واقع کیپ بندرگاہ میں رکا۔ یہاں انھیں دو ماہ ٹھہرنا پڑا۔ ۱۹ ستمبر کو وہ دوبارہ روانہ ہوئے۔ تند ہواؤں کی وجہ سے اس کا جہاز، یونین نامی جہاز سے الگ ہوگیا۔ جس کا پتہ دوسرے دن شام کو ملا۔ ۷ اپریل ۱۶۰۹ء کو وہ جہاز عدن پہنچا۔ اس بندرگاہ میں آنے والا یہ پہلا انگریزی جہاز تھا۔ ۲۶ جولائی کو وہ مشرق کے لئے موچارڈ سے روانہ ہوا۔

(باقی آئندہ)

تبصرہ

کتاب کا نام: دین اسلام گورو نانک جی کی نظر میں (بابا نانک صاحب کی اسلامی تبلیغ)۔

تالیف : جناب عباد اللہ گیانی

مرتبہ : جناب ایس۔ ایم شریف قریشی۔ ایم۔ اے۔ ایم لٹ (دہلی)

صفحات : ۱۲۲ - خوشنما ٹائیٹل

قیمت : ۱۵ / روپیہ

باہتمام : جناب منشی نیاز الدین

ناشر و ملنے کا پتہ: کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶

سکھوں کے تمام ثقہ و معتبر عالموں اور سکھ مذہب کے بیشتر صحیفوں، کتابوں، چارٹ و رسالوں اور تحوں کا مطالعہ کرنے کے بعد مولف نے گورو نانک جی کے خیالات و رجحانات کا جائزہ بڑی ہی چھان بین اور عرق ریزی کے ساتھ لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سکھ مذہب کے بانی بابا گورو نانک جی کی تمام تعلیمات اسلام مذہب کی مرہونِ منت ہے۔ انہوں نے جس طرح قدم قدم پر اسلامی تعلیمات کو مثالی ور انسانیت کی فلاح و بہتری کے لئے بتا کر اس کی پیروی و تقلید کے لئے بنی نوع انسانی کو ملتفت کرنے کی جو نیک کوشش کی ہے اس کے پیشِ نظر یہ حیرت و استعجاب ہی کی بات ہے کہ بابا گورو نانک جی دائرۂ اسلام سے باہر کیسے رہ گئے۔ جیسا کہ ان کے عربی اشعار میں سے ایک شعر کا اردو مفہوم ہے: "خدائے ذوالعرش کا شکر ہے کہ میں مومن ہوں" (کتاب دین اسلام صفحہ ۲۲) اور ہندو مفکر لالہ کنہیا لال جی کے بقول: "جب گورو جی فوت ہوئے تھے تو اس وقت مسلمانوں نے آپ کے بارے میں یہ کہا تھا: یہ فقیر خدا پرست ہے اقوال اس کے مطابق آیۃ قرآن و حدیث کے ہیں" (صفحہ ۵۵) ایک جگہ کتاب مذکورہ کے صفحہ ۱ پر سکھ عالم ڈاکٹر ترلوچن سنگھ کی یہ تحریر درج ہے: "جب کوئی مسلمان بچہ نانک جی سے ملتا تو وہ کہتا اللہ اکبر" گورو جی پورے دس سال تک شیخ فرید ثانیؒ سے مل کر اعلائے کلمۃ اللہ کرتے رہے تھے (صفحہ ۱۸) مکہ (معظمہ) جانے سے قبل گورو جی نے حاجی، پیروں والے نیلے کپڑے پہنے ہاتھ میں عصا لیا اور بغل میں کتاب (قرآن شریف)

رکھی (صفحہ ۱۹) گورونانک جی نے مسلمان کی تعریف میں یہ بات بھی بیان کی ہے کہ " وہ شریعت کا پابند ہوتا ہے۔ اور شریعت پر عمل کرتے کرتے سراپا شریعت بن جاتا ہے اس کا ہر قول و فعل اپنے رب کی مرضی کے مطابق ہوجاتا ہے (صفحہ ۱۱۸) گوروگرنتھ صاحب میں مسلمان کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں مذکور ہے۔ یعنی مسلمان رحمدل ہوتا ہے وہ اپنے دل کی تمام میل کچیل اور کدورت دور کر دیتا ہے وہ پھول اور ریشم کی مانند پاک اور صاف ہوتا ہے کسی قسم کی غلاظت اس کے قریب نہیں آتی۔ (صفحہ ۱۲۱) اور اس کتاب یعنی دین اسلام گورو نانک کی نظر میں کے صفحہ ۱۲۲ پر ایک سکھ عالم کی یہ تحریر مرقوم ہے :" اگر اسلام کا مطلب خدا کی رضا کے سامنے جھکنا ہے تو گورو نانک جی سچے مسلمان تھے۔ اور کتاب مذکورہ کے صفحہ ۴۴ تا صفحہ ۵۵ میں گورو نانک جی کے کلام میں قرآن مجید کی آیتوں کی تشریح کی مکمل جھلک ملتی ہے اور صفحہ ۶۶ میں گورو نانک جی کا فرشتوں کے سلسلے میں بیان بھی مرقوم ہے اسرافیل، جبرائیل، میکائیل اور عزرائیل چار فرشتے ہیں اور یہی چار موکل کہلاتے ہیں۔ اور پھر گورو نانک کا ارشاد ہے :" خدا تعالیٰ کے فرشتوں کی تعداد گنی نہیں جا سکتی ہے وہ بے شمار ہیں (صفحہ ۶۷) اس کے علاوہ گورو نانک جی نے اسلام کے پانچ ارکان ایمان، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج پر جس طرح زور دیا ہے وہ بھی زیر تبصرہ کتاب دین اسلام میں پوری تحقیق اور معتبر ذرائع و حوالوں سے درج ہے۔ حقیقت میں کتاب دین اسلام گورو نانک جی کی نظر میں بڑی ہی دلچسپ اور دینی اسلامی و تاریخی لحاظ سے پُر از معلومات ہے جو بس پڑھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ جناب ایس۔ ایم شریف قریشی ایم۔ اے۔ ایم لٹ نے اس کتاب کو کہیں سے بھی ڈھونڈ نکال کر امرتب کر کے علمی اور مذہبی دنیا والوں کے ہاتھ میں ایک بڑی ہی قیمتی و نایاب دستاویز تھمادی ہے جس کے لئے وہ ہر طرح تحسین و ستائش اور قدردانی کے مستحق ہیں۔ اور شاباش ہے کتب خانہ انجمن ترقی اردو کے منشی نیاز الدین صاحب کو جنھوں نے خالص للّٰہیت کے جذبہ سے سرشار ہوکر بڑی جانفشانی کے ساتھ بہترین کتابت اور عمدہ آفسیٹ کی طباعت کے ساتھ یہ کتاب شائع کی ہے۔

واقعی کتاب دین اسلام بابا گورو نانک کی نظر میں اپنے اچھوتے موضوع کی اہمیت، افادیت اور ضرورت کی وجہ سے ہر مذہب کے اسکالر مورخ اور علمی حضرات کے کتب خانہ اور لائبریریوں کی ہاتھوں ہاتھ لئے جانے کی بھی مستحق ہے ـــ خوش نصیب ہیں وہ دینی اور تبلیغی حلقے جو اس کتاب کو اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ خرید کر اسے ہر طبقۂ خیال کے لوگوں تک پہنچانے کا ذریعہ بنیں گے۔

(م۔ س۔ ب)

برہان

جلد نمبر ۱۱۳	مارچ سنہ ۱۹۹۴ء مطابق شوال سنہ ۱۴۱۴ھ	شمارہ نمبر ۳

عمیدالرحمٰن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

"اسرائیل کے قبضہ والے شہر کی ایک مسجد میں ۵۰ فلسطینیوں کا قتل کر دیا جانا کئی لحاظ سے تشویش و فکر میں مبتلا کرنے والی خبر ہے۔ ایک مسجد میں جہاں لوگ بیٹھے نماز ادا کر رہے تھے ایک ہی شخص کے ذریعہ اتنا بڑا واقعہ کر دیا جانا جس میں ۵۰ جانیں تو گئیں ہی اس سے دوگنے سے زیادہ لوگ زخمی ہو گئے، بنا کسی پیشگی تیاری کے نہیں ہو سکتا ہے۔ قابل غور یہ ہے کہ جس درندہ کے ہاتھوں اتنا بھیانک قتل عام ہوا وہ نہ صرف ... ہے بلکہ امریکی آ بر جکا ہے. جس کے معنی یہ ہیں کہ بنا مقامی امداد و رضامندی اور سازش کے یہ خونِ ناحق ناممکن تھا۔"

مغربی قومیں مسلمانوں پر دہشت پسندی کا زور و شور سے الزام لگاتی ہیں لیکن کیا وہ ۲۵ فروری کو مسجد میں نماز پڑھ رہے بے گناہ لوگوں پر اسطرح اندھادھند گولیاں برسا کر شہید کرنے کے واقعہ کو کیا کہیں گی. کیا وہ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں گی کہ اسلام مذہب کے ماننے والوں کے خلاف وہ کس طرح ایک جٹ ہو کر دھاوا بولے ہوئے ہیں۔ اور ڈپلومیسی و تل ابیب ہر لحاظ سے دور ہوتے ہوئے بھی صرف ایک بات یعنی اسلام دشمنی میں ایک دوسرے سے گھی شکر ہو رہے ہیں۔ میڈیا کے ذرائع سے مسلمانوں کو ایک وحشی قوم ثابت کیا جا رہا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مغربی اقوام کے بعض سربراہ ظلم و ناانصافی کا خود جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ عراق کو صرف اس جرم پر کہ اس نے اپنے ایک پڑوسی ملک کویت کو اپنے ملک میں ملانے کی جسارت کر ڈالی. عراق کو تہس نہس کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت لگا دی ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۴ء آ گیا ہے مگر عراق کو کسی طرح معاف نہیں کیا جا رہا ہے اس پر طرح طرح کی پابندیاں عائد ہیں وہاں کے کروڑوں باشندے ضروریاتِ زندگی کیلئے ترس رہے ہیں بچوں کو دودھ و دوائیاں تک میسر نہیں ہیں ان کی روزی ان سے جبراً چھین لی گئی ہے۔ دوسری طرف بوسنیا کے بے گناہ مسلمانوں پر سربوں کے وحشیانہ ظلم و ستم اور قتل و غارت گری کا ان پر ابھی تک کوئی اثر نہیں ہے صرف زبانی جمع خرچ سے آگے کچھ نہیں ہے ان کے پاس انسانیت یا انسانیت کی بقا و حفاظت کے لئے بوسنیا کے مسلمان سردیوں میں کھلے آسمان میں، گرمیوں میں سخت دھوپ و شدید لو اور برسات میں طوفانی ہواؤں اور تیز بارش میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں پیٹ بھرنے تک کو وہ دانہ دانہ سے محتاج ہیں۔ حد ہو گئی ظلم و ستم کی. کیا مغربی اقوام کو انسانیت کا استحصال ہندوستان میں اتنی دور سے بیٹھ کر دکھائی دے جاتا مگر خود ان کے قریب جو واقعی انسانیت کا استحصال ہو رہا ہے وہ بالکل نہیں نظر آتا. اس سے زیادہ

شرم [illegible] بے غیرتی کی بات اور کیا ہو گی۔ کیا مغربی اقوام اپنے اسی "انصاف" و "انسانیت" پر اتراتی ہیں۔ ظلم و ستم [illegible] بھی کسی کا رہا نہیں ہے اور بڑی طاقت تو صرف ایک ہی ہے اور وہ اللہ رب العزت ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ "کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ وَّ یَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ۔

دنیا میں جو بھی طاقت غرور و تکبر میں بدمست ہو کر انسانیت پر ظلم و ستم اور ناانصافی کو روا رکھے گی وہ ایک دن اسی طرح خاک میں مل کر رہے گی۔ جیسے کہ اس سے پہلے فرعون و نمرود کا حشر ہوا اور ابھی کل کی بات ہے جسے دنیا نے ہٹلر اور کمیونزم کے دیو ہیکل ملک سوویت روس کی صورت میں غارت ریزہ ریزہ ہوتے ہوئے دیکھا۔

یہاں ہم اس موقع پر بابری مسجد کے سانحہ پر ایک شاعر نے جو پُرسوز اشعار کہے تھے اور جو ماہانہ "شمع" نئی دہلی فروری ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئے ہیں اس میں سے چند اشعار چن کر یہاں نقل کر رہے ہیں جو بابری مسجد کے حادثہ پر جہاں چسپاں ہوتے ہیں وہیں یہ اشعار اسرائیلی و امریکی جارحیت اور ۲۵ فروری ۱۹۹۴ء کو اسرائیل کے زیر تسلط شہر میں واقع ابراہیم مسجد میں نمازیوں پر اندھادھند گولیاں چلانے پر بھی صادق آتے ہیں۔ ملاحظہ کریں۔

وہ کیسا دن تھا جب اک خون میں ڈوبا ہوا لمحہ ... اتر کر آسمانوں سے زمیں کی سمت آیا تھا

ہر اک سو خون کی ہولی ہر اک سو بربریت تھی

جو وادی میں تھے وہ تو خود اشارہ کرنے آئے تھے ... عمارت کی تباہی کا نظارہ کرنے آئے تھے

نہیں تو کون چھو سکتا تھا کس میں اتنی جرأت تھی

دلوں میں غیرتِ قومی کے سرچشمے اُبل آئے ... ہتھیلی پہ لئے سر لوگ سڑکوں پر نکل آئے

جگانے کے لئے گویا یہی رب کی مشیت تھی

وہ کس جن کے سینے گولیوں سے ہو گئے چھلنی ... اب ان کے خون ناحق کا ہر اک قطرہ صدا دیگا

عمارت ڈھانے والو! ایک دن ایسا بھی آنا ہے ... کہ جب یہ خون ناحق تم کو مٹی میں ملا دے گا

چاک خلافت کے بعد سے مسلم قوم کس قدر مشکلات و پریشانیوں سے گزر رہی ہے اسی مقصد سے عیار و مکار انگریز سامراج نے ۷۰ سال پہلے منصب خلافت کو قوم مسلم ہی میں ایک غداروں کے ذریعہ ختم کروا ڈالا تھا۔ اس کے بعد چاروں طرف سے ظلم و ستم کا بازار گرم ہے۔ ۱۹۸۵ء میں عید کی نماز پڑھتے

سے ہندستان کے شہر مرادآباد میں مسلمانوں پر پولیس فائرنگ میں نہ معلوم کتنے مسلمان شہید ہوئے جن کی تعداد اس وقت کے وزیر اعلیٰ یوپی اور ۱۹۸۹ء و ۱۹۹۰ء کے وزیر اعظم ہند جناب وی پی سنگھ ہی بتا سکتے ہیں اور نہ ہی کسی اور ذریعہ سے تعداد کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ افغانستان میں ۱۹۷۹ء سے کمیونسٹ حکومت نے ہزاروں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور جب سے متواتر کمیونسٹ فوج نے وہاں کی اکثریتی مسلم آبادی کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنائے رکھا اور جب روس ختم ہوا تو مغربی طاقتوں کی سازش کی بدولت بھی وہاں خود مسلمان، مسلمان سے لڑ رہا ہے۔ اسی طرح ایران و عراق میں نو سال تک جنگ چلی جس میں دونوں طرف کے لاکھوں مسلمان جان و مال دونوں سے تباہ و برباد غارت و ہلاک ہو کر رہے۔ اس سے بڑھ کر کامیاب سازشیں اور کیا ہوں گی۔ یہ تو عالم الغیب ہی جانتا ہے۔ لیکن اب عالم اسلام کے لئے سوچنے کی فکر یہ ہے کہ وہ کب تک اس طرح کی بربادیوں اور سازشوں کا سامنا کرتے رہیں گے؟ کیا وہ تمام دنیا میں مسلم قوم پر ظلم و ستم، اسلام مذہب کے خلاف ریگن و تل ابیب کی دوستی کے بعد انکی ریشہ دوانیوں کو سمجھنے کی کوشش اب بھی نہیں کریں گے۔

ہمارے خیال میں تمام عالم کے مسلمانوں کی پریشانیوں بربادیوں کے تدارک اور مسلم ملکوں کی فلاح و ترقی اور بقاء کے لئے واحد ذریعہ صرف ایک ہی ہے کہ منصب خلافت کو دوبارہ زندہ و قائم کیا جائے۔ جب تک تمام عالم کے مسلمان کے لئے ایک آواز نہیں ہوگی اس وقت تک عالم اسلام کے اتحاد اور اس کی ترقی و بقاء کا خیال صرف خام خیال ہی ہوگا۔

طوطی نامہ

ڈاکٹر صفیہ جارس انیس، ریسرچ ایسوشیٹ شعبۂ فارسی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

خواجہ ضیاء الدین نخشبی اپنے عہد کے ایک بزرگ صوفی اور عالم شخصیت تھے۔ وہ بمقام نخشب (ایران) میں پیدا ہوئے۔ لیکن منگولوں کے حملوں کے سبب وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو کر ہندوستان کا رخ کیا۔ یہاں آکر پرسکون اور روح پرور مقام بدایوں میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی۔ اپنی تمام زندگی اسی شہر کے ایک گوشہ میں علمی کاموں اور عبادت و ریاضت میں مشغول رہ کر گزار دی۔ انہوں نے شیخ فرید قدس اللہ سرہ العزیز نبیرہ سلطان التارکین شیخ حمید الدین ناگوری سے مریدی کا شرف حاصل کیا اور مولانا شہاب الدین مہمرہ کے شاگرد بھی ہوئے۔ انکا انتقال بدایوں میں ۷۵۱ھ میں ہوا اور اسی شہر میں اپنے استاد شہاب الدین مہمرہ کے مزار کے قریب مدفون ہوئے۔ ان کی کئی تصانیف ہیں جن کے نام حسب ذیل ہیں!

طوطی نامہ، گلریز، سلک السلوک، جزئیات و کلیات، شرح دعا سریانی، عشرۂ مبشرہ لذت النساء۔

ضیاء الدین نخشبی بدایونی گمنامی کے پردے میں غائب ہو جاتے اگر ان کی عالمانہ کتابیں اور دلچسپ تصانیف دستیاب نہ ہوتیں۔ طوطی نامہ وہ معرکۃ الآرا تصنیف ہے جس نے ان کی شہرت کو دوام بخشا اور آج تک یہ تصنیف مقبولیت کا درجہ حاصل کئے ہوئے ہے۔ اس کی شہرت و مقبولیت کے ثبوت میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ دنیا کی شاید ہی کوئی لائبریری ایسی ہو جس میں طوطی نامہ کا کوئی مخطوطہ موجود نہ ہو۔ مشہور کتب خانوں میں تو اس کے کئی قلمی مخطوطے موجود ہیں جیسے انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ میں بارہ قلمی نسخے ہیں جن کا نمبر ۷۴۳ تا ۷۵۴ ہے برٹش میوزیم کیٹلاگ میں آٹھ سے زیادہ قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے۔ بوڈلین لائبریری کیٹلاگ میں ۵ قلمی نسخے ۴۴۴ تا ۴۴۸ نمبروں پر موجود ہیں۔ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں اکیس سے زیادہ نسخے دستیاب ہیں۔ فہرست

ترکی نسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان میں بھی کئی مخطوطوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ کیمبرج یونیورسٹی کی لائبریری
بں طوطی نامہ کے دو قلمی مخطوطوں کا ذکر ہے۔ بے تھے زنکر [illegible] نے اپنی
[illegible] میں صفحہ ۵۱ پر ۷۰۶ تا ۷۱۰ نمبروں پر طوطی نامہ کے مخطوطوں کا ذکر کیا ہے
[illegible] میں بھی ایک نسخہ موجود ہے۔ العرض اس شاہکار
تصنیف کے مخطوطے کثرت سے دنیا کی مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں لیکن بڑے تعجب کی بات
ہے کہ یہ کتاب اب تک غیر مطبوعہ ہے۔ ڈاکٹر محمد باقر نے ۱۹۹۵ء میں اس کتاب کے امرتسر سے طباعت
کے بارے میں لکھا ہے [1] لیکن اور کوئی تفصیل نہیں دی۔ نہ ہی کسی اور تذکرہ نگار نے اس کے
مطبوعہ ہونے کے بارے میں لکھا ہے؛

طوطی نامہ کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کے تراجم
فارسی زبان اور ہندوستان کی مختلف زبانوں کے علاوہ یورپ کی زبانوں میں بھی ہوئے ہیں۔
شہنشاہ اکبر کی فرمائش پر ابو الفضل نے　دیں صدی کے وسط میں سلیس فارسی میں اس کا خلاصہ
کیا۔ محمد قادری نے ۱۰۹۳ھ میں ضیاء الدین نخشبی کی باون کہانیوں میں سے پینتس کا انتخاب کر کے
شرفا کی روزمرہ زبان میں لکھا [2]۔ غواصی نے ۱۰۴۹ھ میں دکھنی زبان میں اس کا ترجمہ کیا۔ اس نے
پینتالیس کہانیوں کا انتخاب کر کے نفس مضمون میں بھی کچھ تبدیلی کی [3]۔ طوطی نامہ کا ایک مخطوطہ
دکھنی زبان میں ترجمہ کیا ہوا ۱۱۴۲ھ کا کتاب خانہ جامعہ عثمانیہ میں موجود ہے لیکن اس میں مترجم
کا نام مذکور نہیں۔ اردو زبان میں سید حیدر بخش حیدری نے ۱۲۱۶ھ میں "طوطا کہانی" کے نام
سے اس کا ترجمہ کیا [4]۔ چندی چرن نے ۱۸۰۶ء میں حیدری کی طوطا کہانی کا ترجمہ "طوطا اتہاس"
کے نام سے کیا۔ [5] سی منشی نامی شخص نے بھی بنگالی زبان میں طوطی نامہ کو منتقل کیا۔

یورپ کی زبانوں میں بھی کئی ترجمے ہوئے ہیں۔ بی جیرالنس نے ضیاء الدین نخشبی کے طوطی نامہ
کی بارہ کہانیوں کا ترجمہ انگریزی زبان میں ۱۷۹۲ء میں کیا جو لندن سے شائع ہوا [6]۔ گلاڈوین نے
فارسی متن کے ساتھ انگریزی زبان کا ترجمہ ۱۸۰۱ء میں کیا جو کلکتہ سے طبع ہو کر شائع ہوا [7]۔ ترکی
زبان میں سلطان سلیم اعظم (۹۴۶ھ تا ۹۷۴ھ) کے عہد میں شیخ عبداللہ آفندی نے منتقل کیا
جو ۱۲۵۲ھ میں بولاق سے اور ۱۳۰۱ھ میں قسطنطنیہ سے طبع ہوا۔ اس ترکی ترجمہ کو جارج راسین

نے جرمن زبان میں منتقل کیا جو ۱۸۵۸ء میں لیپزگ میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ جرمنی زبان میں ہی پروفیسر ایکن نے ۱۸۲۲ء میں طوطی نامہ کو منتقل کیا۔ ایران میں بہت سے افسانے جو چہل طوطی کے نام سے رائج ہیں سب طوطی نامہ نخشبی سے ماخوذ ہیں۔ ای برتھلس نے روسی زبان میں طوطی نامہ کا ترجمہ کیا اور فرانسیسی زبان میں بھی اس کا مکمل ترجمہ موجود ہے جو شائع نہیں ہوا ہے۔ انگریزی زبان میں طوطی نامہ کا مکمل ترجمہ محمد اے سماسا نے کیا جو ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا اس کی مطبوعہ کتاب مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ الغرض طوطی نامہ کا ہندوستان اور یورپ کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا جانا اس کی غیر معمولی مقبولیت کا بیّن ثبوت ہے۔

طوطی نامہ کا ماخذ سنسکرت زبان میں ایک مشہور داستانی کتاب "سکا سپ تتی" کے نام سے ملتی ہے جس کا مطلب ہے کہ ایک طوطے کی زبان سے کہی گئی ستر کہانیاں جو ضیاء الدین نخشبی کی طوطی نامہ کا ماخذ ہے۔ سکا سپ تتی کی بہت سی داستانیں پنچ تنترا اور سندبادنامہ سے ماخوذ ہیں۔ یہ دونوں کتابیں سنسکرت زبان کی قدیم ادبی داستانوں میں سے ہیں۔ پنچ تنترا پانچ حصوں میں ہے اور ایسی داستانوں اور کہانیوں کا مجموعہ ہے جو شہزادوں کو زندگی کی بنیادی باتوں، سیاست کے داؤں پیچ اور اخلاقی طور طریقوں کا درس دینے کے لئے لکھی گئی تھیں حکیم برزویہ نے جو نوشیرواں بادشاہ کا درباری طبیب تھا۔ پنچ تنترا کتاب کا پہلوی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ عبداللہ ابن مقفع نے اس کو عربی زبان میں منتقل کیا۔ اور کلیلہ و دمنہ نام رکھا۔ اس کتاب کے تراجم اب دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ دوسری کتاب سندبادنامہ ہے۔ یہ پہلوی زبان میں چھٹی صدی عیسوی میں ترجمہ کی گئی اس کے بعد سیریائی، عربی، فارسی، ترکی اور یونانی زبانوں میں بھی ترجمے ہوئے۔ سندبادنامہ یورپین کتابوں میں SEVEN WISE MASTERS کے نام سے مشہور رہے سب سے قدیم سکا سپ تتی چھٹی صدی عیسوی میں لکھی گئی جس کے مصنف کا نام نامعلوم ہے۔ سکا سپ تتی تین مصنفوں کی ہیں اور تینوں کتابیں سنسکرت زبان میں ہیں ایک دیودتّا ([illegible]) اور دوسری اس سے آسان سنسکرت زبان میں جین ([illegible]) کی ہے اور تیسری جو ان دونوں سے زیادہ مشہور ہے سنتا منی بھٹّا ([illegible]) کی ہے۔[۱۰] جو بارہویں صدی کے آخری دور میں لکھی گئی ہے۔ ضیاء الدین نخشبی نے طوطی نامہ میں سکا سپ تتی کی تیرہ

انیوں یعنی تیسری، پانچویں، پندرہویں، اکیسویں، بائیسویں، چھبیسویں، تیسویں، اڑتیسویں تالیسویں، اکتالیسویں، تینتالیسویں، انچاسویں اور ترسٹھویں کہانیوں کو طوطی نامہ کی تو کہانیوں یعنی تیسری، پانچویں، نویں، دسویں، سترہویں، انیسویں، بائیسویں، تیئیسویں اور تیسویں داستانوں میں سمادیا ہے لیکن کردار اور واقعات کو اتنا بدل دیا ہے کہ وہ سکاسپ تتی کا ترجمہ نہیں لگتیں بلکہ ان کی اپنی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ بنیادی کردار اور واقعات کو برقرار رکھا گیا ہے۔ البتہ ناموں کا فرق واضح ہے مثلاً مالدار تاجر کا نام سکاسپ تتی میں ہری دتا (हरि दत्त) ہے طوطی نامہ میں "مبارک" ہے لڑکے کا نام سکاسپ تتی میں مدن ونود (मदन विनोद) ہے لیکن طوطی نامہ میں "میمون" ہے۔ اس کی بیوی کا نام (प्रभावती) سکاسپ تتی میں ہے طوطی نامہ میں "خجستہ" ہے۔ واقعات میں بھی تبدیلی ہے جیسے سکاسپ تتی میں ہے کہ ایک براہمن جس کا نام تری وکرم (त्रिविक्रम) ہے وہ ہری دتا کا دوست ہے۔ وہ ایک طوطا اور مینا ہری دتا کے پاس لایا۔ لیکن طوطی نامہ میں ہے کہ میمون نے خود بازار سے طوطا خریدا تھا اور پھر طوطا کی تنہائی دور کرنے کے لئے مینا خریدی۔ سکاسپ تتی میں ہے کہ مینا اڑ گئی تھی لیکن طوطی نامہ میں ہے خجستہ نے اسے زمین پر پٹخ کر مار ڈالا تھا۔ سکاسپ تتی میں ہے کہ مدن نے اپنی بیوی کی غلطی کو معاف کر دیا لیکن طوطی نامہ میں ہے کہ میمون نے اسے قتل کر دیا تھا۔ طوطے کی بیان کردہ داستانوں میں بھی کافی تبدیلیاں بروئے کار لائی گئی ہیں۔ جس کی بنا پر یہ کتاب سکاسپ تتی سے مختلف معلوم ہوتی ہے۔ ضیاء الدین نخشبی کے طوطی نامہ کے مقدمہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو سکاسپ تتی کا فارسی ترجمہ کسی نے دیکر اسے آسان زبان میں لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ وہ رقمطراز ہیں :

"بزرگی با بندہ گفت درین وقت کتابی مشتمل بر پنجاہ ودو حکایت بزرگی و زعبارتی بعبارتی بردہ است واز اصطلاح ہندی بزبان پارسی آوردہ است اما شہب مقال در مضمار اطالت دوانیدہ است وسخن را در درازی باقصی الغایت رسانیدہ و قاعدہ ترتیب را ذوقی و قانون ترکیب را شوقی اصلاً مراعات نکردہ است و آغاز داستان و انجام حکایت را بکلی از جای برداشتہ فروگذاشتہ اصلاً

بلاغت او را معطل داشته چنانکه قاری او از مقصود راحت بازمی یابد و سامع را مقصود استراحت کم می شود اگر تو این اصل را که اصول کتب ہند است بعبارتی معہ جزو استعارتی مسلسل و ترتیبی لایق و ترکیبی فایق بنویسی بر قاری و سامع او منت بیشمار ثابت کرده باشی۔" (بیت)

اعلام کار افراشتن پس تخم کاری کاشتن
این نیست کاری دیگران اینکار تست اینکار تست

حکم آن بزرگ راکہ دل محکوم او انقیاد کرده شد و امر او راکہ جان مامور اوست پرامتثال نموده آید اگرچہ در بلاغت کلام آنست کہ کلام مطول را کوتاه کند و یا سخن کوتاه را مطول گرداند اما بنده سخن نہ ہمچنان کوتاه متکلف و مطول نبشتہ کہ خواص آنرا بخوانند و نہ آنچنان بی تکلف و موجز در تحریر آورده کہ عوام نشنوند بلکہ امری کہ خیر الامور اوسطہا بود اختیار کرده است۔ (رباعی)

نخشبی مذہب میانہ گزین
اندرین خود اشارت نبویست
کارہای میانہ کاری دان امر اسلام ہم میانہ رویست

پنجاه و دو افسانہ بعبارت و استعارت بود امثال و بظاہر جدید نبشتہ شد حکایتی کہ بی ضبط و ربط بود آنرا مربوط و مضبوط کرده شد و حکایت چندی کہ بی سجع و بی ذوق بودند بدل آن حکایت دیگر تحریر افتاد و این عروس فی فہ و خاتون ظرایف را در نظر شاہان سخن برین جلوه دادند۔ (بیت)

از بسکہ تیره چو شب کرد حوادث
پنجاه و دو افسانہ نبشتیم درین شب"۔ [۱۲]

اس مقدمہ سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ سنسکرت زبان سے طوطی نامہ کا ادق فارسی ترجمہ موجود تھا جو درحقیقت ضیاء الدین نخشبی کے طوطی نامہ کا ماخذ ہے۔ اس کے مصنف اور زمانۂ تصنیف کے بارے میں نخشبی نے کچھ نہیں لکھا۔ وہ قدیم ترین ترجمہ اب تک ناپید سمجھا جاتا

ہے لیکن ابھی حال ہی میں محمد اے سمسار (MOHAMMADA.SIMSAR) نے تہران لائبریری کے ایک قدیم مخطوطہ کا ذکر کیا ہے جس کا نام "جواہر الاسمار" ہے اور مصنف کا نام عماد بن محمد ہے۔ اس کے مقدمہ میں لکھا ہوا ہے کہ ان کے (یعنی مصنف کے) دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ ہندوستان کی کسی داستانی کتاب کا ترجمہ فارسی میں کیا جائے چنانچہ انہوں نے متعدد ہندوستانی کہانیوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا لیکن انہیں کوئی کتاب پسند نہ آئی آخر کافی تلاش کے بعد انکو ایک کتاب ملی جس میں بہتر کہانیاں ایک طوطے کی زبانی بیان کی گئی تھیں۔ یہ کتاب انہیں پسند آئی اور تمام کتاب کا ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا لیکن جب اس کا مطالعہ کیا تو انہوں نے اس کی کچھ داستانیں کلیلہ و دمنہ اور سندبادنامہ سے ماخوذ پائیں۔ چونکہ دونوں مذکورہ کتابوں کی داستانیں ایران میں زبان زد عام و خاص تھیں اس لئے ان داستانوں کو ترک کر دیا۔ کچھ داستانیں اشراف کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھیں چنانچہ انہیں بھی حذف کر دیا اور اس طرح اس کتاب کی ۵۲ داستانوں کا انتخاب کر کے فارسی میں ترجمہ کیا۔" عماد بن محمد نے اس ہندوستانی زبان میں تحریر کردہ کتاب کا نام، مصنف کا نام اور سنِ تالیف کی بابت کچھ نہیں لکھا۔ نہ ہی جواہر الاسمار کا سنِ تالیف تحریر کیا ہے البتہ وہ ایک اور مقام پر رقمطراز ہے کہ اس نے اپنی کتاب کو علاؤالدین محمد خلجی کی لائبریری کے لئے عطیہ کے طور پر پیش کی تھی۔ علاؤالدین محمد خلجی کا زمانہ حکمرانی ۱۲۹۶ء سے ۱۳۱۵ء تک ہے۔ اس بات سے محمد اے سمسار نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ گمشدہ کتاب جو نخشبی کے طوطی نامہ کا ماخذ بنی تھی یہی ہے یہ اندازہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اسمیں بھی طوطی نامہ نخشبی کی طرح ۵۲ کہانیاں ہیں جو طوطے کی زبانی بیان کی گئی ہیں مالدار شخص کا نام سعد ہے اور بیٹے کا نام سعید ہے جسکو بدل کر ضیاءالدین نخشبی نے مبارک اور میمون کر دیا۔ سعید کی بیوی کا نام ماہ شکر ہے جس کو نخشبی نے خجستہ لکھا ہے۔ تمام کردار اور واقعات میں بھی کافی مماثلت و مشابہت ہے۔ اسی لئے جب شمس الدین آلِ محمد نے جواہر الاسمار کو ۱۹۷۳ء میں ایڈٹ کروایا تو اس کتاب کی داستانوں کو طوطی نامہ نخشبی سے مشابہت کی بنا پر اس کا نام جواہر الاسمار سے بدل کر طوطی نامہ رکھ دیا[13]

ضیاءالدین نخشبی نے ۱۳۳۰ء میں طوطی نامہ کو لکھ کر پایۂ تکمیل تک پہنچایا[14] اس کا آغاز اس طرح کیا ہے :-

" مناجات بہ حضرت خالق الثواب فی غشئہ او رزاق وخوش وطیور نعیم عمیم اوست خلاق لمت ونور عکیم وعمیم او تقدس وتعالیٰ من الصفات المسلمین وتنزہ من شماتت المشرکین.

نظم) خدایا اہل دل را ذوق دل دہ ضیای تخشبی را شوق دل دہ
گلم از آب رحمت تازہ گردان دلم از یاد قربت تازہ گردان
نصیبم از جہان سوری دگر کن درونم روشن از نوری دگر کن
سری دہ کز سر بیگانہ باشد دل کو با غمت ہم خانہ باشد" ؎۵

مناجات لکھنے کے بعد ایک نعت بھی لکھی اور اس کے بعد ایک مقدمہ لکھا جس میں اس داستان کو لکھنے کا سبب بیان کرنے کے بعد اس کا خلاصہ بھی لکھا۔ جس کو انہیں کے الفاظ میں مندرج کیا جاتا ہے

" وحاصل این پنجاہ ودو افسانہ آنست کہ بازرگان زادہ درخانہ طوطی وشارک گویا داشت وقتی اورا اتفاق سفری شد وقت رفتن باکدبانو خانہ گفت در غیبت من ہر کاری کہ ترا پیش آید وہر ہمی کہ تو متعرض کرد باید کہ بی مشورت ایشا درمرغ درآں کار سعی نکنی د بی رخصت ایشان جانوران دران اقدام ننمایی الغرض در مدت غیبت این بازرگان زن اورا دل بعشق جوانی مبتلا شد وجان برنای معشوق آن مقید گشتہ شبی برسبیل مشورت برشارک رفت کہ مرا چنیں کاری پیش آمدہ است وچنیں نہمی متعرض شدہ می خواہم کہ شبی در وثاق محبوب روم ونفس منطمش را بزلال وصال او سیراب گردانم تو درین کار چہ مصلحت بینی و درین امر چہ نصیحت میدہی. شارک ابواب مواعظ ونصایح بکشاد او را بطریق نیک خواہان نصیحت کردن نمود اورا برگرفت وبرزمین زد پس خجستہ ہمچنیں غضب آلودہ برطوطی رفت و ہمان حال باز نمود طوطی با خود گفت اگر طریق نصیحت شارک خواہم داشت ہمان خواہم دید کہ شارک دید اگر رخصت خواہم داد او بہ بطلت وضلالت خواہد افتاد ومرا چیزی باید کرد کہ ہم جان من از ورطۂ ہلاکت خلاص یابد وہم نفس او از فسق وفجور مصئون ماند حالی از نیک خواہان او با بد نمود حکایتی کہ موافق طبع او برگرفت آن حکایت تا صبح میداشت ورفتن اورا توقف می افتاد ہم چنیں تا پنجاہ ودو شب بگذشت تا آنکہ بازرگانی از سفر برسید طوطی صورتحال باز نمود بازرگان بر فطانت ومتانت او آفرینہا کرد وآن زن را بکشت وبعد از آں نام زن نگرفت تا آنکہ حیی وقیوم بود دریں طریق خود را نہ پذیرفت.

زن بد ای برادر مرده بہتر ۔ غمی کاری زنان ناخورده بہتر [16]

اس کے بعد اصل داستان کا آغاز کیا اور پھر طوطی کی زبانی باون کہانیاں بیان کیں۔ جس میں بیشتر زنوں کی بے وفائیوں کے قصے ہیں۔ چونکہ طوطی حیلہ اور بہانہ سے خجستہ کو جانے نہیں دیتا اس لئے عنوانات عاماتہ حیلہ شب اول، حیلہ شب دوم . . . تا حیلہ شب پنجاہ و دویم کا عنوان بھی قائم کیا ہے۔

اس کے طور پر چند عنوانات ملاحظہ ہوں:

"داستان میمون و خجستہ و سخن گفتن طوطی و صلاح دعا نبدن میان تاجر و زن" حیلہ شب اول"

"داستان، بادشاہ طبرستان و نیانی و فدا کردن پسر خود را پیش صورت حیات بادشاہ حیلہ شب دویم:"

"داستان زرگر و نجار و خیاط و زاہد دیگر چوب و مبتلا شدن ایشان بر آن صورت و تنظیم نمودن نہا پیش درخت حیلہ شب ششم"

"داستان شاہزادۂ ہفت و آفتی کہ از سبب کنیزک بدو رسیدہ بود و خلاص یافتن او حیلہ شب ہشتم:"

"داستان شاہ شام و آزاد کردن طوطی را و آوردن طوطی میوۂ حیات از چشمہ ظلمات حیلہ شب نہم"

"داستان امیرزادۂ اول و خریدن فال نیک و خلاص دادن غوک از مار و آزاد کردن ایشان حیلہ شب ہژدہم:"

اسی طرح ۵۲ عنوانات قائم کر کے مختلف داستانیں بیان فرمائیں اور ہر داستان میں خجستہ ہر شب تیار ہو کر اور خود کو زیور وں سے آراستہ کر کے طوطی سے اجازت طلب کرنے جاتی ہے لیکن طوطی بڑی خوبی سے اسے داستان میں الجھا لیتا ہے اور صبح تک داستان جاری رکھتا ہے اور خجستہ کو جانے سے باز رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر حیلہ شب ششم کی ابتدا، ملاحظہ ہو۔

"چوں زرگر افلاک زر خالص آفتاب را در بوتۂ مغرب کردند و نقرۂ ناب ماہ از کان مشرق بیرون آوردند خجستہ خود را چوں بت زریں بانواع گوہر پیراستہ بر طوطی رفت و گفت ای طبیب مطابق و ای بسبب موافق یرقان عشق دیدۂ وقت مرا زرد کرد و غلبۂ شوق باطنہ صحت مرا در درد افگندہ اگر ایں عقود را از تو انحلالی پدید نیاید از تو چہ کار آید و اگر ایں چرخ را از تو اندمالی حاصل نشود از تو چہ غرض بر آید

ودستی کہ دوستان را در وقت اندوہ دست نخواہی گرفت در اندوہ اولی و یاری کہ یار خود را در وقت اندوہ دست نخواہی گرفت در اندوہ اولی و یاری کہ یار خود را در وقت اندوہ و مصیبت یاری نخواہد داد در درد و در ماتم بہتر۔

(قطعہ)

نخشبی یار روز غم باید — ہر کس را ز کس بر آید کار
در ہمہ عمر خود چہ کار آید — اگر در روز غم نیاید کار

ای طوطی امشب مرا در رفتن دستوری دہ تا شب ہجر انرا از وصال محبوب صباحی وہم شام مرا از اتصال مطلوب صباحی بخشم۔ طوطی گفت من ترا ہم در اول شب دستوری دادہ بودم تو ظاہر خود را از چہ سبب در تاب بیداری و باطنہ خود را بچہ موجب در التہاب می افگنی و عاشق مسکین را برانچہ انتظار می فرمائی من مرغی ام زیرک و ندیم پیشہ و جانوری ام حکیم اندیشہ از حکایت و اسمار من چہ کم آید و از روایت و اخبار چہ اندک زاید اگر تو ہر شب ہم چنین بحکایت و کفایت من مشغول خواہی شد کہ ہر شب از کیسہ تو خواہد رفت روز وصال کی خواہی رسید تا روزگار شام کند تو شب وصال را چاشت کن و زود تر برو تا ق معشوق روا ما در گوشہ نہاد خجستہ پرسید آن چگونہ بود طوطی گفت چنین گویند در شہر میان زرگر و نجار محبت بود محبتی کہ چون ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس طرح طوطی داستان کا آغاز کر کے اس کا سلسلہ صبح تک جاری رکھتا ہے صبح ہو جانے پر خجستہ اپنے ارادے سے باز آجاتی ہے اور دوسری شب تیار ہو کر طوطی سے اجازت حاصل کرنے پہونچتی ہے اور طوطی پھر اسے کسی نئی داستان میں حیلہ کے ساتھ مشغول کر لیتا ہے اس طرح باون راتوں کی دلچسپ داستانوں کے مجموعہ کو طوطی نامہ میں جگہ دی گئی ہے۔ جو شیریں اور سادہ، ساتھ ہی مسجع فارسی میں لکھی گئی ہے ۔ اسمیں قرآنی آیات واحادیث اور اقوال بزرگان سے بھی استدلال کیا گیا ہے اور عربی و فارسی کے بہت سے ضرب الامثال سے کلام کو زینت بخشی ہے ۔ نمونے کے طور پر آغاز داستان کے چند جملے ملاحظہ ہوں ۔

" رواتِ اخبار و دہاتِ اسمار چنین گویند کہ در ایام بالیہ و روزگار حالیہ در شہری از شہرہای ہند بازرگانی بود مبارک نام دبا مال و منال و نعمت و حشمت او را نبود در تمنای " ربِّ لَا تَذَرْنِی فَرْدًا " شعار خود ساختہ بود و در ہوس فرزند " ربِّ ہَبْ لِی مِن لَّدُنْکَ وَلِیًّا " و ثار خود پرداختہ

او از فتح سعادت و اجابت صبح او بد مید و بشارت "اَنَا نُبَشِّرُکَ بِغُلَامٍ" بگوش وقت رسید در خانه او پسری آورد شد چگونه پسری که اشارت شده است به پسر۔

(بیت) گوئی بزمین ستاره آمد — یوسف به جہان دوبارہ آمد"[18]

طوطی نامہ میں ضیاء الدین نخشبی نے اپنے تین سو سے بھی زائد بر موقع رنگین اشعار اور قطعات سے کلام کو مزین فرمایا۔ بیشتر قطعات میں عرفانی اور متصوفانہ رنگ میں نصیحت کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ لیکن نصیحت خود کو مخاطب کرکے کی ہے جو پند و نصیحت کرنے کا ایک دلکش انداز ہے چند قطعات ملاحظہ ہوں!

نخشبی خیز با زمانہ بساز — ورنہ خود را نشانہ ساختن است
زیرکان جہان چنین گویند — زیرکی با زمانہ ساختن است

نخشبی دانش از ہمہ بہتر — کیست کو در حمایت و آتش
جسہ کہ حقیر تر باشد — بگذرد در حمایت دانش

نخشبی ہر کہ ہست در عالم — خواہ نیک است خواہ بد باشد
طبع او باکسی نیامیزد — میل ہر کس بجنس خود باشد

نخشبی مرد با درم نیکو — مفلسانرا درونست با صد تیچ
قیمتی خلق از درم باشد — آدمی بی درم نیرزد ہیچ

نخشبی از دام جہان شد قلب — گرگ ایام را تو چون برہ
سرہ با قلب ہر کہ آمیزد — ترک این قلب گیر کر سرہ

ختم شد

حوالہ جات

۱؎ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد سوم (۱۰۰۰-۱۵۲۶ء) از ڈاکٹر محمد اکبر وحید میرزا۔

۲؎ [illegible]

۳؎ طوطی نامہ از غواصی، مرتبہ میر سعادت علی رضوی ایم۔ اے ۱۳۵۷ھ

۴؎ [illegible] LIBRARY C[illegible] 144

۵؎ مقدمہ طوطی نامہ از غواصی، مرتبہ میر سعادت علی رضوی۔

۶؎ [illegible]

۷؎ ایضاً۔

۸؎ ایضاً۔

۹؎ "تاریخی مقالات" از پروفیسر خلیق احمد نظامی ص : ۹۸

۱۰؎ [illegible]

۱۱؎ [illegible] TALES OF [illegible] BY [illegible]

۱۲؎ مقدمہ طوطی نامہ۔ قلمی

۱۳؎ یہ کتاب شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سیمنار میں موجود ہے۔

۱۴؎ طوطی نامہ، قلمی

۱۵؎ ایضاً

۱۶؎ ایضاً

۱۷؎ ایضاً

۱۸؎ ایضاً

(۴) حسن وجمال اور پیار ومحبت علی محمود طٰہٰ کا شیوہ ہے۔

ایھا الشاعر اعتمد قیثارک　　وأعرف الآن منشداً اشعارک

واجعل الحب والجمال شعارک　　وادع ربا دعا الرجون وبارک

نزھا، وازدھی ببیلاد شاعر (۱)

(۵) اپنے قصیدہ "الملاح التائہ" میں ناامیدیوں کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے۔

ایھا الملاح قم واطوالشراعا　　لم نطوی لجۃ اللیل سراعاً

جدف الآن بنا فی ھینۃ　　وجھۃ الشاطی سیراً واتباعاً

فغداً یا صاحبی تاخذنا　　موجۃ الایام قذفاً واندفاعاً (۲)

(۶) اس نے پاکیزگی کو مستقل شئ قرار نہیں دیا۔ پاکیزگی کا وقت آنے پر وہ اس کا اظہار یوں کرتا ہے۔

ایھا الاحیاء غنوا واطربوا　　وانھبوا من غفلات الدھر ساعاً (۳)

(۷) قصیدہ "رجوع الھارب" میں اپنے ابتدائی عشق کو بیان کیا اور اس کے مقدمہ میں بتایا کہ دنیائے عشق آگ کا دریا ہونے کے باوجود بھی نہایت خوشگوار اور پرکیف ہے۔ عشقیہ داستان سرائی کے ساتھ اس میں اس نے اپنے ترددات واضطراب کو بھی پیش کیا۔

---

(۱) علی محمود طہ شعرو دراسۃ ص: ۶۳۲

(۲) ایضاً: ص ۶۵۹

(۳) ایضاً: ص: ۳۵۹

یا نار ما للنار بین جوانحی	یا نور أین النور مل جفونی
ذهب النهار بحیرتی و کآبتی	واتی المساء بأدمعی وشجونی
حتی الطبیعة اعرضت وتجاهلت	فتنکرت للهارب المسکین (۱)

(۲) "لیالی الملاح التائه" اس کا دوسرا دیوان ہے۔ یہ نہایت اُن بان کے ساتھ ۱۹۴۰ء میں منظرعام پر آیا۔ اس کے دو قصائد "الجندول" اور "سفینة العلاء" اس زمانے میں بہت مشہور ہوئے جنہیں عبدالوہاب نے گایا بھی تھا۔ (یہ اس عہد کا ایک عظیم گایک ہے) ان دونوں قصیدوں کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے تو ان میں وہ گہرائی اور گیرائی نہیں ملے گی جتنا کہ یہ مشہور ہوئے۔

اس کا قصیدہ "کرنفال فی فینسیا (Crinival in Venival) بھی بہترین قصیدہ ہے اس میں فینسیا کے عوام، مجالس، سڑکوں اور وہاں کی کشتیوں (الجندول) کا ذکر ہے۔ دوسرا اہم قصیدہ "کومو" ہے۔ "کومو" اٹلی کی ایک جگہ ہے۔ قصیدہ " خمرة نهر الرین " بھی ایک اچھا قصیدہ ہے۔ یہ نہر سوئٹزرلینڈ اور آسٹریلیا میں ہے، یہ تمام قصائد اپنی مثال آپ ہیں۔ ان میں یورپ کی پررونق جگہوں اور خوبصورت مغربی شہروں کا ذکر ہے۔

اس میں اس کا سب سے شاندار قصیدہ "الموسیقیة العمیاء" ہے۔ اس میں اس نابینا لڑکی کا ذکر ہے جسے اس نے ایک ہوٹل میں گاتے ہوئے دیکھا تھا۔ جس کا اس کے دل پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ اپنے ان جذبات کو "الموسیقیة العمیاء" میں قلم بند کیا ہے۔ (۲)

اذا ما طاف بالارض	شعاع الکوکب الفضی
اذا ما انت الریح	وجاش البرق بالومض
اذا ما فتح الفجر	عیون النرجس الغض
بکیت لزهرة تبکی	بدمع غیر مرفض (۳)

---

(۱) ایضاً: ص: ۵۳۸

(۲) اعلام النثر والشعر فی العصر العربی الحدیث ۳/۱۱۴-۱۱۶

(۳) علی محمود طه شعره ودراسة ص: ۳۴۶

اس دیوان میں درج ذیل موضوعات پائے جاتے ہیں۔

(۱) اس میں بے پناہ جذبہ محبت و احساس الفت ہے۔ جیساکہ "الجندول" اور "القمر العاشق" میں ہم نے دیکھا۔ ان کے علاوہ بیشتر قصائد میں بھی یہ چیز ملے گی۔

(۲) وہ کبھی زندگی کی آسائشوں میں گم اور کبھی بیزار نظر آتا ہے۔

فلقد قالوا: شذوذ مغرب وأباحية لاه لا ينيق

آه لو يدرون ما يضطرب بين جنبيك من الحزن العميق (۱)

(۳) اس کے یہاں فطرت سے متعلق بہت سے اشعار ملتے ہیں۔ فطرت کے عجائبات کی طرف اس نے خصوصی توجہ دی۔ اسے موسم گرما سے بڑا عشق ہے۔ وہ "مصرع الدریان" میں کہتا ہے۔

يا عاشق البحر حدث عن مفاتنه كم في لياليه للعاشق اسمار

ما ليلة للصيف فيه ما روايتها فالصيف خمر والحان و اشعار

اذا النسائم من افانيه انحدرت رضوات من كرى الظلماء أنوار (۲)

(۴) اس دیوان میں معاشرے اور انسانیت سے بھی بحث کی۔ جیساکہ ہم نے قصیدہ "الوسيقة العمياء" میں دیکھا۔

(۵) اس نے فطرت کے حسین مناظر اور عورتوں کے خصائص پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے فن کو بالائے طاق نہیں رکھا۔ اکثر ان موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہوئے شاعر فن شاعری کو بھول جاتا ہے۔ اس طرح شعریت برقرار نہیں رہ پاتی۔ ان موضوعات میں بھی اس کے یہاں شعریت موجود ہے۔ جیساکہ وہ قصیدہ "ہی" میں کہتا ہے۔

لقد دنس الجسد الطاهر هي حياة حرصت على طهرها

بكى الفن فيك على شاعر تساءله الروح عن ثارها

نزلت بها وهدة كم خبا شعاع وغيب في قبرها (۳)

---

(۱) علی محمود طٰہٰ شعر و دراسۃ ص:۳۴۶

(۲) ایضاً ص: ۲۴۴

(۳) علی محمود طٰہٰ شعر و دراسۃ ص:۳۱۸

[illegible] جو [illegible] — [illegible] الشرق [illegible]

[illegible] بی — [illegible] معجونی

[illegible] — [illegible] (۱)

(۲) [illegible] اور [illegible] ۱۹۲۵ء [illegible]
[illegible] الجدید [illegible] مشہور [illegible]
[illegible] (یہ [illegible] ایک [illegible] ہے) ان دونوں قصیدوں کا سنجیدگی سے
مطالعہ کیا جائے تو ان میں وہ گہرائی اور گیرائی نہیں ہے کہ جن کی بنا پر یہ مشہور ہوئے۔

اس کا قصیدہ "کرنفال فی فینسیا" (Crimival In Venival) بھی بہترین قصیدہ ہے
اس میں وینس کے عوام، مجالس، سڑکوں اور وہاں کی کشتیوں (البندول) کا ذکر ہے۔ دوسرا اہم قصیدہ
"کومو" ہے۔ "کومو" اٹلی کی ایک جگہ ہے۔ قصیدہ "غمرۃ نھر الرین" بھی ایک اچھا قصیدہ ہے۔
یہ نہر سوئٹزرلینڈ اور آسٹریا میں ہے۔ یہ تمام قصائد اپنی مثال آپ ہیں۔ ان میں یورپ کی پر رونق
شہروں اور خوبصورت مغربی شہروں کا ذکر ہے۔

اس میں اس کا سب سے شاندار قصیدہ "الموسیقیۃ العمیاء" ہے۔ اس میں اس نابینا لڑکی
کا ذکر ہے جسے اس نے ایک ہوٹل میں گاتے ہوئے دیکھا تھا۔ جس کا اس کے دل پر بڑا گہرا اثر پڑا۔
اپنے ان جذبات کو "الموسیقیۃ العمیاء" میں قلم بند کیا ہے۔ (۲)

اذا ما طاف بالارض — شعاع الکواکب الفضی

اذا ما انت الریح — وجاش البرق بالومض

اذا ما فتح الفجر — عیون النرجس الغض

بکیت لزهرة تبکی — بدمع غیر مرتفض (۳)

---

(۱) ایضاً: ص: ۵۲۸

(۲) اعلام النثر والشعر فی العصر العربی الحدیث ۳/۱۱۴-۱۱۶

(۳) علی محمود طه شعر و دراسة ص: ۳۲۶

یامنار مالک بہ جرانحی	یا نور این النور من جفونی
ذهب النهار بحسرتی وکا بتی	واتی المساء بادمعی وشجونی
حتی الطبیعة انزوت وتمامت	فتنکرت للهارب المسکین (۱)

(۲) "لیالی الملاح التائه" اس کا دوسرا دیوان ہے۔ یہ نہایت آن بان کے ساتھ ۱۹۴۰ء میں منظرعام پر آیا۔ اس کے دو قصائد "الجندول" اور "سفینۃ المعو" اس زمانے میں بہت مشہور ہوئے جنہیں عبدالوہاب نے گایا بھی تھا۔ (یہ اس عہد کا ایک عظیم گایک ہے) ان دونوں قصیدوں کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے تو ان میں وہ گہرائی اور گیرائی نہیں ملے گی جتنا کہ یہ مشہور ہوئے۔

اس کا قصیدہ "کرنفال فی فینسیا (Crinival in Venival) بھی بہترین قصیدہ ہے اس میں فینسیا کے عوام، مجالس، سڑکوں اور وہاں کی کشتیوں (الجندول) کا ذکر ہے۔ دوسرا اہم قصیدہ "کومو" ہے۔ "کومو" اٹلی کی ایک جگہ ہے۔ قصیدہ "خمرۃ نهرالرین" بھی ایک اچھا قصیدہ ہے۔ یہ نہر سوئٹزرلینڈ اور آسٹریلیا میں ہے، یہ تمام قصائد اپنی مثال آپ ہیں۔ ان میں یورپ کی پر رونق جگہوں اور خوبصورت مغربی شہروں کا ذکر ہے۔

اس میں اس کا سب سے شاندار قصیدہ "الموسیقیۃ العمیاء" ہے۔ اس میں اس نابینا لڑکی کا ذکر ہے جسے اس نے ایک ہوٹل میں گاتے ہوئے دیکھا تھا۔ جس کا اس کے دل پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ اپنے ان جذبات کو "الموسیقیۃ العمیاء" میں قلم بند کیا ہے۔ (۲)

اذا ما طاف بالارض	شعاع الکواکب الفضی
اذا ما انت الریح	وجاش البرق بالومض
اذا ما فتح الفجر	عیون النرجس الغض
بکیت لزهرة تبکی	بدمع غیر مرفض (۳)

---

(۱) ایضاً: ص: ۵۳۸

(۲) اعلام النثر والشعر فی العصر العربی الحدیث ۲/۱۱۴-۱۱۶

(۳) علی محمود طٰہ شعرو دراسۃ ص: ۳۲۶

اس دیوان میں درج ذیل موضوعات پائے جاتے ہیں۔

(۱) اس میں بے پناہ جذبہ محبت واحساس الفت ہے۔ جیساکہ "الجندول" اور "القرالعاشق" میں ہم نے دیکھا۔ ان کے علاوہ بیشتر قصائد میں بھی یہ چیز ملے گی۔

(۲) وہ کبھی زندگی کی آسائشوں میں گم اور کبھی بیزار نظر آتا ہے۔

ولقد قالوا: شذوذ مغرب وإباحية لاه لا ينيق

آه لو يدرون ما يضطرب بين جنبيك من الحزن العمتي (۱)

(۳) اس کے یہاں فطرت سے متعلق بہت سے اشعار ملتے ہیں۔ فطرت کے عجائبات کی طرف اس نے خصوصی توجہ دی۔ اسے موسم گرما سے بڑا عشق ہے۔ وہ "مصرع الریان" میں کہتا ہے۔

ياعاشق البحر حدث من مفاتنه كم في لياليه للعاشق اسمار

ماليلة للصيف فيه ما روايتها فالصيف خمر والحان واشعار

اذا النسائم من افا ئه انحدرت وضوات من كوى الظلماء أنوار (۲)

(۴) اس دیوان میں معاشرے اور انسانیت سے بھی بحث کی۔ جیساکہ ہم نے قصیدہ "الوسيقة العميلر" میں دیکھا۔

(۵) اس نے فطرت کے حسین مناظر اور عورتوں کے خصائص پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے فن کو بالائے طاق نہیں رکھا۔ اکثر ان موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہوئے شاعر فن شاعری کو بھول جاتا ہے۔ اس طرح شعریت برقرار نہیں رہ پاتی۔ ان موضوعات میں بھی اس کے یہاں شعریت موجود ہے۔ جیساکہ وہ قصیدہ "بی" میں کہتا ہے۔

لقد دنس الجسد الحار حى حياة حرصت على طهرها

بكى الفن فيك على شاعر تسا ئله الروح عن ثارها

نزلت بها فهداة كم خبا شعاع وغيب فى قبرها (۳)

---

(۱) علی محمود طٰہ شعر ودراسۃ ص:۳۴۶

(۲) ایضاً ص: ۲۴۴

(۳) علی محمود طٰہ شعر ودراسۃ ص:۳۱۸

اس دیوان [illegible] کہیں کہیں پڑھنے سے مایوسی کا احساس ہوتا ہے لیکن اس کی تعیش پسندی اسے پس پشت ڈال دیتی ہے

تسامحت عن لغة الكاذبين ودعة كل قصير خطر
ترى شاعر في زوبا الحياة دعته مباهجها فاعتذر
اكب على كاسه و انتحى صدى الليل في اللحظات الأخر
وناجيت ترقب احلامه خيالك في الموعد المنتظر (۱)

(۳) " ارواح واشباح " کے نام سے ایک قصیدہ ۱۹۴۲ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ قصیدہ زیادہ تر ان شخصیات پر مبنی ہے جو یونانی داستانوں میں مذکور ہیں اس میں تقریباً ۴۰۰ سو اشعار ہیں۔ پہلی بار ۱۹۴۲ء میں اور دوبارہ ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔ اس پر استاذ توفیق السلہ اد نے ایک شاندار مقدمہ لکھا۔ یہ قصیدہ عظیم شاعری کا ایک نمونہ ہے۔ کیونکہ یہ یونانی روایات اور تورات کے قصوں پر مشتمل ہے۔ پہلی اشاعت کے موقع پر مولف نے ان شخصیات کا تعارف بھی کرایا۔ اس نے ایک لمبا قصیدہ " سا فو " سے متعلق کہا، اور " تا ئیس " کے متعلق بتایا کہ اس کا دل محبت سے دھڑکتا رہتا ہے اور " بلتیس " لوگوں سے محبت کرتا ہے اور " ہرمیس " فصاحت و تجارت کا خدا ہے۔ اس نے ان واقعات کو صحیح طریقہ سے منظوم نہیں کیا۔ (۲)

اس دیوان میں ایک کہنہ مشق شاعر کی حیثیت سے سامنے آیا۔ اس کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسے عورت اور مناظر فطرت سے غیر معمولی لگاؤ ہے۔ اس نے عورتوں اور مردوں کو بھی موضوع بحث بنایا۔ عورت کی عظمت پر روشنی ڈالی اس سے محبت کیا اسے قوت واقعہ قرار دیا۔ اس کا خیال ہے کہ کہ ایک عورت مرد کی توجہ کا مرکز بننا پسند کرتی ہے۔

یہ دیوان درج ذیل خصوصیات پر مشتمل ہے۔

(۱) علی محمود طٰہٰ کو اپنے فن پر ناز ہے۔ اس کا خیال ہے کہ شاعر کے ساتھ خدا کا ایلچی " ہرمیس " ہوتا ہے انھیں تمام چیزوں پر قصیدہ " قلبی " میں اظہار خیال کیا ہے۔ جو " الملاح التائہ " میں ہے

---

(۱) لیالی الملاح التائہ ص ۸۱ بحوالہ علی محمود طٰہٰ حیاتہ وشعرہ ص ۱۰۹۔

(۲) اعلام النثر فی العصر العربی الحدیث ۳/ ۱۱۸۔

ثم هوروح جميل لاهاب بنيل الرياح جناحي ملك
وذلك وهو حين يسرى به سرى النور في سحاث الفلك (۱)

(۲) قصیدہ "الحیۃ الخالدۃ" پورا کا پورا مرد و عورت پر مبنی ہے۔ اس کا فن پر بڑا گہرا اثر ہے۔
اس میں وہی چیز ملتی ہیں جو قصیدہ "ہی" میں یہ قصیدہ "لیالی الملاح التائہ" میں ہے۔

عجبت من املك العابر ومن ذلك الشبح الطائر
الا علينا فما سلهما ولا مانع الناظر الناظر (۲)

(۳) عورت کو جہاں اس نے قوت دافعہ قرار دیا، وہیں اس نے اس سے بے پناہ محبت بھی کی۔
اس نے عورت کو اپنی شاعری اور اپنی ذات کا منبع تصور کیا، ہر آن اس کی محبت اور رضا کا طلبگار رہے
ویلنے ہمیشہ عورت سے محبت کی ہے۔ قصیدہ "حوا" میں گویا ہے۔

أ ابغض حواء وهي التي عرفت الحنان بها والرضى
فباع بها آدم خلده ولولم تكن لتمنى القضاء
ورثت هواها فرحت الحياة وخبب الى العالم المبغضا (۳)

(۴) ایک عورت مرد کے باب میں کیا احساسات رکھتی ہے اور وہ اس کے کن صفات کو پسند کرتی
ہے، اس کے متعلق علی محمود طٰہٰ کا خیال ہے کہ عورت ایک حسین و جمیل مرد کو چاہتی ہے اور اس کے حسن و
جمال کی پرستش کرتی ہے۔ عورت ہی کے الفاظ میں قصیدہ "الرجل" میں کہتا ہے۔

تصورته من احاديثه فتى لوسامته يؤثر (۴)

(۴) "اغنیۃ الریاح الاربع" ۱۹۴۳ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ ان فرعونی گانوں پر مشتمل ہے جن پر
"مدرستون" نے ۱۹۴۲ء میں روشنی ڈالی۔ اس نے تو انہیں فرانسیسی زبان میں قلم بند کیا تھا لیکن علی محمود طٰہٰ

---

(۱) ارواح وشباح ص ۴۴ بحوالہ علی محمود طٰہٰ حیاته وشعره ص ۱۱۰
(۲) ایضاً ص ۴۴ بحوالہ ایضاً ص ۱۱۳
(۳) علی محمود طٰہٰ حیاته وشعره ص ۱۰۰
(۴) علی محمود طٰہٰ حیاته وشعره ص ۱۰۰

لے اپنی کرشموں سے انہیں عربی شاعری کا جامہ پہنا دیا۔ ان میں بے پناہ موسیقی ہے۔ اور انھیں دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے۔ ان میں مختلف لوگوں کی شخصیات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ انھیں مکمل ڈرامائی صورت نہیں دے سکا۔ کیونکہ وہ ایک غنائی شاعر ہے ڈرامائی شاعر نہیں۔ کثرت غنا کے سبب اس کے اشعار تمثیل نگاری کے لئے موصوف نہیں ہو سکتے۔ (۱)

(۵) "زہر و خمر"۔ یہ دیوان ۱۹۴۳ء میں منظر عام پر آیا۔ اپنی زندگی کے واقعات کو اس میں قلمبند کیا ہے۔ اور اپنی رنگ رلیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں "کیلو باترا" ایک شاندار قصیدہ ہے جن میں الفاظ کی شان و شوکت تو ضرور ہے لیکن فکر و گہرائی سے خالی ہے ٹھیک یہی حال "کیلو باترا" کا بھی ہے۔ جس میں کوئی عمق نہیں۔ البتہ جب کوئی موسیقار اسے گاتا ہے تو سامعین وجد میں آجاتے ہیں (۲)
"حانۃ الشعراء" بھی اس میں ایک اہم قصیدہ ہے جس کے چند اشعار پیش کئے جا رہے ہیں۔

فی حانۃ شتی عجائبھا   معروشۃ بالزھر والقصب

فی ظلہ باتت تداعبھا   انغامی لیل مقمر السحب

وزھت بمصباح جوانبھا   صافی الزجاجۃ راقص اللھب (۳)

قصیدہ "قادۃ الی قادۃ" بھی ایک اہم قصیدہ ہے اس میں اس نے اندلس سے فاتح طارق بن زیاد کی عظیم کامیابی اور اس کی فاتحانہ جدوجہد کی عکاسی کی ہے۔ (۴)

اس دیوان میں کوئی جدید چیز نہیں ملتی۔ اس میں اس نے اپنے عیش و آرام کو بیان کیا۔ اس میں آزادی فن کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ یہ چیز اس کے "حانۃ الشعراء" میں ملے گی۔ یہ قصیدہ اس نے جرمنی شاعر "ہنریش ہاینی" کے طرز پر کہا۔ (۵)

(بقیہ آئندہ)

---

(۱) الادب العربی المعاصر فی مصر ص ۱۶۷

(۲) الادب العربی المعاصر فی مصر ص ۱۶۶

(۳) علی محمود طٰہٰ شعر و دراسۃ ص ۱۰

(۴) الادب العربی المعاصر فی مصر ص ۱۶۶

(۵) ایضاً ص ۱۶۷

عہدِ مغلیہ یورپی سیاحوں کی نظر میں

(۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۷ء)

قسط ۸

ڈاکٹر محمد [illegible] شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

کاٹھیاواڑ کے جنوبی مشرقی ساحل پر واقع مہوا نامی مقام کے آس پاس وہ خشکی کے قریب ے تو وہاں انہیں اس بات سے آگاہ کیا گیا کہ یلا ایک جہاز راں کے وہ لوگ کیسے کھاڑی میں داخل نہ دن۔ اس تنبیہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ جہاز لے کر سورت کے لئے روانہ ہوئے اور ۱۲ ستمبر ۱۶۰۹ء ان کا جہاز ریتیلے ایک کنارے سے ٹکرا گیا۔ اس کا پتوار کھو گیا اور بڑی ایک تباہی سے بچنے کے یے اس جہاز پر لنگر ڈال دیا گیا۔ دوسرے دن اس کا لنگر ٹوٹ گیا۔ مدوجزر نے پھر ایک بار انہیں م گہرے مقام تک ڈھکیل دیا۔ اس میں بری طرح سے سوراخ ہونے لگا۔ نتیجتاً ڈوبتا ہوا سمجھ کر نہوں نے اس جہاز کو چھوڑ دیا۔ ایک کشتی میں سوار ہوتے ہوئے جورڈین سمندر میں گر پڑا اور مرتے مرتے بچا۔ دو کر بیزی کشتیوں میں سارے ملاحوں کو بھر دیا گیا۔ کسی طرح وہ لوگ براعظم تک پہونچنے میں کامیاب ہوئے۔ وہاں کے باشندوں نے شارپیگ اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ کیا۔ یہ سوچ کر کہ یہ تاپتی ندی تھی وہ لوگ غلطی سے امبیکا ندی میں گھس پڑے۔ ندی کے اوپری حصے میں چلنے کے لئے ان کی راہ نمائی کی گئی۔ وہ لوگ خیر و عافیت سے ڈوڈاوری قصبے تک پہونچ گئے۔ وہاں کے صوبہ دار نے بھی ان کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ دو دن آرام کرنے کے بعد انہیں سورت بھیج دیا گیا۔ شہر کے ایک گماشتے کی حیثیت سے ولیم فنچ ان کا خیر مقدم کرنے کے لئے آیا۔

جورڈین نے سورت میں فنچ کے ساتھ تین ہفتے قیام کیا۔ جنوری ۱۶۱۱ء میں ہاکنس نے فنچ کو آگرہ بلا لیا۔ شہر میں بقیہ تجارتی مال فروخت کرنے کے لئے جورڈین کو وہاں چھوڑ دیا گیا۔ آگرہ سے اپنے اعلیٰ افسر (ہاکنس) کے بلانے پر وہ (۱۵ دسمبر ۱۶۱۰ء کو) سورت سے مغلیہ دارالخلافہ کے لئے وہاں سے روانہ ہوا۔ فروری ۱۶۱۱ء کو وہ وہاں پہونچا اور ۵ ماہ تک اس نے آگرہ میں قیام کیا۔ شارپیگ دوسرے

[illegible] کے ساتھ آگرہ سے احمدآباد کے راستے سے ہوکر وہ سورت کے لئے روانہ ہوا۔ دسمبر [illegible] کے بعد میں مقرب خاں نے انہیں یہ خبر سنائی کہ میڈلٹن کا بحری جہازی بیڑہ سورت [illegible] پہنچا تھا۔ اس سے ایک خط اور ان کے لئے حفاظتی ایک فوجی دستہ ساتھ لے کر وہ خیر و عافیت اور بڑے آرام سے اس شہر میں پہنچے (ستمبر ۸، ۱۶۱۱ء)۔

حالانکہ وہ سورت پہنچ چکے تھے لیکن وہ لوگ جہازی بیڑے تک نہ پہنچ سکے کیونکہ پرتگالیوں نے اس ندی کے دہانے کو بند کر دیا تھا۔

۰ ماہ اکتوبر کے وسط میں ایک دن صبح پرتگالیوں سے زبردستی ہتھیائے ہوئے جنگی ایک جہاز کے ساتھ سمندری کنارے پر ایک انگریزی فوجی جنرل کھڑا تھا، پیچھے کے ایک ریتیلے ٹیلے سے ایک پگڑی کے کپڑے کے ہلائے جانے کی طرف اس کی توجہ مبذول ہوئی۔ کنارے کے لئے ایک کشتی بھیجی گئی۔ جیسے جیسے وہ کشتی ساحل کے نزدیک پہونچ رہی تھی ملاحوں نے ملکی لباس میں ایک یوروپی باشندے کو دیکھا جو اس مقام سے باہر نکل آیا تھا۔ جہاں وہ چھپا ہوا تھا اور ان سے ملنے کے لئے پانی میں چل رہا تھا وہ جورڈین تھا۔ مقامی ایک دلال کی مدد سے وہ پرتگالیوں کے پہرہ داروں کی گرفت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا تھا، وہ ساحل پر پہنچا اور پیپرکورن نامی کشتی میں سوار کرکے اسے لایا گیا۔

میڈلٹن اور ڈاؤنٹن سے اس نے اپنے تمام تجربات بیان کئے اور انہیں ایک ایسے بندرگاہ کے بارے میں مطلع کیا جہاں جہاز صحیح و سالم ساحل تک جا سکتے تھے۔ یہ مشہور "سویلی ہول" نامی بندرگاہ تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جورڈین دوبارہ سورت آیا تھا۔ دربار سے ہاکنس کے روانہ ہونے کے بعد مقرب خاں نے اسے مطلع کیا کہ وہ اپنا سارا سامان باندھ لے اور کچھ دے دلا کر خلاصی حاصل کرلے۔ لہٰذا وہ اور اس کے ملازمین نے شہر چھوڑ دیا اور جنگی ایک جہاز میں سوار ہو گئے۔ (۶ فروری ۱۶۱۲ء)

بعد میں اس نے میڈلٹن کا ساتھ چھوڑ دیا اور ڈالنگ نامی بحری جہاز میں مشرق کے لئے روانہ ہوگیا۔ یہاں المناک حالات میں اس نے وفات پائی۔ ۲ جون کو وہ پٹنی نامی بندرگاہ پر

رکا جو ملائے جزیرہ نما میں مشرقی ساحل پر تجارتی بڑا ایک مقام تھا۔ جوں ہی وہ آگے جانے کے لئے روانہ ہوا ولندیزیوں نے اس پر اچانک حملہ کر دیا۔ ۷ ار جولائی ۱۶۱۹ء میں بحری ایک جنگ وقوع پذیر ہوئی۔ دو گھنٹے مقابلہ کرنے کے بعد اسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ مقابلہ کرنا بے سود ہے عارضی صلح کے لئے ایک جھنڈا پھرایا گیا اور جورڈین ولندیزی جہاز میں سوار ہو کر صلح کے بارے میں گفت و شنید کے لئے گیا۔ جوں ہی اس نے جہاز کے پلیٹ فارم پر قدم رکھا اور مجوزہ صلح کی شرطوں کے بارے میں بات چیت کر رہا تھا تو اس پر گولی کا وار کیا گیا۔ نتیجتاً اس زخم کی وجہ سے ایک گھنٹے کے بعد اس کی موت واقع ہو گئی۔ بہت سی بندوقیں داغ کر اور مذہبی رسوم کے ساتھ پٹنی میں اسے سپرد خاک کر دیا گیا۔

اس کے روزنامچے کا اصلی مسودہ دستیاب نہیں ہوتا ہے سلوین کا قلمی نسخہ جس سے یہ بیانات ماخوذ ہیں معاصر ایک نسخہ ہے۔ بقیہ تحریر کے مقابلے اس کے ابتدائی چار صفحات کسی دوسرے خط سے لکھے ہوئے ہیں۔ فورسٹر کا خیال ہے کہ: "یہ بات بہت ممکن ہے کہ وہ نسخہ جو ہمارے پاس موجود ہے، یہ وہ نقل ہو جو اس کے لئے تیار کی گئی تھی جس زمانے میں (۱۶۱۷ء) وہ لندن میں تھا اور یہ کہ ایک دستاویز کی صورت میں وہ اسے وہاں چھوڑ آیا تھا اور ہند واپس آنے کے موقع پر اصلی مسودہ اپنے ساتھ لیتا آیا ہو۔ سر ہنس سلوین نے یہ مسودہ حاصل کر لیا ہو۔ اس وقت یہ نسخہ برٹش میوزیم کی تحویل میں ہے۔ چونکہ یہ نقل لاپرواہی سے تیار کی گئی تھی۔ اس لئے کثرت سے غلطیاں پائی جاتی ہیں بالخصوص مقامات کے ناموں میں۔

ہکلیوٹ سوسائٹی سیریز میں فورسٹر نے جورڈین کے تذکرہ کو تدوین کیا ہے۔ ذیل مضمون میں مندرجہ تمام حوالے اس سے ماخوذ ہیں۔

تجارتی راستے

جورڈین نے دو تجارتی راستوں کا ذکر کیا ہے، ایک سورت سے برہانپور ہوتے ہو آگرہ تک، اور دوسرا احمد آباد سے ہوتا ہوا آگرہ سے کمبیات تک جاتا ہے۔

برہانپور سے ہوتا ہوا سورت سے آگرہ کا راستہ: سورت، کمبھاریہ، موٹا

ویرا، کورکا، نرائن پور، ڈیتا بڈوبھ، تندربار، لنگل، سنگیری، تلینر، چھوپرہ، راودی، بیولے ردر، بدرپور، برہانپور، اسیر، مگرگنگا، کرگنج، بیکل، اکبرپور، منڈو، کونے ہیر، دھول پور، اجین کنوسٹیا، سینرہ، پیپل گاؤں، سرہپور (سرنپور)، ککرہ، دلوت، براؤ، سکیرہ، سارنج (سرونج) کوجنارک سریا، سزدورا، کل باغ، گوالیار، چھپری، نروار، گوریکا، اوترو، منڈبار، دھولپور، جبرو، آگرہ۔

اجمیر ہوتے ہوئے آگرہ سے کمبیات کا راستہ؛

آگرہ، کرولی، فتح پورسیکری، پریما بودہ، سکندہ، ہنڈون، للسی، جمپھا، چورسی، لدھیانہ (للدانا) مُزبان، رستِیل، اجمیر، کروی، مرتھا، برگی، ہنڈولہ، جودھپور، دنّارہ، ٹنڈک کنڈرک، امبرنیہ، گلبرد، انگی بر، مرگی، بیروال، گندوی، کورگا، سرند، بونوپ، سرم پور، سراپور سِتی، اکوکلکپور، ہوگی پور، احمدآباد۔

(۲) وہ شہر جہاں وہ گیا

کرود، دائتا اور ویرا؛

کرود ایک قصبہ تھا جہاں تقریباً دو سو راجپوت گھوڑ سواروں کا حفاظتی ایک دستہ تعینات تھا۔ پہاڑ کی ایک چوٹی پر یہاں ایک قلعہ تھا۔ اس کے چاروں طرف پانی بھرا ہوا تھا۔ ویرا "خوبصورت ایک قصبہ تھا" جس کے زیادہ تر باشندے مزدوری کا پیشہ کرتے تھے۔ یہاں بھی ایک قلعہ تھا۔ دتیا پر پرتاپ سنگھ کا قبضہ تھا۔ یہ قصبہ زرخیز علاقے میں واقع تھا۔ بڑی ایک مقدار میں یہاں بفتہ نیار کیا جاتا تھا اور دوسری ہر قسم کی دستکاری کے کام ہوتے تھے۔

بھدور، یاول اور بہادر پور؛

بھدور مستحکم ایک شہر تھا جس کے اردگرد ایک فصیل تھی۔ جوڈین کا بیان ہے کہ "یہاں عمدہ قسم کا کپڑا بنا جاتا تھا جیسے برمی، سری باف، یاول ایک ایسا مقام تھا جہاں ہر قسم کی چھینٹیں زم پڑ

رِبند بنائے جاتے تھے۔ بہادر پور بڑا ایک شہر تھا جو گنجان آباد تھا۔ اس کی تجارتی چیزوں میں
ہر کی چھینٹیں اور دوسرے قسم کے کپڑے شامل تھے۔

برہانپور:

۶ رجنوری ۱۶۱۱ء میں جورڈین برہانپور پہونچا۔ دکن پر حملہ کرنے کے لئے اس وقت وہاں
رسواروں کی بڑی ایک فوج جمع تھی جس کی تعداد دو لاکھ تھی۔ قلعہ میں شہزادہ پرویز ٹھہرا ہوا
۔شہر کے آس پاس کے کھلے اور خوشگوار میدانوں میں فوج خیمہ زن تھی۔ اس نے لکھا ہے کہ
ڑی تعداد میں لوگوں کی یہاں آمد و رفت کی وجہ سے یہ شہر وبا سے خالی نہ تھا: مغل فوج کی
امتی کے بارے میں اس نے لکھا ہے کہ: "ہم پڑاؤ میں اس طرح سلامتی سے قیام پذیر تھے
یسے کہ ہم اپنے گھروں میں رہتے تھے۔ میں نے اس سے عمدہ نظم و نسق نہیں دیکھا تھا۔ جیسا کہ پڑاؤ میں
ما اور ہر قسم کی چیزیں بکثرت موجود تھیں"۔ برہانپور میں عمدہ پگڑیاں، سنہری اور ریشمی کمر بند
مینٹیں، بیرامی اور سری باف وغیرہ کے کپڑے بنے جاتے تھے۔

اکبر پور:

دریا کے کنارے واقع خوبصورت ایک شہر تھا۔ یہ قصبہ ایسا تھا کہ وہاں حفاظتی دستے
تعینات تھے اور "پڑاؤ" میں مقیم کوئی شخص گورنر کی اجازت کے بنا وہاں سے نہیں گذر سکتا تھا۔
اور شہزادہ پرویز کی اجازت کے بنا کوئی آگرہ نہیں جا سکتا تھا۔

منڈو:

یہ ویران اور برباد ایک شہر تھا۔ اس سیاح کے اندازے کے مطابق جنوب سے شمالی
دروازے تک اس کا طول چھ میل تھا اور لوگوں کے کہنے کے مطابق مشرق سے مغرب کی
سمت بیس کوس تھا یعنی ۲۵ میلوں کے برابر تھا۔ اس شہر کے چاروں طرف اینٹوں کی چار دیواری
تھی، وہاں اس نے دو مسجدیں بھی دیکھی تھیں۔ وہاں چار بادشاہ مدفون تھے۔ ان کی قبریں قیمتی

مدہ پتھروں کی بنی ہوئی تھیں جن میں انھیں دفن کیا گیا تھا۔ ان مسجدوں میں سے ایک مسجد کے
ر پر پُرشکوہ ایک مینار تھا جس میں چڑھنے کے لئے ستر سیڑھیاں تھیں۔ یہ مینار گول بنا ہوا تھا
س میں عجیب و غریب طرح کی بنی ہوئی بہت سی کھڑکیاں تھیں۔ یہ چھ منزلہ تھا اور ہر ایک منزلہ
ں لوگوں کی رہائش کے لئے کمرے بنائے گئے تھے۔ سنگ مرمر کے قسم کے وہ مینار سے ہرے پتھروں
ے بنا ہوا تھا۔ شہر کی مشرقی سمت میں چراگاہیں اور سبزہ زار پھیلے ہوئے تھے۔ شہر نو میں پتھر
ے بنی ہوئی بہت سی سرائیں تھیں، وہاں مسافر قیام کرتے تھے۔ شہر کے بیشتر باشندے ہندو تھے۔

سارنگ پور اور سرونج :

سارنگ پور بڑا ایک شہر تھا، اس میں ایک قلعہ واقع تھا پارچہ بافی وہاں کی مخصوص صنعت
ی۔ سرونج بھی بڑا ایک شہر تھا۔ وہاں کی ایک پہاڑی کی چوٹی پر ایک قلعہ تھا۔ تجارتی خاص
شیاء میں عمدہ چھینٹ اور سنہری ریشمی پٹکے (کمر بند) کا شمار ہوتا تھا۔ ان کی قیمت دو سو سے
نچ سو محمودی سکّے تک ہوتی تھی۔

گوالیار :

گوالیار اچھا خاصا ایک شہر تھا، وہاں ایک مضبوط قلعہ تھا۔ اس قلعہ کے دروازے پر عجیب
غریب ساخت کا پتھر کا بنا ہوا ہاتھی کا ایک مجسمہ نصب تھا۔ قلعے کے اندر بادشاہ کا محل تھا
س کی دیواریں ہرے اور نیلے پتھروں کی بنی ہوئی تھیں اور بہت سے میناروں پر سونے کے ملمع کاری
کام تھا۔ حکومت کے غدّاروں کو وہاں مقید رکھا جاتا تھا۔ جنہیں وہاں ایک مرتبہ مقید کر دیا
جاتا تھا انھیں وہاں سے باہر آنے کی بہت کم امید ہوتی تھی۔

گرہ :

دنیا کے سب سے بڑے شہروں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ دریا کے کنارے کنارے یہ شہر ۱۲
ل کی دوری تک آباد تھا۔ یہاں امیروں کی بہت سی شاندار عمارتیں اور بہت سی اچھی سرائیں تھیں۔

ں ایک عمدہ قلعہ تھا جسمیں بادشاہ رہتا تھا۔ وہاں کی سراؤں میں ایک مسافر تھوڑا سا سامان
رکھ سکتا تھا یا بالکل نہیں رکھ سکتا تھا۔ ہر روز شام کو سرائے کا خاص دروازہ بند کر دیا جاتا تھا
بان کی منظوری کے بنا کسی کو اندر آنے یا باہر جانے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ یہ تجارتی ایک بڑا شہر
ا۔ یہاں ایسے تاجر ملتے تھے جو ہندوستان فارس اور ایشیا میں واقع دوسرے مقامات کو روپیہ
بھیجا کرتے تھے۔ دنیا کے تمام خطوں سے لوگ وہاں آتے تھے، "کوئی ایسی چیز نہیں ہو سکتی تھی
س کی خواہش کی جائے اور وہ اس شہر میں دستیاب نہ ہو جائے"۔ جورڈین نے لکھا ہے۔
شہر بہت گنجان آباد تھا۔ اگر کوئی اس کی گلیوں میں سواری پر جاتا تھا تو اسے ایک یا دو ایسے
ییوں کی ضرورت پڑتی تھی کہ وہ آگے جا کر سواری کے نکلنے کے لئے راستہ صاف کرا دیں کیونکہ
ن گلیوں میں اتنی بھیڑ ہوتی تھی جیسے کہ "ہمارے ملک کے بیلے ٹھیلوں میں"۔ شہر کے بیشتر مکانات
لہاس پھوس کے بنے ہوئے تھے جو سال میں ایک دو مرتبہ جل کر بھسم ہو جاتے تھے۔

احمد آباد:

جورڈین نے لکھا ہے کہ! "عمارت کی ساخت اور مضبوطی کے ساتھ ساتھ خوبصورتی
دونوں لحاظ سے سارے ہندوستان کے خوبصورت شہروں میں اس کا شمار ہوتا تھا"۔ شہر کی
تجارتی خاص چیزوں میں لفتہ، چھینٹ، برائی اور طرح طرح کے دوسرے کپڑے شامل تھے۔

کمبات:

تجارت اور خوبصورتی کے لحاظ سے ہندوستان کے بہترین شہروں میں اس کا شمار ہوتا
تھا۔ پرتگالی وہاں تجارت کرتے تھے۔ اس کی دیواریں بہت مضبوط ہوتی تھیں، ہر ایک مکان
کے ایک دروازے کے اندر تین دوسرے دروازے یکے بعد دیگر ہوتے تھے۔ اس شہر کی ہر ایک
گلی ایک قلعہ کے مثل تھی کیونکہ جب تک دربان دروازے نہ کھولے، کوئی چیز دکھائی نہ دے
سکتی تھی۔

(۳) بادشاہ

ذاتی قیام گاہ:

آگرہ کا قلعہ بادشاہ کا قیام گاہ تھا۔ تقریباً دو کوس کی دوری تک" وہ خوبصورت اور مضبوط بنا ہوا تھا۔ اس کی دیواریں گہرے سُرخ رنگ کے پتھروں کی بنی ہوئی تھیں جن میں بہت سے مینار اور دندانے دار برُج نما دیواریں تھیں:" جورڈین نے لکھا ہے کہ "جب کوئی شخص اس کے اندر چلا جاتا تھا تو اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ ایک شہر میں ہے جہاں ہر قسم کی چیزیں بکتی تھیں۔"

پروگرام:

دو گھنٹے دوپہر سے پہلے اور دو گھنٹے دوپہر بعد روزانہ بادشاہ مقدموں کی سماعت کرتا تھا بقیہ دن وہ ہاتھیوں کی جنگیں دیکھنے اور دوسرے کھیل تماشوں میں گذارتا تھا۔" اس کے تفریحی مشغلوں میں ایک مشغلہ یہ تھا کہ وہ لوگوں میں ایک شیر چھوڑ دیا کرتا تھا۔"

قلعے کے دروازے پر پہرے دار:

محل کی دربان عورتوں اور مردوں کی ہر چوبیس گھنٹوں کے بعد ڈیوٹیاں بدلی جاتی تھی۔ ہر ایک امیر پہرہ داروں کے سردار کی حیثیت سے چوبیس گھنٹے ڈیوٹی دیتا تھا۔ سہ پہر کو پانچ بجے کے قریب روزانہ وہ بادشاہ کی خدمت میں تسلیمات پیش کیا کرتے تھے اور رخصت ہو جاتے تھے۔

ہاتھی:

بادشاہ کو آداب بجا لانے کے لئے روزانہ ہاتھیوں کو پیش کیا جاتا تھا۔ جب وہ انکی طرف دیکھتا تھا تو" وہ سب ہاتھی سلام کرنے کے لئے اپنی سونڈیں اپنے ماتھوں پر رکھ لیتے تھے:" مخمل، سنہری کپڑوں اور دوسرے زرق برق کپڑوں کی ان پر جھولیں پڑی ہوتی تھیں۔

(۴) دربار

بادشاہ کو تعظیم و تکریم پیش کرنا :

بادشاہ کو تعظیم و تکریم پیش کرنے کا یہ طریقہ تھا کہ ایک شخص زمین سے تین مرتبہ ہاتھ اٹھا کر اپنے سر تک لے جاتا تھا اور اس کے بعد وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر سجدہ کیا کرتا تھا۔

بادشاہ کو تحفے تحائف پیش کرنا :

بلا تحفے تحائف کوئی شخص دربار میں حاضر نہیں ہوتا تھا۔ بادشاہ کو اس طرح پیش کئے جانے والے تحفے خزانے میں جمع کر دئے جاتے تھے۔ ساتھ ساتھ ان کا حساب بھی رکھا جاتا تھا۔

(۵) امرار

مکانات :

آگرہ میں امیروں کے مکانات دور دور واقع تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کہ وہ ایک دوسرے سے خوفزدہ ہوں۔ ہر ایک بڑے آدمی کا اپنا ذاتی مکان ہوتا تھا جس میں اس کے تمام ملازمین مع گھوڑوں کے وہاں رہتے تھے۔

(۶) عوام

نوساری کے پارسی : (پارسی مذہب کے پیرو)

وہ لوگ قدآور اور سفید فام ہوتے تھے۔ وہ لوگ آگ کی پرستش کیا کرتے تھے اور ہمہ وقت آگ جلائے رکھتے تھے۔ ان لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اگر آگ بجھ جائے گی تو قیامت آجائیگی۔ اگر ان کے گھر کی آگ بجھ جاتی تو وہ اپنے ہم سایہ کے یہاں سے آگ نہ لاتے بلکہ اپنے مندر سے لاتے۔ ان میں سے جب کوئی مرجاتا تو اسے جلایا نہیں جاتا تھا" تو کھلے ایک میدان میں جو اس کام کے لئے مخصوص تھا، ایک جگہ کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ جہاں پرند اس کا گوشت کھا لیتے۔ کتوں اور دوسرے جانوروں کو اس کے قریب نہیں جانے دیتے تھے۔

(باقی آئندہ)

بیان ملکیت و تفصیلات متعلقہ برہان دہلی
فارم چہارم قاعدہ نمبر ۸

۱۔ مقام اشاعت	اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶
۲۔ وقفۂ اشاعت	ماہانہ
۳۔ طابع کا نام	عمید الرحمٰن عثمانی
قومیت	ہندوستانی
۴۔ ناشر کا نام	عمید الرحمٰن عثمانی
سکونت	۴۱۳۶، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶
۵۔ ایڈیٹر کا نام	عمید الرحمٰن عثمانی
قومیت	ہندوستانی
سکونت	۴۱۱۵، اردو بازار، دہلی
۶۔ ملکیت	ندوۃ المصنفین، جامع مسجد، دہلی ۶

میں عمید الرحمٰن عثمانی ذریعہ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط) طابع و ناشر
عمید الرحمٰن عثمانی
عمید الرحمٰن

برہان

جلد ۱۱۳ | اپریل ۱۹۹۴ء مطابق ذیقعدہ ۱۴۱۴ھ | شمارہ ۴

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

نظریات

آجکل ڈنکل تجاویز پر بھارت کی تمام حزب مخالف جماعتیں ایک آواز ہوکر عوام کو اس کے مضرات کے بارے میں زور و شور کے ساتھ بتا رہی ہیں کہ حکومت ہند اس کو بغیر سوچے سمجھے اپنے ملک میں لاگو کرنے کے لیے ۱۵ اپریل سنہ ۱۹۹۴ء کو مراقش میں اس پر دستخط نہ کرے۔ جنتا دل، کمیونسٹ پارٹیاں، سماج وادی، بھارتیہ جنتا پارٹی سب ہی نے حکومت ہند کو ڈنکل تجاویز کو نہ ماننے کے لئے کہا ہے اور اس کے لئے ۶ اپریل کو بھارتیہ جنتا پارٹی نے دہلی میں ایک بڑی ریلی کا بھی اہتمام کر ڈالا۔

یہ ڈنکل تجاویز ہے کیا؟ اس کے بارے میں عوام الناس کو ابھی تک کوئی معلومات نہیں ہے۔ ایک طرف حکمراں پارٹی کے ممبران کا دعویٰ ہے کہ ڈنکل تجاویز ملک کے مفاد میں ہے اس سلسلے میں مسٹر راجیش پائلٹ کا بیان ہے کہ ڈنکل منظور کرنے سے ملک کے کسانوں کا کوئی نقصان نہیں ہوگا انہوں نے کہا کہ دنیا کے بازار میں بھارت کو بنائے رکھنے کے لئے راؤ حکومت کو بھی دستخط کرنے ہوں گے۔ وزیر تجارت جناب پرنب مکرجی نے کہا کہ نئے گیٹ معاہدے پر خاص طور پر کی گئی وضاحت کہ اس کے اندر دی گئی نکات زیادہ تر بھارت کے مفاد میں ہیں اور خاص کر کسان برادری کو فائدہ پہونچے گا۔ ہمارے ملک کے مال کی برآمد سے زرمبادلہ (فارن اکسچینج) میں اضافہ ہوگا۔ اور حزب اختلاف کا یہ خیال یا الزام غلط ہے کہ کسانوں کو بیج مہنگا ملے گا۔

اس کے برعکس حزب اختلاف کے لیڈروں کا کہنا ہے کہ ڈنکل تجاویز ماننے سے بھارت کی مالی حالت پر کافی برا اثر پڑے گا۔ بھارت کی صنعتیں غیر ملکی کمپنیوں کے قبضے میں آجائیں گی۔ ڈنکل تجاویز کے مطابق ملک میں گندم کی ضرورت نہ ہونے پر بھی سالانہ غیر ملکوں سے تین فیصد گندم ضرور درآمد کرنا پڑے گی۔ ڈنکل تجاویز سے ملک کے چھوٹے درمیانی درجے کے کارخانوں کو بھاری نقصان پہونچے گا۔ ان ہی تجاویز کے ذریعہ بھارت کو بڑے کارخانوں کے شیئر سستے داموں غیر ملکی کمپنیوں کو بیچنے ہونگے۔ سابق وزیر اعظم چندر شیکھر، بھارتیہ جنتا پارٹی کے جناب اٹل بہاری باجپئی، ایل کے ایڈوانی، جنتا دل لیڈر

[illegible] یادو کے خیال میں ڈنکل تجاویز کی منظوری کی صورت میں عام آدمی کے لئے
[illegible] صنعتیں اور کسانوں کی اقتصادی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے گی ملک کی
[illegible] میں سرکار کی ناکامی کے خلاف حزب اختلاف نے اظہار ناراضگی کیا۔ شری
[illegible] ہیں کہ چند ملکوں پر بنیادی گیٹ پیکیج کو تبدیل کرنے کے لئے دباؤ ڈالا جارہا ہے۔ اگر
کوئی اس ملک معاہدے میں تبدیلی کرانے کی کوشش کرتا ہے تو تمام ۱۱۷ ملک مزید نظرثانی کے لئے اپنی
تجاویز رکھیں گے۔ پرنب مکرجی کا کہنا یہ بھی ہے کہ اس معاہدے سے ہماری برآمدات میں دس ارب ڈالر کا
اضافہ ہو جائے گا۔ بھارت میں ڈنکل تجاویز ماننے یا نہ ماننے کے متعلق جو زور و شور سے پروپیگنڈہ
ہو رہا ہے اس کے پس منظر میں ہم یہ بتانا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ ڈنکل یہ نام ہے کیا؟ آرتھر ڈنکل ڈاؤن
ہیں وہ ایک وکیل ہیں شری منموہن سنگھ کی طرح ماہر اقتصادیات نہیں ہیں ڈنکل کے اقتصادی نسخوں کے
عقب میں ایک بھارتی ماہر اقتصادیات ڈاکٹر جگدیش بھگوتی کا دماغ کام کر رہا تھا۔ ڈنکل نے تو ان تجاویز
کو صرف قانونی شکل ہی دی ہے۔

ہمارے خیال میں ڈنکل تجاویز کی منظوری ان لوگوں کی خواہشات کی تکمیل کا مرحلہ ہے جنہوں نے
ایجادات ہی کو ضرورت سمجھ لیا ہے۔ جب عوام ضروریات زندگی کو بھول چکے ہوں اور وہ ایجادات ہی کو زندگی
کا حصول سمجھتے ہوں تو پھر ڈنکل پر شور مچانا ہی لاحاصل بات ہے حکومت کی مجبوری ہے کہ عوام کی ضروریات
کو فراہم کرنے کے لئے زرمبادلہ کے حصول کے ذرائع مہیا کرنے بہت ہی اہم و مقدم ہیں۔ اگر وہ ڈنکل
تجاویز پر دستخط کرنے سے حاصل ہوتے ہیں تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔ ۱۹۸۵ء میں جناب راجیو گاندھی
کے وزیر اعظم بننے کے بعد بھارت نے اپنی منڈیوں کے دروازے غیر ملکیوں کے لئے کھولے۔ ۱۹۸۰ء سے
۱۹۹۲ء کے ۱۲ اہم برسوں میں حکومت کے بیلنس شیٹ سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت ہند کی دینداری اس
کے سرمائے سے ایک لاکھ بیس ہزار کروڑ روپئے زیادہ ہو گئی جس کا مطلب ہے کہ حکومت کا خرچ قابو
سے باہر ہو گیا۔ حکومت کے ذمہ ۱۹۸۰ء میں ۵۰ ہزار کروڑ روپیہ قرض تھا جو ۱۹۹۲ء میں تین لاکھ
۹۹ ہزار کروڑ روپیہ ہو گیا۔ روپیہ کی موجودہ قیمت کے لحاظ سے یہ رقم ۵ لاکھ ۹۰ ہزار کروڑ روپے
بنتی ہے۔ غیر ترقیاتی خرچ اس عرصہ میں چھ گنا بڑھ گیا۔ بھارت سرکار پر سود کا خرچ ۱۳ گنا بڑھ چکا
ہے جس کی وجہ سے افراط زر ہوا اور روپے کی قیمت گری اور مالیاتی خسارہ بڑھا۔ ہمارا غیر ملکی

قرضہ جو ۱۹۸۰ء میں ۲۳ ارب پچاس کروڑ تھا بھارت کا آج ۸۰ ارب پچاس کروڑ ڈالر کے برابر ہو چکا ہے حالانکہ اس دور میں کوئی جنگ یا قحط نہیں ہوا۔ ہم صرف عیش و آرام کا سامان درآمد کرتے رہے قرضوں کا سود تک دینا ملکی معیشت کے لئے مشکل ہو گیا ہے۔ اس تمام صورتحال کی موجودگی میں ہمیں ڈنکل تجاویز پر حزب اختلاف کی مخالفت کو کن معنوں میں دیکھنا ہوگا اس کے لئے مذکورہ بالا حقائق کے پیش نظر اسے سمجھنے کے لئے ہمارے لئے کوئی مشکل نہیں ہوگی ۔

ہندوستان کے سبھی چھوٹے بڑے اردو ہندی اور انگریزی اخبارات اس غم میں گھلے جا رہے ہیں کہ مسلمانوں کے اپنے مذہبی معاملات کے حل کے سلسلے میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے شرعی عدالتیں قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور شرعی عدالتوں نے اپنا کام بھی شروع کر دیا ہے. ہندی روزنامہ نو بھارت ٹائمس نئی دہلی نے اپنے غم و غصہ کا اظہار کرتے ہوئے ایک اداریہ میں اس پر سخت ناپسندیدگی دکھائی ہے اور روزنامہ پرتاپ نے بھارت سرکار سے فوری کارروائی کرنے کی مانگ کی ہے — ہمیں دکھ اس بات کا ہے کہ مسلمانوں کے معاملات پر اظہار خیال کرتے ہوئے ہندوستان کے سیانے سے سیانے دانشور، رہنما، مفکر ادیب و رائیٹر تک ایسی ایسی باتیں کر جاتے ہیں جسے دیکھ کر ان کی ناقص معلومات پر افسوس ہوتا ہے ہم ان پر تعصب و تنگ نظری کا تو الزام نہیں لگائیں گے کیونکہ ان کا عمل و کردار مسلمانوں سے متعلق سیکولرانہ دکھائی دیتا رہا ہے ۔ یہ دیکھ کر دکھ و افسوس اور بھی زیادہ ہوتا ہے جب کچھ مخصوص ذہنیت کے اور مسلمانوں سے خدا واسطے کا بیر رکھنے والے فرقہ پرست عناصر کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے وہ سیکولرزم کے متوالے بھی مسلمانوں کے مذہبی معاملات پر اظہار خیال کرتے ہوئے میدان میں کودتے دکھائی دیتے ہیں جن کے اوپر مسلمانوں کو بھروسہ اور ان کی شرافت، متانت، انصاف پر مبنی فطرت پر ہمیشہ ہی اعتماد رہا ہے ــــ مسلمانوں نے ہندوستان کے آئین کا ہمیشہ ہی ادب و احترام کیا ہے اور اس کو مذہب اسلام نے اسے سکھایا ہے اس کی تعلیم دی ہے کہ جس ملک میں بھی رہا جائے اس کے آئین کا احترام ہمیشہ ملحوظ رکھا جائے۔ بھارت کا آئین تمام ملک کے باشندوں کو مساوی حقوق کی ضمانت دیتا ہے۔ بھلا کون سر پھرا ہوگا جو اس آئین کے متبادل کوئی اپنی عدالت لگا کر بیٹھے گا جب بھارت کے ہر مسلمان کو اس بات کا اطمینان ہے کہ ہندوستان کی تمام عدالتیں ہر بھارتی کے

ہندوستان ... صورت [illegible] رہی تھی ۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے "دارالقضاء"
... کے مسلمانوں کے مذہبی معاملات حل کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے تو اس میں قباحت کیا ہے۔ مسلمان
... مسلمانوں کا مذہبی تنازعہ ہے تو ظاہر ہے کہ اگر دونوں مسلمان اپنے تنازعہ کو شرعی طریقے سے
... چاہتے ہیں تو اس میں کسی دیگر شخص کو اعتراض کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی۔ ہمیں یاد ہے کہ
... ہندوستان کی وزیراعظم آنجہانی اندرا گاندھی جگت گورو شنکراچاریہ کی قدم بوسی کی غرض سے
... سی مندر میں جانے کی خواہش مند تھیں تو انہیں یہ کہتے ہوئے اس مندر میں جانے کی اجازت نہیں دی گئی
... وہ ہندو نہیں ہے۔ اور اس مندر میں کسی غیر ہندو کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس وقت ایک چھوٹی
... اخبار کے علاوہ کسی نے بھی کچھ نہیں لکھا۔ اور ابھی ہری دوار میں ۲۔ اپریل ۱۹۹۴ء کو دھرم سنسد کے نام سے
جو چوکڑ جمائی گئی اور بھارت کے آئین کی کوئی پرواہ کئے بغیر جس طرح وزیراعظم ہند کو للکارتے، دھمکاتے
ہوئے ایودھیا میں رام مندر بنانے کے لئے سپریم کورٹ کے فیصلے کا انتظار کئے بغیر ہی ایکوائر شدہ
" رام جنم بھومی" کو رام جنم بھومی ٹرسٹ کے حوالے کرنے کے لئے دھرم سنسد نے الٹی میٹم دیدیا ہے اس پر
ہندوستان کا کوئی بھی باضمیر سیکولرزم کا شیدائی نہ چیخا کہ یہ کیا ہو رہا ہے کہ ہندوستان کی پارلیمنٹ کے
مساوی یہ دھرم سنسد کیا بلا ہے؟ تمام اردو، ہندی، انگریزی ہر زبان کے اخبارات نے اس دھرم سنسد
کے فیصلوں اور تجاویز کو اس طرح نمایاں طریقہ سے شائع کیا ہے کہ جیسے یہ ملک کے مفاد میں ایک بڑا اہم
کام ہے جبکہ یہ سراسر ملک کے آئین کے خلاف معاملہ ہے جب بابری مسجد کے سلسلے میں ملک کی عدالت
میں معاملہ زیر سماعت ہے اس وقت اس طرح کے فیصلے کیا عدالت کی توہین کے مترادف نہیں ہیں۔ اس
بات کو نظر انداز کر کے جس طرح آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے دارالقضاء کے قیام کے سلسلے میں فیصلوں
پر مذمت کی صورت میں اظہار خیال نہ صرف قابل مذمت ہے بلکہ اس ذہنیت کا گندہ نمونہ ہے جسے صرف
ایک ہی طرف کی برائی نظر آتی ہے اور "اپنی" طرف اسے سب کچھ اچھا ہی اچھا دکھائی دیتا ہے ـ مسلمانوں
کو اس گندی ذہنیت کو سمجھنا ہوگا اور اس کا پوری سنجیدگی اور صبر و استقلال و دانشمندی کے ساتھ
مقابلہ کرنا ہی ہوگا۔

حکومت پاکستان نے ڈاکٹر صادق حسین کی متنازعہ کتاب تحریک مجاہدین پر پابندی لگانے کا

فیصلہ کرکے بہت ہی قابل ستائش کام کیا ہے ۔ کیونکہ اس کتاب میں سکھ دھرم کے محترم گورو صاحبان کے بارے میں بڑی ہی قابل اعتراض باتیں شائع کی گئی تھیں۔ حکومت پاکستان نے اس کتاب کی ساری ہی کاپیاں ضبط کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کتاب سے دنیا بھر کے تمام سکھ بھائی بہت ہی بے چین اور غم و غصہ سے بھرے تھے۔ کئی سکھ تنظیموں اور افراد نے اس کے مصنف کے سر کو اڑانے والے کے لئے کروڑوں روپے کے انعامات کا بھی اعلان کر رکھا تھا جبکہ کتاب پر حکومت پاکستان کی پابندی کی خبر کے ساتھ یہ خبر بھی ہندی کا نو بھارت ٹائمس میں مرقوم ہے کہ اس کے مصنف کی کچھ برس پہلے وفات ہو چکی ہے۔

اس کتاب کی مذمت میں بھارت میں جگہ جگہ مظاہرے جلسے جلوس نکالے گئے پر جوش تقاریر بھی ہوئیں۔ مگر ہمیں اس غصہ کے ماحول میں سکھ قوم کے عظیم ہندوستانی رہنما جناب جتھیدار رچھپال سنگھ جی صدر آل انڈیا شرومنی اکالی دل (ماسٹر تارا سنگھ) کے کردار اور اعلیٰ انسانی اوصاف و عمل کی سراہنا کئے بغیر نہیں رہا جا رہا ہے کہ انہوں نے اس متنازعہ اور قابل مذمت کتاب پر احتجاج کرتے ہوئے جذبات کے ساتھ ہوش کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اسکو فرقہ پرستی کی نظر سے نہ دیکھتے ہوئے اسے ایک شخص کی کرتوت ہی کہا۔ اس کے خلاف احتجاج میں انہوں نے مسلمان بھائیوں کو بھی ساتھ لیکر اس کو فرقہ پرستی کا معاملہ نہ بننے دیا۔ اور اسے سکھ مسلم تعلقات میں کشیدگی کا بھی باعث بننے سے بچایا ۔ جناب جتھیدار رچھپال سنگھ جی نے اس کتاب کے خلاف پاکستانی سفارت خانہ کو ایک میمورنڈم دیتے ہوئے اس پر پابندی کا جائز مطالبہ کیا ہے اور ان کے اس صحیح اور جائز طریقۂ احتجاج ہی سے شائد متاثر ہوکر حکومت پاکستان نے اس پر پابندی لگا کر دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔

اسلام کسی بھی مذہب کو برا کہنے کی اجازت نہیں دیتا ہے قرآن پاک میں تاکید کی گئی ہے کہ کسی بھی مذہب کو برا کہنے کا حق نہیں ہے اگر تم کسی مذہب کو برا کہوگے اور جواب میں اس نے تمہارے مذہب پر کوئی دل آزار بات کہدی تو اس کے جواب دہ تم خود ہوگے۔ اس لئے وہ مسلمان ہی نہیں ہے جو کسی مذہب کو برا کہے اور کسی مذہبی مقتدر و قابل احترام ہستی کی شان میں کوئی نازیبا بات کہے۔ اسلام کی نظر میں ایسا شخص گناہگار ہے ۔ حکومت پاکستان نے بہت ہی اچھا کیا جو اس کتاب پر احتجاج ہوتے ہی جلد از جلد پابندی لگادی بھارت کے فرقہ پرست اور بابری مسجد کے ڈھانے والے متعصب لوگوں کے لئے بھی اس میں سبق کا پہلو موجود ہے کاش! ان میں عقل سلیم بھی موجود ہو!

قسط ۱

ادبی تنقید کیا ہے؟ (عربی ادب کے حوالے سے)

شاہد اسلم قاسمی، شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ، یوپی

ادبی تنقید انسانی زندگی کا ایک فطری فن ہے ہر انسان کو کچھ نہ کچھ ذوق عطا ہوا ہے اگرچہ ادراک وشعور کی قوتیں کم ہی ہوں لیکن اس چیز سے وہ ادب اور اس کے ذوق کو سمجھتا ہے اور اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ تنقید کا آغاز ابتداء ہی سے ہو گیا تھا وہ اپنے بچپن ہی سے ادب کے دوش بدوش چلتی رہی اور شاید سب سے پہلا ناقد سب سے اچھے شاعر کے فوراً بعد پایا گیا۔ خواہ اس کی تنقید سلبی ہی کیوں نہ ہو جو شعر سے صرف لطف اندوز ہونے تک ہی محدود ہو یا ایجابی ہو جو لطف اندوز ہونے میں تجاوز کر کے اس ردعمل کی تشریح اور غلط بیانی کرے۔

ادب اور نقد زندگی کی ناطق قدریں ہیں۔ ادب زندگی کے بطن سے رونما ہوتا ہے اور نقد ادب کی تہذیب اور حسن کاری میں حصہ لیتا ہے، وہ زندگی کے تجربات کو پرکھتا ہے اور ان قدروں کا تعین کرتا ہے جو تخلیق کو نور و نکہت اور وجدانی تاثرات کو سائنسی صداقت سے ہم آہنگ کرتی ہیں اس کی آواز کا جادو جب زندگی کے افق پر جلوہ ریز ہوتا ہے تو وہ حیات کے تاروں کو چھیڑ کر فضا میں نغمہ برسا دیتا ہے۔ اور عقل کو آداب جنوں سکھاتا ہے نقد نہ محض علمی صحیفہ ہے اور نہ بے ستون و کوہکن کی حکایات خونچکاں۔ وہ زندگی کو اصول تغیر اور لامتناہی سلسلے سے ہمکنار کرتا ہے۔ وہ ہئیت و معنی کا حسین امتزاج پیش کرتے ہوئے گردش دوراں کو لطافت صہبا اور انسان کو زندگی کی آخری صداقت کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔

نقد چند غیر مربوط قوانین کا نام نہیں۔ بلکہ نقد کی بنیاد اصول، ضابطہ اور فہم پر قائم ہے نقد کے اصولوں پر ادب پاروں کو پرکھنے کے بعد کچھ نتائج برآمد ہوتے ہیں، وہ ٹھیک ہیں یا نہیں، انفرادی یا اجتماعی ذوق نقد کا ادبی ستون اور ادب کو پرکھنے کی اولین کسوٹی ہے ادب کا فنی مرتبہ متعین کرنے اور ادب کی قدر و قیمت بیان کرنے کے متعلق، ادبی احکام اور فیصلے صادر کرنے کے لئے ذوق مرجع

نقد کا کام اس وقت شروع ہوتا ہے۔ جب ادب عالمِ تخلیق میں آجاتا ہے ادب پہلے وجود میں آتا ہے اور نقد انشاء ادب کے بعد اپنا فریضہ انجام دیتا ہے۔ نقد سے یہ بات خود بخود متصور ہوتی ہے کہ ادب بالفعل موجود ہے۔ نقد کے توسط سے ادب کو سمجھا جاتا ہے۔ اس کی تشریح کی جاتی ہے۔ اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس طرح ادب ترقی کرتا ہے اور نقد اپنے ملکۂ مہذبہ اور فطری جذبہ کی روشنی میں ادب کے بارے میں حکم صادر کرتا ہے۔ (۱)

نقد کو اس بات کی قدرت حاصل نہیں کہ وہ ادب کو عدم سے وجود میں لائے ادب تخلیق کرنا یا ادبی ذوق اور احساس کی چاشنی پیدا کرنا، نقد نہیں ہے نقد میں تخلیق کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ نقد ادب اور احساس کی چمک کو بڑھاتا ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ انشاء ادب، ادبی ذوق اور اس کی تنقید یہ تینوں ملکے فطری طور پر بیک وقت کسی ادیب میں پائے جا سکیں۔ نقد ادیب کے وجدان کو ٹٹولتا ہے۔ وہ ادیب کے ذاتی احوال و کوائف کو آئینہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ وہ ادیب کی طرح ستاروں پر کمند ڈالنے کے بجائے انگاروں سے دہکتی اور پنکھڑیوں سے مہکتی ہوئی ادیب کی زندگی کے اسباب و علل تلاش کرتا ہے۔ وہ ادیب کے ذہن کا مطالعہ کرتا ہے جہاں داخل کی گہرائیوں سے نکلنے والے ادب نے جگہ پائی ہے۔ وہ تاریخی ماہیت سے سوز دروں کی مطابقت کا اندازہ لگاتا ہے جس نے ادیب کے ذوق جمال کو استوار کیا اور قوت تاثیر کو نمو بخشی۔

نقد مادی ارتقاء اور تاریخ کا منضبط علم ہے۔ نقد معاشرتی حدوث و ارتقاء کی ایک تاریخ ہے وہ تخلیق کو جدلیاتی ماہیت اور فن کار کو خارجی اسباب و صور کے درمیان جہد و پیکار آمادہ کرتا ہے وہ فن کار کے ضمیر سے دوئی اور تضاد کو مٹاتا ہے وہ تاریخی جبریت کا شکار نہیں ہوتا اور اپنے اندر اجتماعی اور انفرادی ارادے کو یکساں طور سے کارفرما ہونے دیتا ہے۔

ادب ماحول اور شخصیت سے پیدا ہوتا ہے۔ نقد ادب کے افادی اور جمالیاتی پہلوؤں پر نگاہ ڈالتا ہے۔ وہ خیال کی پاکیزگی کے ساتھ اسلوب کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ نقد و فکر و فن

---

(۱) طبقات الشعراء۔ ابن سلام

[illegible] میں [illegible] زبان کے بارے میں شعرا، جمالیات، معانی، وزن اور اشارات
[illegible] کے لئے اظہار کرتے تھے۔ یہ تنقیدی نظریات اگرچہ منظم
[illegible] تھے۔ پھر یونان میں فلسفہ کے امام ایلیٹ" اور اوڈیسی کی
[illegible] تنقید تحقیق اور قدروں کی چھان بین کا ذریعہ بن گئی ساتھ ہی ساتھ انہوں نے
[illegible] رجحانات بھی کی۔ کیونکہ یونانیوں کے نزدیک شاعری کا مرتبہ بہت
بلند تھا۔

پانچویں صدی قبل مسیح جب منظوم ڈرامہ وجود میں آیا اور یونان کے دارالسلطنت ایتھنز
میں اس نے ایک مستقل حیثیت اختیار کر لی تو تنقید نے بھی ترقی کی۔ اب شعرا کے لئے اس بات کا
امکان پیدا ہوا کہ وہ اس جامع اور گہرے طریقے سے اختیار کریں چنانچہ تنقید کی وسعت اور اس
کے پہلوؤں پر گہری نظر ڈالنے کی گنجائش پیدا ہوئی۔

یونان کے متقدمین اور بعد میں ادبا کے درمیان پروان چڑھنے والی اس تنقید کے علاوہ
ایک دوسری قسم فلاسفہ کی تنقید تھی۔ جس نے نئے نئے گوشے کھولے۔ تنقید کی اس طرز رومان کا ادب
زندہ رہا اور اس نے قدیم عربی اور جدید یورپی ادب پر اپنے اثرات ڈالے یہ فلسفی طبقہ، معانی الفاظ
اور موضوع پر حاوی تھا۔ اس نے اپنی بحث و تفکر کا میدان" ایلیٹ" اور اوڈیسی کو بنایا
تھا۔ جب ان فلاسفہ نے دیکھا کہ ہومر اور اس کے ساتھی اپنے معبودوں کی تصویر اس طرح سے
کھینچتے ہیں جو عقل کے منافی ہے۔ تو ان کے ایک طبقے نے شعر سے انکار کر دیا اور دوسرا طبقہ ان
معبودوں کی مجازی تفسیر کرنے لگا کہ وہ خیالی تصور ہے جو خوبصورت فنی طریقے ہی سے سمجھے جانے چاہئیں۔
دونوں طبقوں میں سے کسی نے بھی شعر کے حسن سے انکار نہیں کیا جو تمام لوگوں کو مبہوت کر
دیتا ہے۔

پانچویں صدی میں جب سقراط کا ظہور ہوا تو ابتدا میں وہ سوفسطائی تھا۔ لیکن بعد میں
اس نے متضاد اشیاء کو ثابت کر کے اساتذہ کے منصب کو ختم کر ڈالا۔ اور بیان یا بلاغت یہ تعریف
کی کہ وہ حقائق کے اظہار کا فن ہے۔ اسی میں اس نے مشہور ڈائیلاگ کا راستہ اختیار کیا
اس کے بعد اس کا شاگرد افلاطون آیا جو فلسفہ میں مثال کے نظریہ کا حامل تھا۔ اس نے کہا کہ

ادب یا کلام ایسا فن نہیں ہے جس کو انسان خود بناتا ہو اور اس پر اعتماد کرتا بلکہ وہ وحی اور الہام ہے۔ پاکیزہ نفوس، حقائق اشیاء کا ادراک کر کے لوگوں کے سامنے شعر نثر یا فلسفہ کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ اور انسان کو اس چیز کے نقل کرنے کے لئے جو قدرت نے اس کے دل میں ڈالدی ہے۔ فن بیان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک کلام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو فطری جیسیں ہماری تدبیر کو دخل نہیں۔ اور وہ ہے نفس کی قوت اور اس کی صناعی جس کے ذریعہ وہ اخذ و کسب کر سکے۔ دوسری قسم کسبی فن بیان ہے جسکو متکلم (ادیب وغیرہ) قارئین و سامعین کے نفوس کے مطابق وجود میں لاتا ہے۔ اس کے نزدیک نقد ادبی، نفوس کی فطرت اور اس کے احوال و صلاحیتوں کا علم پھر اس کے اور کلام بلیغ کے درمیان تطابق پیدا کرتا ہے۔ (۱)

چوتھی صدی قبل مسیح میں ارسطو کا ظہور ہوتا ہے اس نے پہلے تو تمام فلسفیوں، شعراء اور لغویین کا بغور مطالعہ کیا، ہر چیز کو ہضم کیا اور اس کو مثال کے انداز میں پیش کیا اور اس کی تکمیل کی ان سب کاموں کے بعد اصول بلاغت و نقد میں معرکۃ الآراء تصنیف "خطابت و شعر" پیش کی یہ کتاب بجا طور پر تمام ترقی یافتہ درسگاہوں میں نقد و بلاغت کے تمام مطالعات کا مرجع اول شمار کیجاتی ہے۔

عربی ادب میں تنقید کا ارتقاء!

اسی طرح کی بات عربی ادب کی تاریخ میں ادبی تنقید کے فروغ کے سلسلے میں کی جاتی ہے۔ عہد جاہلی میں اس کا دار و مدار شعر و شعراء کے تبصرہ پر تھا۔ اور سادہ فطری ذوق پر منحصر تھی اور یہ چیز شعراء کے آپسی مقابلوں اور انکا بازاروں، بادشاہوں اور رؤسا کی محفل میں جمع ہونے اور شاعر قبیلوں کی عصبیت اور بدوی زندگی میں شاعر اور اس کے کلام کی اہمیت کی وجہ سے ممکن ہوئی۔ یہ سب باتیں ایک طرف تو شعر کی عمدگی کا سبب اور دوسری طرف شعراء کی تنقید اور انکا نقص نکلنے کا سبب ثابت ہوئیں۔ یہ تنقید مفرد اور جملے کے لفظ و معنی پر مشتمل ہے۔ اور اس کا

(۱) طہٰ حسین من محاضرات فی تاریخ البلاغۃ

دار و مدار ذاتی تاثرات اور ردعمل پر تھا۔ اسمیں کوئی مقررہ قوانین نہیں تھے جن کی شرح و تجزیہ کرنے کے لئے نقاد متوجہ ہوئے۔ اس تنقید کی انتہا شعر کی اہمیت اور شاعر کے ساتھیوں میں اس کے مقام پر ہوتی تھی۔ (۱)

اس دور کے ایسے راوی بھی پائے جاتے ہیں۔ جو شعراء سے اخذ کرتے اور ان کے بارے میں جانبداری کا اظہار کرتے۔ جیسا کہ زہیر و نابغہ کے یہاں واضح شعری مسالک تھے۔ یہ حال ظہور اسلام تک باقی رہا۔ ظہور اسلام سے نئی شاعری کو ترقی حاصل ہوئی۔ اور شعراء نے اس کے لئے دین کے ارد گرد جھگڑنا شروع کردیا کوئی اس کا حامی اور داعی تھا اور کوئی اس کا مخالف اور اس سے جنگ پر آمادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ ایسی شاعری کو پسند فرماتے تھے جو اخلاق فاضلہ اور اسلامی تعلیمات پر مشتمل ہوتی اور شاید عمر بن الخطابؓ کی اور زہیر بن ابی سلمیٰ کی شاعری پر تنقید ایجابی نقد کی مثال ہے۔ جو تفسیر و تجزیہ پر قائم ہے چنانچہ آپ نے فرمایا کہ اسکے کلام میں الہام ہیا ہے وہ مانوس الفاظ سے پرہیز کرتا ہے اور اس نے اپنے ممدوح کی وہی تعریف کی ہے جو اس میں موجود تھے۔

پہلی صدی ہجری جب آگے بڑھی تو شعر کی ترقی میں اضافہ ہوا۔ ماحول اور شعری و سیاسی مسالک مختلف ہوگئے جاہلی اور دیگر قسم کی عصبیات نے پھر سے جنم لیا۔ جس کے نتیجے میں نقد ادبی کو تقویت حاصل ہوئی اور اس نے شعر کے تمام عناصر کا احاطہ کرلیا۔ شعراء کے درمیان موازنہ ہونے لگا اور انکو طبقات میں تقسیم کیا جانے لگا۔ (۲)

یہ تنقید۔ جاہلی تنقید کی توسیع تھی۔ کیونکہ ادباء کے درمیان ان کا انحصار ذاتی صلاحیتوں پر تھا۔ اس قسم کی تنقید بڑے بڑے شعراء مثلاً جریر، فرزدق، اخطل، ذوالرمہ اور بدوی و حضری غزل گو شعراء جیسے جمیل، کثیر، نصیب اور عمر بن ربیعہ اور مختلف سیاسی طبقوں کے شعراء کے ارد گرد گھومتی رہی۔ اس نوع فنی کے ساتھ ساتھ ایک دوسری نحوی و لغوی تنقید کا وجود ہوا۔ جس کو بصرہ و کوفہ کے علم و لغت کے علماء لیکر اٹھے تھے۔ اس قسم کی تنقید کی بنیاد ادب اور اصول نحو و لغت

---

(۱) وقد نعص الاستاذ منه و مقاییس النقد الا فی رسالته تیارات النقد الادبی الرابع

(۲) راجع : احمد امین ۔ ضحی الاسلام ۔

کے علماء لیکر اٹھے تھے۔ اس قسم کی تنقید کی بنیاد ادب اور اصول نحو و لغت و عروض کے درمیان تو
پر تھی۔ اگرچہ علماء اپنی تنقید میں ذوقِ فنی سے مطلق طور پر دستبردار نہیں ہوتے نقد میں وسعت
پیدا ہو گئی تو اس کے کئی پہلو رونما ہو گئے مثلاً ایک طرف شاعر اور اس کی شاعری کے درمیان
تعلق کو پیش نظر رکھنا چنانچہ عدی بن زید شہری زندگی اور وہاں کے لوگوں کے ملنے جلنے سے متا
ہوا تھا جس سے اس کو لغوی وضاحت اور شعری ملکہ حاصل ہوا۔ ابن قیس الرقیات جو نہ فصیح تھا اور
نہ قابل اعتماد اس نے فوج کو تکریت کے مقام پر شراب نوشی میں مشغول رکھا۔ اس کا ایک پہلو وہ ہے
جو اصمعی نے زمانۂ اسلام میں حضرت حسان بن ثابت کی شاعری کی کمزوری کے بارے میں کہا ہے
کیونکہ شاعری خواہشات اور برائیوں پر قائم ہے، چنانچہ وہ جزء اسلام میں داخل ہوا تو کمزور
پڑ گیا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ شاعری اجتماعی زندگی کی بازگشت ہے اس کا ایک پہلو وہ بھی ہے
جس پر تبدیلی کے عوامل کو کون زیادہ قبول کرتا ہے۔ اور تجدید کے اسباب کو کون جلدی تسلیم
کرتا ہے۔ شعر یا نثر اس بات کا جواب دینے سے پہلے ہم کو اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ علم کی
بہ نسبت ادب میں تبدیلی بہت آہستہ ہوتی ہے۔ ان کو تبدیل کرنے اور تصویر و تعبیر کی نئی خصوصیات
پیدا کرنے کے لئے مختلف تجربات اور ایک طویل زمانہ درکار ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی تبدیلی
میں چھلانگ نہیں ہوتی۔ لیکن علم میں یہ تبدیلی بہت تیزی سے واقع ہوتی ہے۔ وہ ماضی کی تقلید
چھوڑ دیتا ہے دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں۔ فن کے دائرہ میں نثر ادب میں اپنے زمانوں کو
سب سے واضح مثال بھی پیش کرتی ہے۔

ان میں سے ایک یہ کہ نثر دراصل عقل کی زبان ہوتی ہے جو عقلی نظریات کو مقرر کرتی ہے
اور اس کے نتائج کو محفوظ رکھتی ہے۔ لیکن شعر اکثر جذبہ کی زبان ہوتا ہے جسکو وہ ابھارتا ہے
اور جس کی تصویر کشی کرتا ہے۔ عقل ترقی کے عوامل بہت تیزی سے قبول کرتی ہے کیونکہ وہ نظری
فکر ہے۔ رسم رواج اور تقاریب کی پابندی نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف جذبہ جسکو فطری اور
اجتماعی تقالید اپنی جانب مائل کرتی رہتی ہیں اور اس کی رفتار کو سست بھی کرتی رہی ہیں اور
اس کے نتائج ادب، موسیقی اور مجسمہ سازی کو قوم کی شخصیت پر زیادہ دلالت کرنے والی
بتاتی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نثر جو عقل کی زبان ہوتی ہے، شعر سے زیادہ جلدی تبدیل

ہو جاتی ہے اور اس کے تاریخی ادوار شاعری کے ادوار سے مختلف ہوتے ہیں۔

دوسری چیز یہ کہ فن کے دائرے میں شعر کا دخل نثر سے زیادہ ہے اور فن بڑی حد تک ماضی پر قائم ہوتا ہے، وہ ماضی کے نمونوں سے متاثر ہوتا ہے اور اس کے آثار کی نمائندگی کرتا ہے۔ برخلاف علم کے۔ کیونکہ وہ اپنے موضوعات موجودہ واقعات سے اخذ کرتا ہے۔ اور ماضی سے اس کا تعلق صرف تسلسل کا ہوتا ہے۔ اور شعر ماضی کی جانب سے متوجہ ہوتا ہے اور نثر مستقبل کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ یہ جز نثر کو چند قدم آگے بڑھا دیتی ہے جبکہ شاعری ایک جگہ پر رک جاتی ہے۔ اس کے اوزان زیادہ تر مقرر ہیں۔ اس کی خیالی صورتیں بہت کم بدلتی ہیں قصیدہ ایک جیسا رہتا ہے۔ عبارتوں میں اکثر اوقات جمود پیدا ہو جاتا ہے۔ انہیں امور میں سے ایک جز یہ ہے کہ شعر کی فنی صورت، شعراء کے نفوس میں سست رفتاری کی بنا پر بہت آہستہ آہستہ بدلتی رہتی ہے لیکن نثر کے اسالیب میں چونکہ تصرف کی آزادی ہے اس لئے ادبی تاریخ میں نثر نگاری کی عبارات و شخصیات میں اختلاف نہیں کئے گئے۔ لیکن شعراء تقلید و تدبیر کے دائروں میں مقید ہیں۔

ایک بات یہ ہے کہ شعراء اپنی فنی صلاحیتوں پر فخر کرنے کی وجہ سے تعلیم پر اتنی توجہ نہیں دیتے، جتنی انشار پرداز دیتے ہیں۔ موجودہ زندگی سے متعلق ہر نیکی کیوجہ سے ثقافت سے زیادہ قریب ہیں۔

یہ جز انشار پردازوں کو زندگی سے بہت زیادہ قریب اور فنی جمہوریت کیطرف زیادہ مائل کردیتی ہے۔ لیکن شعراء فنی اور نفسی بالادستی کے سامنے جھک جاتے ہیں جو ان کو واقعات کے ساتھ تیزی سے قدم ملاکر چلنے سے روکتی ہے۔ اسی وجہ سے تعلیم یافتہ شعراء ابوتمام، متنبی، معری وغیرہ نے شعر میں تجدید اور ستونوں سے تجاوز کرنے کی کوشش کی۔ جن سے قدامت پسند چپٹے ہوئے تھے۔

نقد کے لغوی اور اصلاحی معنی اور اس کا موضوع :

محیط" لسان العرب" اور ان کے علاوہ دوسری لغات میں النقد والتنقاد والانتقاد"

دراہم کے پرکھنے اور ان میں سے کھوٹے سکوں کو نکال کر الگ کرنے کے معنی میں آتا ہے اور
"مصباح اللغات" میں انتقد الدراهم نقد وصول کرنے اور کھوٹے کو الگ کرنے کے معنی میں آتا ہے
مشہور عالم "سیبویہ" کا ایک شعر ہے جو اس نے اونٹنی کی تعریف میں کہا ہے۔

تنفی یداها الحصی فی کل هاجرة

نفی الدراهم تنقاد الصیاریف

اس کے ہاتھ پتھریلے میدان کو الگ کر دیتے ہیں۔ جس طرح کہ ماہر صراف دراہم میں اچھے سے برے اور کھوٹے دراہم کو الگ کر دیتا ہے۔

نقدت الدراهم وانتقدتها ای اخرجتها منها الزیف" یعنی میں نے دراہم کو جانچا اور اس میں جو کھوٹ تھی اسکو نکال دیا۔

اس طرح سے یہ پہلا لغوی معنی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ "نقد سے مراد اچھے اور برے یعنی کھرے اور کھوٹے دراہم و دینار کے درمیان تمیز کرنا ہے اور یہ بات فہم و فراست اور موازنہ کی صلاحیت یعنی پرکھ نیا اور عمدہ تجربے کے ساتھ ساتھ پختہ فیصلہ اور ارادہ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

دوسرا لغوی معنی بھی اسی کی دلیل ہے جیسے نقدت راسه باصبعی (اذا ضربته) یعنی میں نے اس کے سر کو انگلی سے مار کر دیکھا۔ اور نقدت الجوزة انقدها (اذا ضربتها) یعنی میں نے اخروٹ کو توڑ کر اس میں سے اس کی گری کو نکالا۔

اس بات کی وضاحت ہمیں حضرت ابو درداءؓ کی اس حدیث میں بھی ملتی ہے۔" ان نقدت الناس نقدوك وان ترکتهم ترکوك " یعنی اگر تم لوگوں کے ساتھ عیب جوئی اور غیبت کے ساتھ پیش آؤ گے تو وہ بھی تمہارے ساتھ ویسا ہی سلوک کریں گے" اس حدیث میں لفظ نقد" کے معنی عیب لگانا، کسی کو برا بھلا کہنا۔ اور کسی کے اوپر کیچڑ اچھالنا یا اس کے دامن کو داغدار کرنا ہے اور یہ اطراد یعنی کسی غیر معمولی یا بالمبالغہ تعریف کرنے اور تقریظ، یعنی کسی کے صرف محاسن اور خوبیوں کو ہی بیان کرنے کی ضد ہے۔

تقریظ، قرظ الجلد، سے مشتق ہے جس کے معنی کھال کو ...

ادیم مقروظا" اس چمڑے کو کہتے ہیں جو پکا اور لگا ہوا ہو، اور یہ لفظ یعنی تقریظ صرف حسن و جمال کے لئے خاص ہے۔ اسی لئے ہم کہیں گے کہ نقد ذم کے لئے مستعمل ہے اور تقریظ مدح و ثنا کیلئے۔

ان کے علاوہ اس مادہ " نقد " کے بہت معانی ہیں جن کے لئے یہ استعمال ہوتا ہے جیسے نقد فلانا و نقد ن ثمن نقد ادا کرنا۔ نقدہ درھما۔ دینار پرکھنا۔ الغرض یہ وہ تمام اہم معانی ہیں جن کو اہل لغات نے " نقد " کے مادہ سے مراد لیا ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ ایک اور اہم معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے وہ یہ کہ ادبار، علماء اور اہل فن حضرات کے نقائص کو واضح اور ظاہر کرنا۔ ان کی غلطیوں کی نشاندہی کرنا اور تشہیر یا تعلیم کی غرض سے ان کی تشریح واشاعت کرنا۔ یہ معنی ہمارے موجودہ زمانہ میں بہت عام ہو گیا ہے۔ اور جب کہ " نقد " بولا جاتا ہے تو اس سے کسی بات پر گرفت کرنا۔ اس کے عیوب کو عام کرنا اور ان کے مآخذ کو معلوم کرنا بھی مقصود ہوتا ہے۔

ابو عبداللہ محمد بن عمران المرزبانی (م ۳۸۴ھ) کی قدیم تصنیف "کتاب الموشح" میں علماء نے شعراء پر جو گرفت کی ہے تحریر ہے۔ اور اس کے علاوہ اس نے شعراء سابقین پر جو عیوب لفظی، معنوی، وزن و قافیہ، نحو و عروض اور بیان کے قوانین کے غیر مالوف یعنی خلاف قاعدہ ہونے کے سلسلے میں لگائے گئے ہیں۔ ان کی تضمین بھی کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے دور میں کتب، اشخاص، سیاسی اور اجتماعی مذاہب اور فنی نمونوں کی تعریف و تحسین شروع ہو گئی۔ جس کا اکثر حصہ محض دکھاوا ہے اور اگر سچ کہا جائے تو اس کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے۔

(باقی آئندہ)

علی محمود طٰہٰ ـــــ حسو مات

آخری قسط

ابوسفیان اصلاحی، علی گڑھ

(۶) "الشوق العائد" یہ دیوان ۱۹۴۵ء میں منظر عام پر آیا۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے یورپ کے بعض شہروں سے متعلق اپنے مشاہدات کو اس میں بیان کیا۔ "جزیرۃ العاشق" کے نام سے اس نے اٹلی کے "جزیرۂ کابری" پر ایک قصیدہ منظوم کیا۔ برلن جانے کے بعد اس نے "بین الحرب والسحب" کے نام سے ایک قصیدہ کہا جس میں شکست خوردہ مسولینی کی حوصلہ افزائی ہے۔ یہ قصیدہ ۱۹۴۴ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میں اس نے اپنی آسائش حیات اور لذائذ زندگی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

حیاتی قصۃ بدات بکاس　　لہا غنیت و امرأۃ جمیلۃ (۱)

یہ دیوان درج ذیل خصوصیات پر مبنی ہے۔

(۱) اس میں اس نے "الملاح التائہ" کی طرح اپنے تشدد آمیز احساسات کو پیش کیا ہے۔ قصیدہ "الشوق العائد" میں کہتا ہے۔

اھدئی یا نوازع الشوق فی قلبی فلن تملکی لما مضی رجوعا

آہ ھیھات أن یعود و لو أفنیت عمری تحرقا و ولوعا

آہ ھیھات أن یعود و لو ذوبت قلبی صبابۃ و دموعا

فاھدئی الآن یا لثورتک الھوجاء جبارۃ تدک الضلوعا (۲)

(۲) وہ نظریۂ ارتقاء کا قائل تھا۔ اس کے خیال میں انسان ابتداءً بندر تھا۔ (۳) اور ارتقائی

---

(۱) الادب العربی المعاصر فی مصر ص: ۱۶۷

(۲) علی محمود طٰہٰ شعر و دراسہ ص: ۳۶۳

(۳) نظریۂ ارتقاء کا اصل محقق "ڈاروِن" ہے۔ بہت سے محققین دلائل کی روشنی میں اس نظریہ کو رد کر چکے ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی اپنی کتاب "رسائل و مسائل" (ص ۴۰ / ۵۴) مرور ی ۱۹۸۳ء مرکزی مکتبہ اسلامی میں بحث کرتے ہوئے اس نظریہ کی تردید کی۔

ازل سے گذرتے ہوئے انسان کی شکل میں آیا۔ قصیدہ "ثمرۃ الالہۃ" میں کہتا ہے۔

ماأراها اخطأت فی وھمنا　　عالم الغابۃ أو مھد الحدود
وأراها خلقۃ فی دمنا　　یوم کنا بعض اصنام القرود
حدثنا الاعمی علی کبرتہ　　لم تشتہ نظرۃ المنتقص
ھو ما زال علی فطرتہ　　ضاحکاً خلف حدید القفص (۱)

(۷) "شرق وغرب" ۱۹۴۷ء میں یہ دیوان منصۂ شہود پر آیا۔ اس کے عنوان سے اس کے مضامین کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس میں اس نے اپنے مغرب و مشرق کے مشاہدات کو قلمبند کیا۔ پہلے حصہ میں یونانی خیالات اور یورپ کے ان واقعات کا ذکر کیا ہے جو درمیان سفر پیش آئے۔ آغاز ایک ایسے قصیدے سے کیا جس میں ایک لڑکی کا ذکر ہے جسے اس نے ایک تقریب میں دیکھا تھا۔ بارہا اس کے ساتھ تفریح بھی کی۔ اس کا اس کی شاعری پر بڑا گہرا اثر رہا۔ انھیں احساسات کو اس نے شعری جامہ پہنایا۔ اشعار میں دلی جذبات واحساسات نمایاں ہیں۔

دوسرے حصہ میں مشرق کے سیاسی واقعات۔ ملک کی صورتحال اور عرب ممالک پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس دیوان کے منظر عام پر آنے سے قبل اس کا بیشتر وقت پردیس میں گذرا۔ قصیدہ "طارق" اس نے پردیس ہی میں لکھا۔ اس کے دو قصیدے "الاسلامیہ" اور "العربیہ" میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ہاں اتنا ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا مشرق سے اٹوٹ رشتہ تھا۔ مصر اور یورپ میں جو کچھ اس نے قدرت کے عجائب دیکھے انھیں بھی اس میں پیش کیا۔ اس میں اپنے وطن عربی اور اسلامی تحریکوں کی بھی عکاسی کی۔ فلسطین۔ فوزی القاوقجی اور عبدالکریم (جو عرب کے ایک عظیم لیڈر تھے) پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ انڈونیشیا پر بھی اشعار ملیں گے۔ اس میں سب سے شاندار قصیدہ "مصر" ہے۔ جس میں مصر کی سیاسی پارٹیوں اور اس کی خرابیوں کی طرف اشارہ موجود ہے۔ اس میں ان کے موسسین پر بھی اظہار خیال کیا گیا۔ وہ کہتا ہے۔ (۲)

---

(۱) علی محمود طہ شعر و دراسۃ ص: ۱۳۰

(۲) الادب العربی المعاصر فی مصر ص: ۱۶۸

أحقا ما يقال اشيوخ جيل — على احقارهم فيه اكبوا؟
وكانوا الامس ارسخ من جبال — اذا ما زلزلت قمم وهضب؟
فما لهم وهت منهم حلوم — لها بيدى الهوى رفع وجذب؟ (۱)

علی محمود طٰہ نے پہلے حصے کا نام "اصداء من الغرب" اور دوسرے کا "اصداء من الشرق" رکھا ہے۔ مجموعی حیثیت سے دیوان لائق تعریف ہے۔

اس میں اس نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ وہ کیوں شہوات زندگی میں مبتلا ہوگیا اور کیوں اس کا تغزل کی طرف رجحان زیادہ رہا۔ اپنے قصیدہ "فلسفہ وخیال" میں ان چیزوں کی عکاسی کی۔ اس میں اس نے ایک خاتون کے سوالات کے جوابات دیتے ہوئے یہ بات بتائیں۔

قلت يا فتنة الصبا حفلت — دنياك بالحب والمنى والاغانى
ما أثارت حرارة الجسد — المشتاق الا مرارة الحرمان
ان أجسادنا معابر أرواح — الى كل رائع فتان
أنا اهوى روحية العالم — المنظور لكن بالجسم والجدان (۲)

قسم اول کے پڑھنے سے ہی اندازہ ہوا کہ وہ مایوسیوں کی پہنچ سے بہت دور تھا۔
دوسری قسم درج ذیل چیزوں پر مشتمل ہے۔

(۱) اس میں سامراج کے غلط دعوؤں اور ان کی حرص وآز کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ان کی نظریں پٹرول پر ٹکی ہوئی ہیں۔ پٹرول اور ریتیل پر قبضہ جمانا چاہتے ہیں۔ مشرق کو اپنا جنگی اڈہ بنانے کے لئے سوچ رہے ہیں۔ اسے اپنی تجارتی اور جنگی منڈی بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ مشرق پر ہر طرح سے اپنا تسلط قائم کرنے کے درپے ہیں۔ (۳) ان تمام چیزوں پر قصیدہ "من الاعماق" میں روشنی ڈالی ہے۔

---

(۱) علی محمود طٰہ شعر ودراسہ ص: ۶۷
(۲) " " " " ص: ۵۶۳
(۳) علی محمود طٰہ حیاتہ وشعرہ ص: ۱۳۱

قالوا هوالحق مانسعس لنصرته   يابوسه كم هوان اُهله ساموا
ياشرق ياشرق لا تخدعك دموعهم   واقبض يداً فحديث الحق اوهام
أكان غير عيون الزيت واقفة   من قلبك الغض يجريهن سجام (۱)

(۲) اس کے یہاں عرب قومیت سے بڑا گہرا رشتہ ہے۔ وہ عرب نظریات و خیالات اور تہذیب تمدن پر اسے پورا یقین تھا۔ عرب قومیت کی دعوت بھی دی۔ اس کی شاعری میں جا بجا عرب قومیت وران کے خیالات کا ذکر ملے گا۔ اس کے اہم قصائد" ابنار الشرق" "یوم فلسطین" اور "من الاعماق" ہیں۔

(۳) اس نے یہ بھی کہا ہے کہ عربوں کا اتحاد ناممکن ہے۔ ان کی کوئی مؤثر و مستحکم سلطنت کا قیام بھی ناممکن ہے۔ "قصیدہ" لقاء دعار" میں کہتا ہے۔

أتقنع من حق و" جامعة " له   بجمع بيديد الرأى حول خوان
وليس لها من قوة غير ألسن   وأقلام كتاب و سحر بيان
وماذا يفيد الرأى لا سيف عنده   وماذا يعسيب القول يوم طعتان (۲)

(۸) "ارواح شاردة" یہ شعری مجموعہ نہیں ہے۔ کتاب ہے۔ جس میں انگریزی اور فرانسیسی کے مترجم مضامین شامل ہیں۔ فریس اور بودلیر کے اثرات نمایاں ہیں۔ یہ دونوں فرانسیسی شاعر ہیں انگریزی اور فرانسیسی کے بے شمار قصائد کا اس نے ترجمہ کیا۔

۱۹۴۱ء میں یہ کتاب منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب شاید اس نے اس لئے تالیف کیا کہ ان لوگوں کا جواب دے سکے جو مغربی تہذیب پر طنز و تعریض کرتے رہتے ہیں۔ (۳)

" النيل ":

علی محمود طٰہٰ نے نیل کا ذکر بھی بڑی شان و شوکت اور ذوق و شوق سے کیا۔ درج ذیل

---

(۱) على محمود طٰه شعر و دراسة ص: ۲۵۰
(۲) على محمود طٰه حياته وشعره ص: ۱۳۲
(۳) الادب العربى المعاصر فى مصر ص: ۱۶۷

قصائد" الروبی الخضر" "الفتی الاسمر" "البنور الابیض" "الظلال ذات الاضواء" "العات" اور "الزورق الحالم ذی التہاویل" میں نیل کی عظمت اوراس کے تاریخی پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔

اس نے نیل پر جو قصائد کہے ان میں وہ گہرائی اور وسعت نہیں جو کہ شوقی کے یہاں موجود ہے۔ ان قصائد میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی کہ جن کی بنار پر اسے امتیاز حاصل ہوسکے۔ جس طرح کہ "کیلو باترا" پر اظہار خیال ایک نئے انداز میں کیا ہے۔ ان قصائد میں ان تمام واقعات اور تاریخی پہلوؤں کا استقصار نہیں ملتا جو کہ نیل سے والبستہ ہیں۔ (۱) وہ اپنے قصیدہ "علی النیل" میں گویا ہے۔

أخی! ان وردت النیل قبل وردی   فحی زمامی عندہ وعہودی

وقبل تری فیہ امتزجنا ابوۃ   ونسلمہ لابن لنا وحفید

أخی! ان أذان الفجر بیت صوتہ   سمعت لتکبیری ووقع سجودی (۲)

ختم شد

---

(۱) النیل فی الادب المصری ڈاکٹر نعمات احمد فواد۔ مطبع دار المعارف مصر۔ سنہ ۱۹۶۲ء ص: ۳۵۱۔

(۲) علی محمود طہ شعر و دراسۃ ص: ۱۹۷

قسط ۹

عہدِ مغلیہ یورپی سیاحوں کی نظر میں

(۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۷ء)

ڈاکٹر محمد عمر، شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

آگرہ میں غریبوں کے مکان!

آگرہ میں بیشتر مکانات گھاس پھونس کے بنے ہوئے تھے۔ اگر ان کی اچھی طرح سے نگرانی نہ کی جاتی تو وہ سال میں ایک یا دو بار جل جایا کرتے تھے

(۷) متفرقات

عیسائیوں سے جہانگیر کی دلچسپی!

ایک مرتبہ بادشاہ شکار کھیل کر واپس آ رہا تھا۔ جورڈین اور دوسرے انگریز ہجوم میں ایسے ایک مقام پر کھڑے ہوئے تھے جہاں وہ انہیں دیکھ سکتا تھا۔ جب شہنشاہ کی ان پر نظر پڑی اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ لوگ عیسائی تھے تو اس نے اپنا ہاتھی روک لیا۔ وہ لوگ اس کے قریب آ گئے۔ جب وہ لوگ اس کے قریب پہونچے تو اس نے ان سے پوچھا "کیا ہم لوگ اس سے کوئی شکایت کرنا چاہتے تھے"؛ انہوں نے نفی میں جواب دیا کہ انہیں اس کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہے وہاں وہ شہر میں محض اس کی واپسی کا خیر مقدم کرنے کے لئے کھڑے تھے۔ اس نے اپنا سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔

ہندوستان ایک آزاد ملک!

ایک مرتبہ جورڈین کو بادشاہ کی خدمت میں حاضر کیا گیا۔ اس نے اس سے یہ درخواست کی کہ وہ انہیں (انگریزوں کو) اپنے ملک واپس جانے کی اجازت دیدے۔ اس نے یہ بھی التجا

ہ وہ ان پر اتنی اور عنایت کرے کہ انھیں پروانۂ راہداری بھی عطا کردے تاکہ کھمبایت کے راستے سے سورت جانے میں انھیں آسانی ہو جائے۔ اس نے جواب دیا کہ "سفر کرنے کے لئے اس کا پروانہ غیر ضروری ہے کیونکہ اس کا ملک تمام لوگوں کے لئے ایک آزاد ملک ہے۔" پھر بھی چونکہ انہوں نے درخواست کی تھی انھیں پروانہ عطا کر دیا گیا۔

ہاکنس کی تذلیل کے وجوہ:

ہاکنس کی تذلیل کے تین وجوہ تھے۔ اول، مقرب خاں کا قرض۔ اس بات سے بادشاہ کو مطلع کیا گیا جس نے رقم کی ادائیگی کا حکم دیا۔ مقرب خاں کچھ کم رقم دینا چاہتا تھا اور ہاکنس نے اس بات پر اصرار کیا کہ پوری رقم ادا کی جائے۔ غصّے میں آکر ہاکنس نے بادشاہ سے شکایت کرنے کی دھمکی دی۔ ابوالحسن نے اسے ایسا نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ ہاکنس نے اس مشورہ کو نظر انداز کر دیا اور جہانگیر کی خدمت میں پورا معاملہ پیش کر دیا۔ بادشاہ نے ابوالحسن کو حکم دیا کہ وہ یہ بات دیکھے کہ وہ رقم ادا کر دی جائے۔ قرض تو ادا کر دیا گیا لیکن اس طرح ابوالحسن کی جو مخالفت مول لے لی گئی وہ ایک انگریز کے لئے بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی کیونکہ وہ ایک مغل منصبدار بھی تھا۔

دوم، جہانگیر کو یہ بات بتائی گئی کہ اس کے امرا شراب پی کر دربار میں آتے تھے۔ اس نے ان سب کو جو شراب پیئے ہوئے تھے دربار میں آنے سے روک دیا۔ لیکن ہاکنس ایسی ہی حالت میں دربار میں حاضر ہوا۔ دربانوں کے افسرِ اعلیٰ نے اس کا منہ سونگھا۔ اسے فوراً دربارِ عام میں بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

یہ سوچ کر کہ وہ ایک مسافر تھا جہانگیر نے اسے واپس گھر جانے کا حکم دیا اور شراب پیئے ہوئے دربار میں آنے سے منع کیا۔" چونکہ عوام کے سامنے اس کی تذلیل ہوئی تھی اس لیے بادشاہ کے قریب مقررہ مقام پر آنے کے لیے اسے مجبور نہ کیا جا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اکثر و بیشتر دربار میں نہیں جاتا تھا۔"

سوم، بیانہ میں نیل کا ساری نیل کے خریدنے اور مادر شاہ کا اس کے خلاف احتجاج بھی ہاکنس کی عزت کو بڑی حد تک متاثر کیا تھا۔ جورڈین نے مزید لکھا ہے کہ: "جب تک ہاکنس

مورد الطاف تھا، تمام لوگ انگریزوں کی سرپرستی کرتے تھے۔ لیکن جس وقت سے وہ اپنی حماقت سے معتوب ہوا ہماری قدر اچھی نہ رہی جیسا کہ اس کے بعد ظہور پذیر ہوا۔

(۴) نکولس ڈاونٹن (۱۶۰۸ء تا ۱۶۱۵ء)

سوانح عمری:

اس کی ولادت اور والدین کے بارے میں بہت معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس کی وصیت نامہ کی بنیاد پر ولیم فوسٹر نے اس کی ولادت کی تقریباً صحیح تاریخ مقرر کی ہے، جو اس کے اندازے کے مطابق ۱۵۶۱ء کے اوائل میں بشلی نامی ایک گاؤں میں ہوئی تھی جو ٹوکس بری کے شمال مغرب میں دو کوس کی دوری پر واقع تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت کا زمانہ بھی تاریکی میں ہے۔

گوسپورٹ میں اس نے سکونت اختیار کرلی تھی اور وہیں اسکی شادی ہوئی تھی۔ ۱۶۱۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں اسے ملازمت مل گئی تھی۔ کمبرلینڈ کے ارل کی قیادت میں ازورس پر حملے کے موقع پر وہ سیمپسن کا کمانڈر رہا۔ (۱۵۹۴ء) ۱۶۱۰ء میں پیپر کورن کے کیپٹن کی حیثیت سے وہ مشرق کی سمت گیا۔ اپنی بہادری، لیاقت اور ایمانداری کیوجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاز کے افسروں اور لوگوں میں ہر دلعزیز تھا۔ اس نسل میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں کوئی ایسا ملازم نہیں تھا جو دیانت داری، بے لوث فرض کی ادائیگی میں اس سے سبقت لے جاتا۔

اس کے بعد ہندوستان کے لیے روانہ ہونے والے جہازی بیڑے کا اسے جنرل مقرر کیا گیا مغل شہنشاہ اور ارجن کے بادشاہوں کے نام جیمس بادشاہ کی طرف سے اسے خطوط دیئے گئے ۲۰ فروری ۱۶۱۴ء کو اس کا جہازی بیڑہ گریبھ سینڈ سے روانہ ہوا۔ کیپ کے چاروں طرف کے بحری سفر میں قریب چھ ماہ لگ گئے۔ ڈبھول کے قریب واقع ایک مقام پر وہ ہندوستانی ساحل پر پہنچا۔ (۲ اکتوبر ۱۶۱۴ء) دھیرے دھیرے ساحل کے اوپری طرف بڑھ کر سوالی ہول میں اسی ماہ کی ۱۵ تاریخ کو اپنے جہاز کو لنگرانداز کردیا۔

ان کے خیر مقدم کے لیے سورت سے الڈورتھ تیزی سے روانہ ہوا۔ گجرات کے گورنر مقرب خاں

نے دشمن پر حملے میں مغل افواج کی مدد کرنے کے لیے ڈاؤنٹن سے کہا۔ اس نے انکار کر دیا۔ ایک گماشتہ ایڈورڈس کو بادشاہ جہانگیر کا خط لے کر دربار میں بھیجا گیا۔ پرتگالی حملے سے بچنے کے لیے اپنے بحری جہازی بیڑے کے ساتھ ڈاؤنٹن نے سوالی ہول میں پناہ لے لی لیکن بعد میں اسے جنگ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ سوالی ہول سے دوراس مقابلے میں اس نے فیصلہ کن کامیابی حاصل کی جس کا مقرب خاں کے رجحان پر بہت اچھا اثر پڑا۔

اس کے بعد ڈاؤنٹن جہاز لے کر ایسٹ انڈیز کے لیے روانہ ہوا۔ وہاں اس کی جورڈین سے ملاقات ہوئی۔ سماترہ کے مشرقی ساحل کی تلاش کی جستجو کے دوران ۶؍ اگست ۱۶۱۶ء بروز اتوار اس نے وفات پائی۔ اس کے مدفن کی جگہ کو قلم بند نہیں کیا گیا اس لیے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔

ہکلیوٹ سوسائٹی سلسلۂ اشاعت میں فوسٹر نے اس کے روزنامچہ کو مدون کر کے چھاپا تھا۔ اس کا یہ کہنا ہے کہ چھپا ہوا مواد جزوی طور پر قلمی نسخوں سے لیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈاؤنٹن کا اصلی مسودہ ایک سے زائد جریدوں پر مشتمل تھا۔ ریو پرچاز نے پہلی جلد سے بہت سے اقتباسات شائع کیے ہیں۔

(۱) اس کا بیان

سورت شہر اور اس کے باشندے:

اس نے لکھا ہے کہ "بے عزتی سے بچنے" کے لیے وہ شہر کے ادھر اُدھر یا تو گھوڑے کی سواری پر گیا تھا یا گاڑی میں۔ یہاں کی آبادی "مخلوط" تھی۔ وہ لوگ امن پسند، خاموش، بہت نازک اور خوش اخلاق تھے۔ اور بالعموم ایک ہی بادشاہ کی رعایا تھے لیکن ان کے قوانین اور رسوم مختلف تھے۔

بنیے: وہ کسی قسم کا گوشت نہیں کھاتے تھے۔ وہ کسی بھی جانور کو نہیں مارتے تھے یہاں تک نہ تو چوہے کو نہ ہی جوں کو، بلکہ انھیں غذا کھلاتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا ستم یہ تھا

نہ وہ اسے چھوڑ دیتے تھے اور خود بخود اسے چلا جانے دیتے تھے۔ نہ ہی وہ لوگ شراب پیتے تھے اور نہ ہی کوئی دوسری نشیلی چیز پیتے تھے۔

مسلمان، ان کی طرز معاشرت اور تفریحی مشاغل :

وہ لوگ بڑی آزادی سے زندگی بسر کرتے تھے اور سور کے گوشت کے علاوہ ہر قسم کا گوشت کھاتے تھے۔ وہ بڑی آزادی سے شراب بھی پیتے تھے : لیکن صرف رات کو۔ باریک اور موسم گرما کی مناسبت سے وہ لوگ سفید کپڑے پہنتے تھے لیکن "موسم سرما میں موٹے اور بیش قیمت لباس پہنا کرتے تھے۔ سوتی کپڑوں پر چھاپے ہوئے تھے۔ ریشمی کپڑے یا سنہری اور روپہلی دھاگوں سے بنے کپڑے ہوتے تھے۔ نیزہ اور ڈھال لے کر گھوڑوں پر سواری کرنا ان کا مخصوص تفریحی مشغلہ تھا۔ ان کے بادشاہ، شہزادے اور امراء بارہ سنگھوں اور جنگلی سوروں کا شکار کرتے تھے۔ ان میں بڑی شان و شوکت پائی جاتی تھی۔ ان کی عمارتیں شاندار اور پُر تکلف ہوتی تھیں۔ اور باغات عجیب و غریب ہوتے تھے۔ ان باغوں میں بہت سے خوبصورت آموں کے درخت اور تالاب، فوارے اور پانی کا بہت اچھا انتظام ہوتا تھا۔ ان کے پاس ہاتھی بھی ہوتے تھے۔

مسلمان عورتیں :

اعلیٰ طبقے کی مستورات ہودوں میں بیٹھ کر سفر کرتی تھیں۔ (ہودے شہتیر کی لکڑیوں کا بنا ایک ڈھانچہ ہوتا تھا جس میں کھڑکیاں ہوتی تھیں) ان میں آگے اور پیچھے دو لکڑیاں لگی ہوتی تھیں مسلمان عورتوں کے گانا گانے کے بارے میں اس نے لکھا ہے :"

ان کی عورتیں، بیبیاں، اور داشتائیں بہت سریلی آواز میں گانا گاتی ہیں۔ وہ دھیمے اور بلند آوازوں اور فنی اتار چڑھاؤ کے ساتھ گاتی ہیں۔ دورے میں ان سُریلے گانوں سے یہاں کے خاموش موسموں میں بہت متاثر ہوا تھا۔ ان گانوں کو سننے کے لیے میں متواتر گنگاسار رہتا تھا اور وہ گانوں کو سنا کرتا تھا اور نئے چاند کے نکلنے کا متوقع رہتا تھا کیونکہ موقع پر وہ جشن منایا کرتی تھیں!"

نکولس ورتھنگٹن (۱۶۱۲ء تا ۱۶۱۶ء)

سوانح عمری:

ورتھنگٹن کی ابتدائی نشو ونما اور تدریجی ترقی حاصل کرنے کے بارے میں ہمیں کسی بات کا علم نہیں ہے۔ کیپٹن بیسٹ کے چپراسی کی حیثیت سے وہ ہندوستان آیا تھا۔ سورت میں کمپنی نے اسے ملازم رکھ لیا۔ غالباً وہ عربی بول لیتا تھا اور بالخصوص اسی وجہ سے اسے نئی ملازمت ملنے میں مدد ملی۔ اپنے فرائض منصبی انجام دینے اور وہاں کے لوگوں کی زبان سیکھنے کی غرض سے وہ سورت میں مقیم رہا۔

اکتوبر ۱۶۱۳ء میں وہ الڈورتھ کے ہمراہ نیل خریدنے میں اس کی مدد کرنے کے لیے وہ احمد آباد گیا۔ وہ کمبے اور سرخیج بھی گیا۔ دسمبر ۱۶۱۳ء میں بری راستے سے اسے لہری بندر بھیجا گیا کیونکہ انہوں نے یہ سنا تھا کہ ایک انگریزی جہاز وہاں پہنچا تھا۔ بعض ہندوستانی تاجروں کے ساتھ اس نے رادھن پور اور نگر ٹھٹھہ کے راستے سے یہ سفر کیا تھا۔ وہ تقریباً ٹھٹھہ پہونچنے ہی والا تھا کہ مقامی حکمراں نے سارے جماعت کو گرفتار کر لیا۔ ہندوستانیوں نے اس کے ہمراہیوں کی گردنیں قلم کر دیں۔ خوش قسمتی سے اس کی زندگی بخش دی گئی۔ ایک قیدی کی حیثیت سے کچھ دنوں اسے پہاڑیوں میں رکھا گیا۔ اس کے بعد اسے رہا کر دیا گیا۔ اور ایک فوجی دستے کی نگرانی میں اسے نگر ٹھٹھہ بھیج دیا گیا جہاں وہ بڑی شکستہ حالی میں پہونچا۔ وہاں اس نے ایک تاجر کی مدد حاصل کی جسے وہ احمد آباد سے جانتا تھا۔ گجرات کے دارالخلافہ میں وہ اپریل ۱۶۱۴ء کو پہنچا۔

اس کے بعد نیل کی خرید کے لیے روپے لگانے اور جون منہال کی کارگزاریوں کے بارے میں اپنی رپورٹ لکھنے کے لیے " اسے آگرہ بھیجا گیا۔ جون ۱۶۱۴ء کو وہ دارالخلافہ پہونچا۔ دارالخلافہ میں اس کا قیام پرامن نہیں تھا۔ ۱۶۱۵ء میں " کمپنی کو دھوکا [illegible] کا الزام لگایا گیا "۔ ہتھکڑیاں لگا کر اسے اجمیر لے جایا گیا اور وہاں سے اسے زنجیروں [illegible] سورت بھیج دیا گیا۔ سورت میں وہ کیلنگ کو اپنی معصومیت کا یقین دلا [illegible] حالانکہ ابھی اس کی ملازمت کی مدت باقی تھی پھر بھی پرائیویٹ [illegible] جہاز میں [illegible]

ن دالی
بس بھیجدیا گیا۔ (فروری ۱۶۱۶ء) انگلستان پہونچنے پر اسے گرفتار کرلیا گیا اور سابق جرم اس
عائد کیا گیا۔ کچھ دنوں اسے جیل میں رہنا پڑا۔ غالباً اپریل ۱۶۲۴ء سے پہلے ہی اس نے وفات
ی۔

اس کے بیانات کا ایک جز پرچاز کے ہاتھ لگ گیا جسے اس نے مختصراً اپنی کتاب
پرگرِمس میں چھاپ دیا ۱۶۲۵ء میں اس کے بیانات، سٹریکٹیٹ کو مکمل طور پر چھاپ دیا
گیا۔ فورسٹر نے اس کی سیاحتوں کے روزنامچے کا پورا مواد اپنی کتاب EARLY TRAVELS
IN INDIA میں شائع کر دیا۔ یہ کتاب اوکسفورڈ سے ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی تھی۔
ورتھنگٹن کے باہری سفر سے متعلقہ بیان کے حصے کو اس نے حذف کر دیا

دا، جو شہر اس نے دیکھے

... آباد ...
... وہ خاص شہر کم وبیش لندن کی وسعت کے برابر تھا۔ تمام مقامات کے
... ہوتا تھا۔ یہاں کی خاص صنعتی پیداواروں میں ... کپڑا، چاندی
... ہوئے ... کپڑوں کی چیزیں، مخمل اور مفرداد ویات شامل تھیں

...

... کے خریدنے کے لئے یہ ایک مخصوص مرکز تھا۔ یہاں گجرات کے بادشاہوں
... لوگ انھیں دیکھنے آتے تھے۔ یہاں سے ایک کوس کی دوری
... نے گجرات کے بادشاہوں پر نصرت کی یادگار ...
... ہے۔ ... یہاں ... آدمی رہتے تھے جنھیں ... کو صاف ...

... تھا۔ اس سے بڑا ... پہلے کبھی نہیں دیکھا ...

نکولس ورتھنگٹن (۱۶۱۲ء تا ۱۶۱۶ء)

سوانح عمری!

ورتھنگٹن کی ابتدائی نشو ونما اور تدریجی ترقی حاصل کرنے کے بارے میں ہمیں کسی بات کا علم نہیں ہے۔ کیپٹن بیسٹ کے چپراسی کی حیثیت سے وہ ہندوستان آیا تھا۔ سورت میں کمپنی نے اسے ملازم رکھ لیا۔ غالباً وہ عربی بول لیتا تھا اور بالخصوص اسی وجہ سے اسے نئی ملازمت ملنے میں مدد ملی۔ اپنے فرائض منصبی انجام دینے اور وہاں کے لوگوں کی زبان سیکھنے کی غرض سے وہ سورت میں مقیم رہا۔

اکتوبر ۱۶۱۳ء میں وہ الڈورتھ کے ہمراہ نیل خریدنے میں اس کی مدد کرنے کے لیے وہ احمدآباد گیا۔ وہ کمبے اور سرخج بھی گیا۔ دسمبر ۱۶۱۳ء میں بری راستے سے اسے لہری بندر بھیجا گیا کیونکہ انہوں نے یہ سنا تھا کہ ایک انگریزی جہاز وہاں پہنچا تھا۔ بعض ہندوستانی تاجروں کے ساتھ اس نے رادھن پور اور نگر پرکر کے راستے سے یہ سفر کیا تھا۔ وہ تقریباً ٹھٹھہ پہونچنے ہی والا تھا کہ مقامی حکمراں نے ساری جماعت کو گرفتار کرلیا۔ ہندوستانیوں نے اس کے ہمراہیوں کی گردنیں قلم کردیں۔ خوش قسمتی سے اس کی زندگی بخش دی گئی۔ ایک قیدی کی حیثیت سے کچھ دنوں اسے پہاڑیوں میں رکھا گیا۔ اس کے بعد اسے رہا کردیا گیا۔ اور ایک فوجی دستے کی نگرانی میں اسے نگرپرکر بھیجدیا گیا جہاں وہ بڑی شکستہ حالی میں پہونچا۔ وہاں اس نے ایک تاجر کی مدد حاصل کی جسے وہ احمدآباد سے جانتا تھا۔ گجرات کے دارالخلافہ میں وہ اپریل ۱۶۱۴ء کو پہنچا۔

اس کے بعد" نیل کی خرید کے لیے روپے لگانے اور جون منہال کی کارگزاریوں کے بارے میں اپنی رپورٹ لکھنے کے لیے" اسے آگرہ بھیجا گیا۔ ۷ جون ۱۶۱۴ء کو وہ دارالخلافہ پہونچا۔ دارالخلافہ میں اس کا قیام پرامن نہیں تھا۔ ۱۶۱۵ء میں" کمپنی کو دھوکا دینے کا اس پر الزام لگایا گیا"۔ ہتھکڑیاں لگاکر اسے اجمیر لے جایا گیا اور وہاں سے اسے زنجیروں میں جکڑ کر سورت بھیجدیا گیا۔ سورت میں وہ کیلنگ کو اپنی معصومیت کا یقین دلانے میں ناکام رہا۔ حالانکہ ابھی اس کی ملازمت کی مدت باقی تھی پھر بھی اسے ایون نامی بحری جہاز میں سوار کرکے وطن

ان دہلی
پس بھیج دیا گیا۔ (فروری سنہ ۱۶۱۶ء) انگلستان پہونچنے پر اسے گرفتار کر لیا گیا اور سابق جرم اس
رعائد کیا گیا۔ کچھ دنوں اسے جیل میں رہنا پڑا۔ غالباً اپریل سنہ ۱۶۲۴ء سے پہلے ہی اس نے وفات
پائی۔

اس کے بیانات کا ایک جز پرچاز کے ہاتھ لگ گیا جسے اس نے مختصراً اپنی کتاب
پرگریمس میں چھاپ دیا سنہ ۱۶۲۵ء میں اس کے بیانات، سٹریکیٹ کو مکمل طور پر چھاپ دیا
گیا۔ فورسٹر نے اس کی سیاحتوں کے روزنامچے کا پورا مواد اپنی کتاب EARLY TRAVELS
IN INDIA میں شائع کر دیا۔ یہ کتاب اوکسفورڈ سے ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی تھی۔
ورتھنگٹن کے باہری سفر سے متعلقہ بیان کے حصے کو اس نے حذف کر دیا

(۱) جو شہر اس نے دیکھے

احمد آباد:

گجرات کا وہ خاص شہر "کم و بیش لندن کی وسعت کے برابر" تھا۔ تمام مقامات کے
تاجروں کا وہاں ہجوم ہوتا تھا۔ وہاں کی خاص صنعتی پیداواروں میں سنہری کپڑا، چاندی
کے دھاگوں کے بنے ہوئے باریک کپڑوں کی چیزیں، مخمل اور مفرداد ویات شامل تھیں۔

سرخیج:

کچھ نیل کے خریدنے کے لئے یہ ایک مخصوص مرکز تھا۔ یہاں گجرات کے بادشاہوں
کے مقبرے بھی تھے۔ بہت سے لوگ انھیں دیکھنے آتے تھے۔ یہاں سے ایک کوس کی دوری
پر ایک شاندار باغ تھا جو خانخانان نے گجرات کے بادشاہوں پر نصرت کی یادگار میں
بنوایا تھا۔ سیاح مذا نے لکھا ہے۔ "وہاں چند آدمی رہتے تھے جنہیں باغ کو صاف رکھنے
کے لئے اجرت پر رکھا گیا تھا۔"

آگرہ: یہ ایک شہر نہیں بلکہ ایک قصبہ تھا۔ اس سے بڑا قصبہ اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"شاندار تعمیر" چیز جو اس نے وہاں دیکھی تھی وہ وہاں کا قلعہ تھا۔ بعض امیروں کے مکانات کے علاوہ قصبے کا بقیہ حصہ "بہت ویران" تھا۔

(۲) لوگ اور انکے رسوم

سندھ کے راجپوت باشندے؛

کمر سے اوپری حصّے میں وہ کپڑے نہیں پہنا کرتے تھے۔ وہ لوگ اپنے سروں میں پگڑیاں باندھتے تھے۔ جو مغلوں کی پگڑیوں کے مشابہ ہوتی تھیں۔ جہاں تک ان کے ہتھیاروں کا تعلق تھا۔ ان میں سے کچھ ہی بندوقیں اور تیر کمان کا استعمال کرتے تھے۔ وہ لوگ ہمیشہ اپنے ساتھ تلواریں، چھوٹی ڈھالیں اور نیزے رکھتے تھے۔ مہال کی مکھیوں کے چھتّوں کی شکل کی بنی ہوئی ان کی ڈھالیں اتنی بڑی ہوتی تھیں کہ بوقت ضرورت وہ ان میں اپنے گھوڑوں کو راتب کھلا دیتے اور پانی پلا دیتے تھے۔ وہ لوگ "بیحد" اچھے گھوڑے رکھتے تھے جو "مضبوط اور تیز رفتار" ہوتے تھے۔ جن لوگوں کے پاس گھوڑے نہیں تھے وہ اونٹوں کا استعمال کرتے تھے۔ نکوس ورتھنگٹن نے لکھا ہے کہ "وہ لوگ راجپوت ہیں جیسا کہ مغل لوگ کہتے ہیں۔ وہ لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ مایوس کن صورت میں کس طرح ایک آدمی کو جان دیدینا چاہیئے۔"

راجپوتوں میں رسم ستی!

جب کوئی راجپوت مرتا تھا تو اس کی بیوہ اپنے شوہر کے ساتھ آگ میں جل جاتی تھی [illegible]

کے بارے [illegible] کے ساتھ [illegible] کرتے ہوئے [illegible]

پہونچا۔ دارالخ [illegible] "ارتھی" کے [illegible] اپنے شوہر کی موت پر آہ وزاری کرنے [illegible]

الزام لگا [illegible] بات کا اعلان کر کے انہاد فوشی [illegible]

سوز [illegible] ہوتی تھی [illegible] اس کے بعد وہ اپنے رشتہ داروں اور سہیلیوں [illegible]

حالانکہ [illegible] کو دیں لے کر وہ ارتھی پر بیٹھ جاتی تھی [illegible]

[illegible] ڈال [illegible] تھنگٹن نے لکھا ہے کہ بدرجہ مجبوری [illegible]

خوشی سے اس صبر کے ساتھ آگ کو برداشت کرتی تھی کہ یہ بات قابلِ تعریف ہے۔"

سندھ کے بنیئے اور انکی بیوائیں!

وہ لوگ کسی قسم کا گوشت نہیں کھاتے تھے۔ ان میں تیس یا اس سے زائد ذاتیں پائی جاتی تھیں۔ وہ ایک دوسرے سے اس قدر مختلف تھے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کبھی کھانا نہیں کھاتے تھے۔ وہ مُردوں کو جلا دیا کرتے تھے۔ جب کوئی بنیا مر جاتا تو اس کے جلائے جانے کے بعد اس کی بیوہ اپنا سر منڈوا لیا کرتی تھی۔ اس کے بعد سے "اپنے مرنے تک" وہ کبھی زیورات نہیں پہنتی تھی۔

بنیوں میں رسوم شادی!

ان میں بچپن کی شادی بیاہ کا چلن تھا یہاں تک کہ اکثر تین یا اس سے بھی کم عمری میں بچوں کی شادی کردی جاتی تھی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ بچوں کے پیدا ہونے سے بہت ہی پہلے اپنے بچوں کی آپس میں شادی کرنے کا عہد و پیمان کر لیا کرتے تھے۔ جب ان کے بچوں کی عمر تین یا چار سال ہوجاتی تو وہ بڑی ایک ضیافت کا اہتمام کیا کرتے تھے ... لڑکی کو دو گھوڑوں پر سوار کرتے، ان کے پیچھے اس لئے آدمی ہوتے کہ ایسا نہ ہو کر وہ گھوڑوں سے گر جائیں اور شہر یا قصبے میں گشت لگواتے تھے اور اس کے بعد کسی مندر ... جاتے تھے۔ انھیں عمدہ کپڑے پہنائے جاتے تھے اور پھولوں کے ہاروں سے سجایا جاتا ... پجاری ان کے ہمراہ چلتے تھے۔ مندر میں شادی کے رسوم ادا کیے جاتے تھے۔ فریقین ... دولت کی مناسبت سے شادی کا یہ جشن کئی دنوں تک جاری رہتا تھا۔ جب شادی شدہ لڑکے لڑکی ... سال کی ہوجاتی تھی تو انہیں ازدواجی زندگی کے فرائض انجام دینے کی اجازت دیدی

... نے کے بہت سے واقعات دیکھے تھے لیکن ...

مخصوص واقعہ سے وہ بے حد متاثر ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو واقعات اس نے دیکھے تھے ان میں سے یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔ دوم، ستی ہونے والی لڑکی ابھی صرف دس سال کی عمر کی تھی اور ابھی تک اس نے اپنے مرحوم کے ساتھ ہمبستری بھی نہ کی تھی۔ اس کا شوہر ایک سپاہی تھا اور ایک جنگ میں مارا گیا تھا۔ اس کی پگڑی واپس لائی گئی تھی اور اس بیوہ نے ستی ہونا طے کیا تھا۔ اپنے شوہر کی پگڑی کو بغل میں لے کر ایک جلوس کے ساتھ وہ شمسان گئی۔ یہاں اسے گورنر کے حکمنامے کا سامنا کرنا پڑا جس میں اسے خود کو جلانے سے منع کیا گیا تھا کیونکہ اس نے اپنے شوہر کے ساتھ کبھی ہمبستری نہ کی تھی۔ اس نے اس حکمنامے کو نظر انداز کر دیا اور چتا پر چڑھ گئی اور اس میں آگ لگانے کا حکم دیا۔ لیکن گورنر کی اجازت کی بنا پر لوگوں میں اس کام کے کرنے کی ہمت نہ ہوئی اسکے رشتہ دار دوڑ کر گورنر کے پاس گئے اور کچھ تحفے دے کر اجازت حاصل کر لی۔ بعد میں اسنے خود کو جلا دیا اور اس کی راکھ کو ندی میں بہا دیا۔

انگریزی کمپنی کا گماشتہ جو مصنف ہذا کے ساتھ اس منظر کو دیکھنے گیا تھا۔ وہ اس جوان لڑکی کے دلیرانہ مصمم ارادے پر اس قدر متحیّر اور کبیدہ خاطر ہوا کہ اس نے کہا کہ جب تک وہ زندہ ہے وہ کسی اور عورت کو آگ میں جلتے نہ دیکھے گا۔"

ستی ہونے کے رسوم کے نفاذ کے بارے میں اس نے لکھا ہے کہ "مرحوم شوہر کے رشتہ دار اس کی بیوہ کو ستی ہونے کے لئے مجبور نہیں کرتے ہیں لیکن خود اس کے رشتہ دار اس بات کو اپنے خاندان کی بے عزتی سمجھ کر اگر وہ خود کو جلانے سے انکار کرے، اسے جلنے پر مجبور کر دیتے ہیں"۔ اس نے آگے یہ لکھا ہے کہ اگر وہ مجبور انسان جھلسانے والی آگ کی تپش کو محسوس کر کے بھاگنا چاہے تو اس کے والدین ہی اسے پکڑ لیتے تھے، باندھ دیتے تھے اور اسے آگ میں جھونک دیتے تھے۔ لیکن ایسی کمزوری کا واقعہ شاذ و نادر ہی ان میں وقوع پذیر ہوتا تھا۔"

ستی نہ ہونے والی بیوائیں :

جو عورتیں خود کو جلانے سے انکار کرتیں، وہ اپنے سروں کے بال منڈوا لیتیں اور اپنی چوڑیاں توڑ ڈالتیں۔ اس کے بعد انہیں کسی کے ساتھ کھانا کھانے، پانی پینے یا ساتھ رہنے کی اجازت نہ دی جاتی تھی۔ جب تک وہ مر نہ جائیں انھیں بڑی کس مپرسی کی زندگی گذارنی پڑتی تھی۔ (باقی آئندہ)

تھومس کوریٹ (۱۶۱۲ء۔۱۶۱۷ء)

سوانح عمری:

کوریٹ، سومرسیٹ شائر نامی پادری کا بیٹا تھا۔ آکسفورڈ اور ونچسٹر میں اس نے تعلیم حاصل کی تھی۔ جیمس اول کی تخت نشینی کے بعد اسے شہزادہ ہنری کے ذاتی ملازمین کی جماعت میں معمولی ایک نوکری مل گئی تھی۔ ۱۶۰۸ء میں اس نے براعظم کا پیدل دورہ شروع کیا، اس نے فرانس کے ایک حصے شمالی اٹلی، سوئیزرلینڈ اور جرمنی کا دورہ کیا

۱۶۱۱ء میں اس کا یورپی سیاحت کا سفرنامہ شائع ہوا تھا یہ اشاعت بہت کامیاب ثابت ہوئی نتیجتاً اسی سال اس کی دوسری اشاعت عمل میں آئی۔

اس طرح حوصلہ افزا ہوکر اس نے مشرق وسطیٰ کا سفر شروع کیا۔ اکتوبر ۱۶۱۲ء میں وہ استنبول کے لئے روانہ ہوا۔ اور وہ اپنی منزل تک اپریل ۱۶۱۳ء میں پہونچ گیا۔ اگلی جنوری تک وہ وہاں مقیم رہا۔ اس کے بعد وہ بحری جہاز سے اسکنڈریرون کے لیے روانہ ہوا۔ اور بری راستے سے وہ الیپو گیا۔ آخرالذکر مقام سے وہ دوسرے ایک انگلستانی کے ہمراہ متبرک شہر جیروشلم دیکھنے گیا ستمبر ۱۶۱۴ء میں اس نے مشرق کی سمت اپنا پیدل طویل سفر شروع کیا۔ وہ دیربکر طبریز قزوین اور قندھار گیا ہندوستانی سرحد کے قریب سررابرٹ اور لیڈی شرے سے اس کی ملاقات ہوئی۔ ان کا ساتھ چھوڑ کر اس نے ملتان، لاہور اور دہلی ہوتے ہوئے آگرہ کا سفر کیا۔ اس کے بعد وہ اجمیر گیا جہاں بادشاہ مقیم تھا۔ جولائی ۱۶۱۵ء میں وہ راجپوتانہ کے مخصوص شہر میں وارد ہوا۔ الیپو سے اجمیر تک کے سفر میں اسے چھ ماہ لگے اور اوسطاً روزانہ دو پونڈ صرف میں آئے۔

جب تھومس رو ہندوستان آیا تو کوریٹ اس کے ساتھ ہوگیا۔ وہ ۱۴ مہینوں تک اجمیر میں رہا تھومس رو جنوب کے لیے اپنے سفر میں روانہ ہوگیا اور آگرہ جانے کے لیے کوریٹ سے الگ ہوگیا۔ وہ ۱۲ ستمبر ۱۶۱۶ء کو وہاں اس زمانے میں پہونچا جب مغلیہ سلطنت کے دارالخلافہ میں زوروں پر طاعون پھیلا ہوا تھا۔

اس نے ہندوستان کے اپنے سفر کے حالات تفصیل سے لکھے تھے۔ اس کے انتقال کے وقت وہ روزنامچہ اس کی تحویل میں تھا۔ اس کے بعد وہ مسودہ دست برد زمانہ ہوگیا۔ اس کا CRUDITIES نامی روزنامچہ تین جلدوں میں شائع کیا گیا۔ جہاں تک ہمارے عہد کا تعلق ہے اس کے بارے میں بہت کم مواد دستیاب ہوتا ہے۔ EARLY TRAVELS IN INDIA میں فورسٹر نے اس کے بعد اقتباسات شائع کئے ہیں۔

بیان

لاہور سے آگرہ تک کی سڑک:

مصنف ہذا کے مطابق لاہور سے آگرہ تک کی سڑک اچھی تھی جس کے دونوں کناروں پر قطاروں سے درخت لگے ہوئے تھے۔

جہانگیر بادشاہ:

اس کے چہرے کا قدرتی رنگ زیتونی تھا اور بڑے احترام سے عیسیٰ مسیح کا ذکر کیا کرتا تھا۔ تھی، ریچھ، چیتے، بارہ سنگھا وغیرہ وحشی جانور وہ کثرت سے بلوایا کرتا تھا۔ ہفتے میں دو مرتبہ وہ ہاتھیوں کی جنگ دیکھا کرتا تھا۔ اس کی ساری مملکت میں تقریباً تیس ہزار ہاتھی تھے۔ صبح، دوپہر اور شام کو ۵ بجے روزانہ وہ اپنے امیروں سے ملا کرتا تھا۔ آدھی رات کو اپنے غسل خانے میں وہ غریب غربا اور ضعیف لوگوں کو بلایا کرتا تھا، انھیں وہ اپنے قریب بٹھاتا، ان کے حالات دریافت کرتا اور رخصت کرتے وقت انھیں روپیہ دیا کرتا تھا۔

جھروکہ:

"ایک اونچے کمرے" میں شہنشاہ تن تنہا کھڑا ہوا کرتا تھا اور ایک کھڑکی سے وہ جمع شدہ لوگوں کا مشاہدہ کیا کرتا تھا اس کے اوپر سایہ کے لیے ایک چھتری تھی جس کے کھمبے چاندی کے تھے اور چھتری بیش بہا کارچوبی کی تھی۔

ہم جشنِ وزن :

بڑی شان و شوکت کے ساتھ یہ رسم ادا کی جاتی تھی۔ سونے کی ایک جوڑی ترازو میں شہنشاہ تولا جاتا تھا" جس کے دوسرے پلڑے میں اس کے جسم کے وزن کے برابر سونا رکھا جاتا تھا بعد ، وہ تمام سونا غریبوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

مینابازار :

شہنشاہ کی بیگمات کی دلجوئی کے لیے سال میں ایک دن " تاجروں کی بیبیاں کچھ سامان لے کر فروخت کرنے کے لیے محل میں داخل ہوا کرتی تھیں " یہ ایک قسم کا میلہ تھا۔ اپنی بیگمات کے لئے بادشاہ ایک دلال کا کردار انجام دیتا تھا۔

(باقی آئندہ)
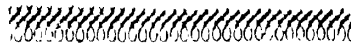
معذرت

اپنے قارئین کرام سے معذرت خواہ ہوں کہ برہان ماہ مارچ کا شمارہ طباعت کی خرابی کیوجہ سے صاف نہیں اسکا۔ اور خاص کر ڈاکٹر صفیہ جارایلیں کے مضمون "طوطی نامہ کا حوالہ جات ، اس لئے حوالہ جات کو اس شمارہ کے صفحہ نمبر ۳۶ پر دوبارہ شائع کیا جارہا ہے ۔ رجوع فرمائیں ۔ (ادارہ)

حوالہ جات

۱ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد سوم (۱۰۰۰-۱۵۲۶ء) از ڈاکٹر محمد باقر و ڈکٹر وحید میرزا۔

۲ BODLEIAN LIBRARY CATALOGUE. No. 444

۳ طوطی نامہ از غواصی۔ مرتبہ میر سعادت علی رضوی ایم۔ اے ۱۳۵۷ھ

۴ BODLEIAN LIBRARY CATALOGUE No. 444

۵ مقدمہ طوطی نامہ از غواصی، مرتبہ میر سعادت علی رضوی۔

۶ THE PERSIAN MANUSCRIPTS IN THE ORIENTAL PUBLIC LIBRARY AT BANKIPUR. VOL. VIII. No. 728.

۷ ایضاً۔

۸ ایضاً۔

۹ "تاریخی مقالات" از پروفیسر خلیق احمد نظامی ص: ۹۸

۱۰ A COMPANION TO SANSKRIT LITERATURE BY SURES CHANDRA BANERJI M.A., D.PHIL.

۱۱ "TALES OF A PARROT" BY MUHAMMAD A. SIMSAR.

۱۲ مقدمہ طوطی نامہ۔ قلمی

۱۳ یہ کتاب شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سیمنار میں موجود ہے۔

۱۴ طوطی نامہ، قلمی

۱۵ ایضاً

۱۶ ایضاً ۱۷ ایضاً

۱۸ ایضاً

برہان

جلد ۱۱۳ | مئی ۱۹۹۴ء مطابق ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ | شمارہ ۵

عمیدالرحمٰن عثمانی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

نظرات

ملتِ اسلامیہ ہند کے عظیم رہنما اور عالم اسلام کے مایۂ ناز علمی ادبی تاریخی و دینی ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی کے بانی مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو ہم سے جدا ہوئے دس سال ہو گئے ہیں۔ واضح ہو کہ حضرت مفتی صاحبؒ کا دس شعبان المعظم مطابق ۱۲ مئی ۱۹۸۴ء کو انتقال ہوا تھا۔

آزادیٔ ہند کے بعد ملک میں ہندوستانی مسلمانوں کو بڑی دور اندیش قیادت کی ضرورت تھی کیونکہ ملک کے حالات سخت ترین نازک دور سے گذر رہے تھے۔ ملک کا ایک حصہ پاکستان کی صورت میں وجود میں آچکا تھا اور اس کے لئے مسلمانوں کی چند غلط قیادت یا بے فائدہ جذباتیت کے پیشِ نظر پوری مسلم قوم کو مورد الزام ٹھہرا دیا گیا تھا اور اس الزام کی آڑ میں فرقہ پرست عناصر مسلمانوں سے، انگریزی سامراج کی گھڑی اس تاریخ کے واقعات کا بدلہ لے لینا چاہتے تھے جن میں کے ہندوستان میں دورِ حکمرانی کے وقت ہندوؤں کو بے انتہا ظلم و ستم اور ہندو مندروں کو اپنی عبادت گاہوں میں تبدیل کرنے کی من گھڑت کہانیوں کا ذکر درج ہے۔

ایسے نازک دور میں ملک کی آزادی کے وقت خدانخواستہ ۱۹۴۷ء کی ہندوستانی مسلمانوں کی مسلم قیادت معرضِ وجود میں آئی ہوتی ہوتی تو نہ معلوم ہندوستان میں مسلمانوں کا جو آج ماشاء اللہ وجود باقی ہے وہ ہوتا بھی یا اسپین کی طرح سرزمین ہند سے مسلمانوں کا صفایا ہی ہو چکا ہوتا؟ اس پر ماہرین و تاریخ داں ہی زیادہ روشنی ڈال سکتے ہیں مگر ایک سرسری سا محاسبہ و جائزہ لینے کے بعد ہمیں اس بات کا برملا اظہار کرنے میں فخر و مسرت حاصل ہو رہی ہے کہ امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ، مفتیٔ اعظم حضرت مفتی کفایت اللہؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ

بانی الہند حضرت مولانا احمد سعیدؒ، مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمنؒ اور مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تقسیم ملک کے وقت فرقہ پرستی کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندری طوفان کے تھپیڑوں کے بیچ میں سے ہندوستانی مسلمانوں کو فرقہ پرستی کے بھڑکتے، دہکتے اگلتے آگ کے شعلوں کی لپٹوں میں سے اس خوبی سے بچا کر نکال لے گئے کہ آج ہندوستانی مسلمان ہندوستان میں ایک اہم مقام حاصل کر چکے ہیں جسے دیکھ کر فرقہ پرستی کے "شیطانی دیوتا" اندر ہی اندر تلملا رہے ہیں اور وہ آج ۱۹۹۴ء کی ناعاقبت اندیش عقل و دماغ سے محروم مسلم قیادت کی ہوش و دانشمندی سے کوری اور کھوکھلے جذبات سے بھرپور تقاریر و بیانات کے ذریعہ ہندوستانی مسلمانوں سے چالیس پینتالیس سال کی کمائی کو چھین کر انھیں بالکل بے دست و پا کر دینے پر آمادہ ہیں۔ ایسے وقت میں مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ کی یاد بار بار آتی ہے کہ انہوں نے اپنے ساتھی علمائے کرام کی وفات کے بعد مستقبل میں ملت اسلامیہ ہند کو درپیش مشکل حالات کو بھانپتے ہوئے ڈاکٹر سید محمودؒ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدیؒ وغیرہ جیسے ہمدردانِ ملت کو ساتھ لیکر مسلم مجلس مشاورت کی صورت میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے صحیح قیادت کی راہ دکھائی۔ افسوس ان کی ناگہانی وفات نے ان کے سارے ہی نیک منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ آج مفکر ملت مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ جیسے نیک و دور اندیش قائدین ہمارے درمیان میں نہیں ہیں اسی لئے ہم طرح طرح کی مشکلات مصائب اور فرقہ پرستی کے ننگ انسانیت حالات میں خوف و دہشت کے سائے میں اپنی زندگی کے باقی بچے ایام ہی پورے کر رہے ہیں۔ آہ! مفکر ملت مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ

اب اسے ڈھونڈ چراغ رُخِ زیبا لے کر

اپریل ۱۹۹۴ء میں جنوبی افریقہ میں ۷۰ فیصدی سیاہ فام لوگوں کو آخر وہ حق رائے دہندگی حاصل ہو ہی گیا جس کے لئے وہ سینکڑوں سال سے محروم تھے۔ اور اپنے ہی وطن میں سفید فام اقلیت کے محکوم بنے ہوئے تھے۔

۳۴۲ سال پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی نے جان ڈی بیک کی رہنمائی میں سفید فام لوگوں کو جنوبی افریقہ میں بسا لیا تھا جو تعلیم یافتہ اور اہل دانش میں شمار ہوتے تھے ان گورے لوگوں نے اپنی چالاکی

اور ذہانت کے بل بوتے پر جنوبی افریقہ کی سیاہ فام اکثریت کو ان کی جہالت اور قیادت کے فقدان کیوجہ سے اپنا محکوم بنالیا۔ ان پر اپنی حکومت تھوپ دی اور من ملنے قانون بناکر ہر طرح کے ظلم وستم سے سیاہ فام آبادی کو دبائے رکھا۔ کالے لوگوں کو اس حد تک اذیتیں دی گئیں کہ وہ ۱۹۸۰ء تک گلے میں اپنے اپنے شناخت نامے ڈالے گھومنے کو مجبور تھے۔ سیاہ فام آبادی پر جو ننگ انسانیت ظلم ڈھائے گئے۔ اس پر دنیا کے انصاف پسند رہنماؤں نے آواز اٹھائی امریکہ کے مارٹن لوتھر کنگ اور موہن چند کرم چند گاندھی نے انکو اپنی آزادی کی جدوجہد کی راہ دکھائی۔ جس کی وجہ سے جنوبی افریقہ میں نیلسن منڈیلا نام کی شخصیت نے سیاہ فام لوگوں کے حقوق کے لئے سفید فام اقلیتی لیکن مضبوط وطاقت ور حکومت سے ٹکرلی۔ جسکے نتیجہ میں نیلسن منڈیلا جیل کی سلاخوں میں قید کر دیئے گئے۔ مگر ان کی جدوجہد اس سے دبی نہیں بلکہ جس جدوجہد کا انہوں نے آغاز کردیا تھا اس میں شدت ہی پیدا ہوتی گئی۔ آخر کار ۲۷ سال مسلسل جیل کی سلاخوں کے اندر رکھنے کے باوجود سفید فام حکمراں نیلسن منڈیلا کی جاری کی ہوئی جدوجہدِ آزادی کو نہ دبا سکے مجبوراً نیلسن منڈیلا کو جیل سے رہا کرنا پڑا۔ اور جیل سے رہا ہوتے ہی نیلسن منڈیلا کو تمام دنیا میں مظلوم لوگوں کی آزادی کا رہنما تسلیم کرلیا گیا۔ جس آزادی کو سفید فام حکمرانوں نے طاقت کے زور سے دبائے رکھا وہ ہی آزادی عوامی جدوجہد کے ذریعہ سے سفید فام لوگوں کو نیلسن منڈیلا کی کامیاب رہنمائی کی بدولت ۱۹۹۴ء میں حاصل ہوکر ہی رہی۔ ۲۶ اپریل ۱۹۹۴ء کو سیاہ فام اکثریتی محکوم آبادی نے جنوبی افریقہ کی سفید فام اقلیتی سرکار کے خلاف اپنا حق رائے دہندگی دیکر جنوبی افریقہ میں اپنی حکومت کا سنگ بنیاد رکھ دیا ہے اور جو طوق غلامی سفید فام سامراجیت نے اپنی چالاکی وعیاری کے ساتھ ۳۴۲ سال پہلے ان کے گلے میں ڈال رکھا تھا اس سے انھیں نجات مل گئی ہے۔ پرانے قومی جھنڈے کو اتار کر سیاہ فام آزادی کے متوالوں کے نئے قومی جھنڈے کو پھہرا دیا گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سیاہ فام لوگ نئی ذمہ داریوں کو کس طرح سنبھالیں گے ان کے راستوں میں قدم قدم پر رکاوٹیں آئیں گی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اب سیاہ فام لوگوں میں آپسی چپقلش شروع ہو جائے۔ کیونکہ سفید فام لوگوں نے اپنی حکومت تو کھو دی ہے لیکن ۳۴۲ سال سے جو ان کے پنجے میں جکڑے ہوئے تھے۔ معاشیات پر تہذیب وتمدن پر اس کے اثرات تو ایکدم ختم ہونے والے نہیں ہیں اور جبتک وہ بھی

ختم نہ ہو جائیں اس سے پہلے یہ امید رکھنا کہ اب سیاہ فام لوگوں کی مشکلات و مصائب کا خاتمہ ہو جائے گا خام خیال ہی ہے۔ نیلسن منڈیلا عمر کی آخری منزل پہ ہیں نیلسن منڈیلا نے آزادی دلائی اب آزادی کی بقاو ترقی کے لئے نیلسن منڈیلا کے متبادل قائد کی ضرورت ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ سیاہ فام نیلسن منڈیلا کو پورا ادب واحترام دیتے ہوئے اپنے اس احساس سے یقیناً واقف ہوں گے۔

جنوبی افریقہ کی آزادی کے ساتھ ہی ۴رمئی ۱۹۹۴ء کو اسرائیل اور فلسطین کے درمیان ایک تاریخی معاہدہ پر دستخط ہو گئے جس کے تحت اسرائیلی قبضہ والے علاقہ غزہ پٹی اور جیریکو میں اب فلسطینیوں کی خود مختاری حاصل ہو گئی۔ اسرائیلی وزیراعظم مسٹر اسحاق رابن اور تنظیم آزادی فلسطین کے سربراہ جناب یاسر عرفات نے تاریخ ساز معاہدہ پر نفاذ کے لئے ۶ گھنٹہ کی میٹنگ کے بعد دستخط کئے۔ اس معاہدہ کی رو سے دونوں علاقوں پر ۲۷ سال بعد اسرائیلی فوج کا قبضہ ختم ہو جائے گا۔ اور اب وہاں فلسطینیوں کا کنٹرول ہو گا اور فلسطینیوں کو قانون بنانے ٹیکس وصول کرنے سیاحتی دستاویز جاری کرنے کا اختیار ہو گا۔

جنوبی افریقہ اور فلسطین کے کرائسس کے خاتمہ میں نمایاں فرق ہمیں دیکھنے کو ملے گا جنوبی افریقہ ۳۴۴ سال سے ایک طاقتور کے نرغہ میں پھنسا ہوا تھا جبکہ فلسطین کا موجودہ علاقہ جس پر ۲۷ سال تک اسرائیل کا قبضہ خود فلسطینی قیادت کی ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ تھا۔ یہودیوں نے فلسطین علاقہ میں فلسطینی عربوں سے مال کے لالچ کے ذریعہ زمینیں خریدیں۔ ایک نہیں دو نہیں جب سینکڑوں اور ہزاروں یہودی فلسطینیوں سے زمین خرید رہے تھے تو کسی بھی فلسطینی قائد و رہنما نے اس طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا اور جب بڑی ہوشیاری اور چالاکی کے ساتھ یہودیوں نے عرب فلسطینیوں سے دھڑا دھڑ زمین خرید کر اپنی اکثریت کرلی تو پہلے سے طے شدہ اسکیم کے تحت برطانیہ، امریکہ، فرانس یعنی بڑی یورپی طاقتوں نے ۱۹۴۹ء میں عربوں کے عین دل میں اسرائیل نام کی یہودی سلطنت قائم کر دی عرب فلسطین سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ انگریز چال چل گیا یہودی اپنی حکومت قائم کر بیٹھے اور عرب فلسطینی ہاتھ ملتے رہ گئے۔ اب پچھتا ے

سے کیا ہوتا ہے جب چڑیا چگ گئی کھیت۔ اس سے پہلے انگریز سامراج انکا منصب خلافت
ان ہی کے ایک زرخرید ملت فروش کے ہاتھوں ختم کرا چکا تھا۔ اس ساری صورت حال کا مسلم
قیادت نے کوئی تجزیہ نہیں کیا کوئی محاسبہ نہیں کیا اپنی کمیوں، خامیوں کو نہیں ٹٹولا بس لمبے
چوڑے بیانات کے ذریعہ طاقتور متحدہ دشمن کا مقابلہ کرتے رہے اور یہ رٹ لگانے میں ایک
دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بازی لیتے رہے ہیں کہ اسرائیل کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے گا۔ لڑتے ہیں
اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں کے مصداق جب اسرائیل اور اس کے حامی امریکہ، برطانیہ، فرانس نے انکی
یہ حالت دیکھی تو ۱۹۶۷ء میں کمیونزم نظام کے حامی اور روس کی تھپکی و طاقت پر اکڑ فون کرنے
والے مصر کے صدر جناب جمال عبدالناصر کی اس زبردست گھن گرج کہ اسرائیل کو دریائے
نیل میں غرق کر دیا جائے گا کے دوسرے دن ہی عربوں پر اچانک حملہ کرکے ان سے ان ہی کا
علاقہ ایک ہی چھلانگ میں چھین لیا۔ ۴ مئی ۱۹۹۴ء کو وہ ہی علاقہ عربوں کو واپس کیا جارہا
ہے تو عرب فلسطینی اسی پر فخر و انبساط سے سینہ تانے ہوئے ہیں جبکہ یہ وقت تو ان کے لئے
مقام عبرت کا ہے۔ اور ابھی تو چھنے ہوئے علاقہ کا ایک تہائی ہی علاقہ اسرائیل نے واپس کیا ہے
عرب فلسطین وہ تو بھول گئے کہ کس چالاکی سے اس نے ان کی سرزمین پر اپنی سلطنت حکومت
قائم کرلی۔ اس کی واپسی پر خوشیاں منارہے ہیں جو اس نے اپنی سلطنت سے مزید عربوں کا علاقہ
ان سے بزور قوت غصب کیا تھا۔ یہ ہے عالم اسلام میں موجود مسلم قیادت کی کارگزاری کا کچا چٹھا۔
اب اس موقع پر ہمیں فخر و مباہات کا مظاہرہ کرنا چاہیئے یا اپنی دور اندیشی، ہوشیاری کے
فقدان پر ماتم ـــ اس کا فیصلہ ملت اسلامیہ کے ہر بہی خواہ کو اپنی اپنی عقل و فہم پر ہم چھوڑتے ہیں۔

ہندوستان میں بارہویں صدی ہجری کا ادبی ماحول

ڈاکٹر سید محمد اصغر، لکچرر شعبۂ فارسی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بارہویں صدی ہجری میں مغل بادشاہت کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ ۱۱۱۹ھ میں جب محی الدین اورنگ زیب کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹوں اور پھر اس کے نبیرگان میں اقتدار کے لئے جنگ شروع ہو گئی۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کو قتل کر کے تخت شاہی پر اپنا قبضہ جمانے کی کوشش میں لگا تھا۔ دہلی میں اس وقت سیاسی انتشار پھیلا ہوا تھا اور پورے ملک میں طوائف الملوکی کا سا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ آج جہاندار شاہ ہے تو کل اس کا بھتیجا فرخ سیر بادشاہ بنا ہوا ہے دوسرے دن سادات بارھہ اسکو قتل کر کے جہاندار شاہ کے بیٹے کو تخت شاہی پر بٹھا دیتے ہیں تو پھر وہ سادات بارھہ سے جنگ کرتا ہے غرضیکہ ہر وقت خوں ریزی ہو رہی تھی سیاسی بدحالی اور افراتفری تھی سارا نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ امراء آپس میں ایک دوسرے چشمک اور حسد کرنے لگے تھے ایک امیر دوسرے امیر کو نیچا دکھانا حقیر و ذلیل کرنا چاہتا تھا ہر امیر کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ دربار میں اس کی بالادستی رہے نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ امیر دربار سے بدظن ہو کر چلے گئے۔ اور نظام الملک حیدرآباد میں جا بسے اور برہان الملک نے اودھ کا رخ کیا۔ اس سیاسی انتشار خلفشار اور زبوں حالی کے باوجود اس زمانے میں ادبی سرگرمیاں جاری رہیں۔ جیسے جیسے سیاسی انتشار بڑھتا گیا اسی طرح ادبی ماحول بتدریج بڑھتا گیا۔ جگہ جگہ ادباء، فضلاء اور شعراء پیدا ہوئے مرزا عبدالقادر بیدل، آنندرام مخلص، واقف لاہوری، سراج الدین علی خاں آرزو، شیخ علی حزیں مولانا غلام علی آزاد بلگرامی، اشرف مازندرانی، عبدالحکیم لاہوری، شاہ آفرین، سرخوش، بندرابن داس خوشگو والہ داغستانی، میر غلام علی احسن بلگرامی، محمد احسن ایجاد، نسبتی تھانیسری، الفتی عظیم آبادی، قزلباش خاں امید

شفیعائی اثر، محمد علی تجرید، میر محمد علیم تحقیق، میر محمد افضل ثابت، میر تقی میر، محمد رفیع سودا وغیرہ وغیرہ مشہور و معروف شعرا اسی بارہویں صدی ہجری میں تھے۔ دہلی اس زمانے میں بھی ہندوستان کا دارالحکومت ہونے کی وجہ سے ادبار، فضلار، علمار، شعرار اور دیگر مختلف قسم کے فنکاروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ دہلی کے اجڑنے سے دوسری جگہوں پر نئے نئے مراکز قائم ہونے لگے۔ حیدرآباد، لکھنؤ، عظیم آباد اور مرشدآباد میں علمار، فضلار، ادبار اور شعرار کی پرورش ہونے لگی۔ دہلی کے بعد لکھنؤ ادب کا سب سے بڑا مرکز بنا۔ کیونکہ دہلی کے اجڑنے کے بعد وہاں پر کئی بڑے شعرار اور ادبار مثلاً سراج الدین علیخاں آرزو، والہ داغستانی، عبدالحکیم حاکم لاہوری وغیرہ دیگر اور بھی شعرار اکٹھا تھے اسی طرح نظام حیدرآباد بھی بہت سے شعرار، علمار اور ادبار کی پرورش کر رہے تھے ان کا ایک خاص طریقہ یہ تھا کہ جس کسی کو دیکھا کہ وہ کسی فن کا ماہر ہے اور اس میں شہرت و مقبولیت حاصل کر چکا ہے تو اس کو دعوت نامہ کے ساتھ زادراہ بھجوا کر بلاتے تھے اور اس کی پذیرائی و پرورش کرتے تھے گاہے گاہے انعام و اکرام سے نوازتے تھے۔ چنانچہ مرزا عبدالقادر بیدل، سراج الدین علیخاں آرزو، مولانا شیخ علی حزیں، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی اور حاکم لاہوری کو دعوت نامے بھیجے۔ اسی طرح مرشدآباد میں بھی ہر میدان کے فنکاروں، شعرار، ادبار اور فضلار کا جمگھٹا تھا۔ مرشدآباد کے ناظم اعلیٰ نواب علاءالدولہ سرفراز خاں نے اکثر شعرار کو اپنے یہاں بلایا۔ میر مرتضیٰ حیدر دہلوی، میر مرتضیٰ حالت دہلوی، صانع بلگرامی میر عبدالجلیل بلگرامی، ابراہیم خاں خلیل وغیرہ وغیرہ وہاں گئے۔ صانع بلگرامی کچھ عرصہ بعد وہاں انتقال کر گئے جس سے فارسی ادب کو کافی نقصان پہنچا۔ کیونکہ وہ لوگوں کو شعر کہنے اور کتابیں لکھنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ صانع بلگرامی کے انتقال کے بعد دیگر کئی شعرار و مصنفین اس مرکز کی شہرت میں آئے ان سب نے مل کر اس مرکز کو سنبھالے رکھا۔ نواب علاءالدولہ سرفراز خاں کے انتقال کے بعد یہ مرکز عرصہ دراز تک قائم نہ رہ سکا۔ غالباً بارہویں صدی ہجری کے بالکل آخر میں اس مرکز پر زوال کے بادل چھانے لگے تھے۔ مگر یہاں تھوڑے عرصہ میں ہی ادب نے بہت ترقی پائی۔ ہرچند مرشدآباد پر زوال جلد آگیا مگر عظیم آباد (پٹنہ) میں راجہ "پیارے لال" الفتی کے نانا اور پھر انکے انتقال کے بعد خود الفتی فارسی ادب کے اس مرکز کو کافی عرصہ تک قائم رکھے رہے۔ ان کے گھر میں خود ان کا ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا جس میں تقریباً ۲۵ ہزار کتابیں جمع کئے ہوئے تھے۔ پہلے الفتی دہلی

میں تھے اور وہ وہاں پر فارسی ادب کی خدمت کے ساتھ ساتھ بادشاہ (اکبر شاہ ثانی) کو ہر وہ طریقہ کار اپنانے کے لئے صلاح و مشورہ دیا کرتے تھے جس سے مغل بادشاہ کے مفادات زیادہ سے زیادہ محفوظ رہیں۔ انگریزوں کو یہ بات پسند نہیں تھی اس وقت وہ اپنی طاقت بہت بڑھا چکے تھے جبکی وجہ سے وہ بادشاہ پر بار بار دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ الفتی کو برطرف کردے بادشاہ نے انگریزوں کے دباؤ سے مجبور ہو کر الفتی کو ہٹا دیا۔ الفتی خاموشی سے اپنے وطن واپس چلے گئے اور سیاسی زندگی سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کرلی مگر چونکہ وہ عظیم آباد کے بہت بڑے رئیس تھے اور اپنے گھر پر ایک بہت بڑا کتب خانہ رکھتے تھے اس لئے انہوں نے ادب کی طرف توجہ دی۔ رفتہ رفتہ الفتی کی ادبی خدمت کی شہرت پھیلنے لگی۔ اس لئے علما، ادبار اور شعرار وغیرہ وہاں جمع ہونے لگے ان کے گھر پر ادبی محفلیں منعقد ہونے لگیں۔ نتیجتاً ادبی ماحول ترقی پاتا گیا۔ نئی نئی کتابیں تصنیف ہوئیں اور کچھ شعرا نے اپنے دیوان مرتب کئے۔ یہ مرکز دکن اور اودھ کیطرح بڑا تو نہیں تھا کیونکہ یہاں پر شعرار و ادبار کو مذکورہ بالا دونوں مراکز کی طرح وظیفہ اور انعام وغیرہ نہیں ملتا تھا اس لئے یہاں کم لوگ اکٹھا ہوئے۔ دکن اور اودھ دونوں جگہوں پر شعرار، فضلار، علمار، ادبار اور دیگر فنکاروں کی پرورش ہو رہی تھی اور انھیں ماہانہ وظیفہ ملتا تھا ظاہر سی بات ہے کہ ایک مرکز کے ختم ہونے سے جب چار دوسرے نئے مراکز قائم ہوں گے تو وہاں پر شعرار، علمار، ادبار، اور فضلار کی تعداد زیادہ ہو گی تو تصانیف بھی اسی کے مطابق زیادہ وجود میں آئیں گی۔ اسوقت شعر گوئی اپنے عروج پر تھی شعرا ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور زیادہ سے زیادہ اشعار کہتے تھے مصنفین بھی اسی طرح بڑھ چڑھ کر کتابوں کی تصنیف میں حصہ لیتے رہے۔ البتہ شاعری کا معیار پہلے سے بلند نہیں تھا بلکہ کم تر ہی تھا مگر نثری تصانیف بہت عمدہ اور اچھی وجود میں آئیں بارہویں صدی ہجری میں فارسی ادب میں ایک نئی صنف ضرور وجود میں آئی جو اس سے پہلے کسی صدی میں نہیں پائی جاتی تھی وہ ہے تنقید۔ اس نے فارسی ادب میں ایک باب نو کا اضافہ کیا۔ چنانچہ سراج الدین علیخان آرزو نے منیر لاہوری، حاکم لاہوری، ملا شیدا، سودا، فاخر مکیں اور امام بخش صہبائی وغیرہ وغیرہ تنقیدی کتابیں لکھیں۔

دہلی اجڑنے کے بعد سراج الدین علیخان آرزو لکھنؤ چلے گئے وہاں پر بھی انھوں نے

ادبی سرگرمیاں شروع کردیں اس سے پہلے جب وہ دہلی میں تھے تو وہاں انہیں جو ادبی ماحول پہلے ملا تھا اس میں گرمی اور تیزی پیدا کر دی تھی۔ جس سے وہ اپنے عروج پر پہونچ گئی تھیں۔ نادرشاہ کے حملے سے دہلی بہت اجڑ گئی لیکن ادبی سرگرمیاں اس کے بعد بھی جاری رہیں۔ کبھی آنند رام مخلص کے گھر پر تو کبھی کسی دوسرے کے یہاں یا کبھی وکیل پورہ محلہ میں واقع سراج الدین علیخاں آرزو کے مکان میں شعراء ادباء اور علماء و دانشوروں کا مجمع اکٹھا ہوتا تھا رفتہ رفتہ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اسی درمیان زیب المساجد میں سعد اللہ گلشن کی ادبی محفلیں اور مرزا عبدالقادر بیدل کے مکان پر شعر خوانی کی محفلیں برپا ہوتی تھیں۔ پھر بیدل کے انتقال کے بعد آرزو نے ہر شب جمعہ میں اپنے مکان پر مشاعرہ کرنا شروع کر دیا۔ شاعری کے ساتھ علمی مباحثے بھی بہت زیادہ ہوتے تھے۔ پھر علی حزیں کی اعتدال سے تجاوز کی ہوئی تنقید نے دہلی کے ادیبوں کو متحد کر کے ان کے قلم کی حرکت میں جوش پیدا کر دیا۔ چنانچہ سراج الدین علی خاں آرزو نے انکی سربراہی کی اور علی حزیں کی تنقید اور اعتراضات کا جواب دینے لگے۔ آرزو نے علی حزیں کا جواب دینے میں بہت سخت رویہ اپنایا خواہ وہ تحریری ہو یا زبانی۔ ان کی اس سخت رویہ سے کچھ ہندوستانی شعراء اور دہلی میں مقیم ادباء دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ آرزو کے ساتھ رہا اور دوسرا گروہ علی حزیں کے ساتھ ہو گیا۔ علی حزیں کے گروہ نے آرزو کی سخت تنقید کا جواب بھی دیا۔ اسی موضوع کو لے کر سودا اور فاخر مکیں میں بحث و تکرار ہوئی اور مضمون بازی بھی ہوئی ایک نے اعتراضات کی بوچھار کی تو دوسرے نے اس کے اعتراضات کے جواب کی بارش کر ڈالی علی حزیں کے گروہ کے کچھ لوگوں نے آرزو کی کتاب تنبیہ الغافلین اور احقاق الحق (جو علی حزیں کے کلام پر تنقید ہیں) کا جواب لکھا۔ اسی ادبی لڑائی میں جو علی حزیں اور آرزو کے انتقال کے بعد بھی چلتی رہی امام صہبائی نے بھی حصہ لیا اور آرزو کی کتاب "احقاق الحق" کے جواب میں ان کے مرنے کے بعد "اعلام الحق" کتاب لکھی۔ اس ادبی جنگ نے بارہویں صدی ہجری میں فارسی ادب کے ماحول کو خاصا سرگرم رکھا۔

مختلف تذکروں کو دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس بارہویں صدی ہجری کے نصف اول میں ایک ہزار سے زائد شعراء تھے صرف صحف ابراہیم میں اس صدی کے شعراء کی تعداد ۶۶۵ دی ہوئی ہے۔ ایسے بہت سے شعراء ہیں کہ جنکا نام اس تذکرے میں نہیں آیا ہے وہ دیگر تذکروں میں ملتے

ہیں۔ بھی تذکروں میں عموماً انہیں شعراء کا نام محفوظ ہوا ہے جو تھوڑا مشہور ہو گئے تھے۔ یقیناً بہت سے ایسے شعراء رہے ہوں گے جو گمنامی میں تھے۔ اور ختم ہو گئے۔ ان کا ذکر تذکروں میں نہیں آسکا۔ یہ بات مبالغہ آمیز نہ ہوگی۔ کہ بارہویں صدی ہجری میں جتنے تذکرے لکھے گئے شاید ہی اتنے تذکرے کسی دوسری صدی میں لکھے گئے ہوں گے۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کے تین تذکرے "ید بیضا" "خزانۂ عامرہ" "سرو آزاد" علی حزیں کا تذکرہ "تذکرۃ المعاصرین" آرزو کا تذکرہ "مجمع النفائس" خوشگو کا تذکرہ "سفینۂ خوشگو" علی ابراہیم خاں خلیل کے چار تذکرے "صحف ابراہیم" "خلاصۃ الکلام" "محافل الشعراء" اور "تذکرۂ شعرائے ریختہ" "الفتی کا تذکرہ ایک دوسرے علی ابراہیم کا تذکرہ "گلزار ابراہیم" نقش علی کے دو تذکرے "باغ معانی" اور "تذکرۃ الشعراء" احمد علی سندیلوی کا تذکرہ "مخزن الغرائب" والہ داغستانی کا تذکرہ "ریاض الشعراء" میر تقی میر کے دو تذکرے "نکات الشعراء" اور "ذکر میر" مرزا سرخوش کا تذکرہ "کلمات الشعراء" اور دیگر تذکرے مرآت الخیال "گلزار خیال" وغیرہ وغیرہ اسی بارہویں صدی ہجری میں لکھے گئے۔

بارہویں صدی ہجری میں اتنی زیادہ تعداد میں شعراء کا وجود، تذکرہ نگاروں کا کثرت کے ساتھ تذکرے مرتب کرنا، ادبی بحث و مباحثہ کا ہونا، عمدہ اور اچھی نثری کتابوں کا ملنا یہ سب اس بات کے بیّن ثبوت ہیں کہ بارہویں صدی ہجری میں فارسی کا ادبی ماحول عام طور پر کافی سرگرم رہا۔ اسی صدی میں فارسی ادب کے ساتھ دیگر فنون کی بھی ترویج اور ترقی ہوئی۔

ماخذ و ذرائع

۱۔	مجمع النفائس	سراج الدین علی خاں آرزو	خدا بخش لائبریری پٹنہ	۱۹۷۵ء
۲۔	صحف ابراہیم	ابراہیم خاں خلیل	" "	" " ۱۹۷۸ء
۳۔	خلاصۃ الکلام	" " "	" "	" " ۱۹۷۸ء
۴۔	باغ معانی	نقش علی	" "	" " ۱۹۷۸ء
۵۔	خزانۂ عامرہ	مولانا غلام علی آزاد بلگرامی	نولکشور پریس لکھنؤ	۱۸۷۱ء
۶۔	سرو آزاد	" " " " "	مطبع دخانی لاہور	۱۹۱۲ء

(باقی ص۱۳ پر)

ادبی تنقید کیا ہے؟

(عربی ادب کے حوالے سے)

دوسری اور آخری قسط

شاہد اسلم قاسمی، شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

ایک پہلو سے درہموں کو پرکھنا اور جانچنا۔ یہ سب سے زیادہ مناسب معنی ہے۔ جو نوعی اصطلاح کے مطابق کلمۂ نقد لیا گیا ہے۔ اور دوسرے پہلو سے دیکھا جائے تو اکثر و بیشتر متقدمین کی اصطلاح کے مطابق بھی بہت لائق اور مناسب ہے کیوں کہ اس کے اندر تلاش و جستجو، چیزوں کا باہم مقابلہ و موازنہ ان میں اچھے اور برے کی تمیز اور اس کے علاوہ محکم اور صحیح فیصلہ کا عنصر بھی شامل ہے۔ مگر جب ہم معتبر ناقدین کے اقوال پر غور کریں گے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان معانی کو نقد کی تعریف اس کے خواص اور اس کے عمل کے ذکر میں شامل نہیں کیا ہے۔ اگرچہ "نقد الیسی الشیاء" کا مطالعہ کرنا، انکی تشریح و تجزیہ کرنے اور ان کے مشابہ اور بالمقابل چیزوں سے انکا موازنہ کرنے کا نام ہے۔ پھر اسی کے ساتھ ساتھ ان کی قدر و قیمت اور معیار کو بتانے کے لئے کوئی فیصلہ اور رائے قائم کرنا یہ بات حواس خمسہ، معقولات، علوم و فنون اور اس چیز کو شامل ہوگی جو زندگی سے متعلق ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ متقدمین میں سے جس نے بھی نقد عربی پر لکھا ہے وہ کلمۂ نقد کو ان کے پے در پے معانی پر محمول کرنے کے سلسلے میں زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے اور قدیم ناقدین کو جب ہم پڑھتے ہیں تو یہ بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ کلمۂ نقد انہیں پے در پے معانی کے لئے مستعمل ہوا ہے جیسے قدامہ کی کتاب "نقد الشعر" اور "نقد النثر (جو غلطی سے اس کی طرف منسوب کر دی گئی ہے) ابن رشیق کی کتاب "العمدۃ" جو شعر کی صنعت اور اس پر نقد کے متعلق ہے" پھر اس کے بعد جو کتابیں آئیں وہ شعراء کے درمیان موازنہ سے متعلق تھیں۔ جو تمام تر ہی شعر و نثر کے مطالعہ ان کی تشریح و تفسیر ان کے عناصر اور مضمون کو بیان کرنے اور اسباب پسندیدہ

کی بابت حسن و قبح کے سلسلے میں ان دونوں کتابوں میں پیش کئے گئے تھے۔ جو ان سے متعلق تھیں یعنی ان کے بعد کی کتابوں میں ان کی تشریح و تعریض (نقص) پھر ان کی تشریح و موازنہ، پھر حکم نصائح اور مفید قوانین ہیں۔ جو منظوم و منثور ادب کے متعلق ہیں۔

ہم تنقید کی تعریف کے سلسلے میں جدید اہل فن اور ناقدین کے احوال کو دیکھیں گے۔ چنانچہ ان کے نزدیک کسی بھی فن پارے کا صحیح اندازہ کرنا، اس کی قدر و قیمت بتانا اور دوسری چیزوں کے بالمقابل اس کے معیار کو واضح کرنا نقد ہے اور نقد ادبی' صرف ادب کے ساتھ خاص ہے۔ اگرچہ نقد کا مزاج ایک ہو یا برابر ہو۔ چاہے اس کا موضوع۔ ادب۔ تصور کشی یا موسیقی ہو تو نقد ادبی۔ اصطلاحی طور پر یہ ہیکہ نص ادبی کا صحیح اندازہ اور پرکھ ہو، اور اس کے ادبی معیار اور قدر و قیمت کو بیان کرنا مقصود ہو۔ اس تعریف کی وضاحت کے لئے ہم مندرجہ ذیل چیزوں کا بھی ذکر کر سکتے ہیں۔

(۱) ادب کے وجود میں آنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اور تنقید یہ فرض کرتی ہے کہ ادب عملاً یا واقعتاً پایا جاتا ہے پھر وہ اس کے سمجھنے، اس کی تشریح و تجزیئے، اس کی پرکھ اور اس کے اوپر حکم صادر کرتی ہے۔ اور اپنی رائے بھی پیش کرتی ہے۔

اگرچہ یہ بات تنقید کے اختیار میں نہیں ہوتی کہ وہ ادب کو عدم سے وجود بخشے اور اس سے لطف اندوز ہو۔ درآں حالیکہ تنقید ہی ادب کے اندر نکھار لاتی ہے اور اس کی کاٹ چھانٹ کر کے اس کو مہذب بناتی ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہیکہ فطری ادیب کے اندر ان تینوں صلاحیتوں (یعنی ادب کو وجود بخشنا، اس سے لطف اندوز ہونا اور اس پر تنقید بھی کرنا) کا ایک ساتھ پایا جانا بہت ضروری ہے۔

(۲) یہ تعریف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نقد ادبی کی غرض اول صرف یہ ہیکہ کسی ادبی فن پارے کا صحیح اندازہ لگایا جائے اور اس کو پرکھا جائے۔ یعنی بذاتِ خود اس فن پارے کی کیا قدر و قیمت ہے۔ قواعد اور عوام کے خواص پر قیاس کرتے ہوئے، جن سے کر ادب اعام یا خاص معنی میں ممتاز ہوتا ہے۔ اور تنقید کی یہ قسم توضیحی ہے یعنی جو سمجھنے اور ذوق کو ... کرنے کے سلسلے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ اب اس بات کا ادب کے مقام و مرتبہ کا

دوسری چیزوں کی مناسبت سے لگائیں" تو یہ دوسرے نمبر پر آتی ہے مثلاً ادیبوں کی تربیت ان کی مختلف صلاحیتوں کے لحاظ سے کی جائے۔ یا ان کے مختلف ادبی نمونوں کے درمیان موازنہ کرنے کے لئے کوئی نظام وضع کیا جائے۔ تنقید کی یہ قسم ترجیحی ہے یعنی اس قسم سے ہمیں اس بات میں مدد ملتی ہے کہ ہم یہ جان سکیں کہ ادیبوں کے درمیان افضل کون ہے اور یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کیونکہ شعراء خطباء کاتبین اور مؤلفین کے درمیان بہت زیادہ بنیادی اختلاف پائے جاتے ہیں۔ اور کم ہی لوگ ان میں سے ایسے ہوتے ہیں جن کے باہم مشابہ حالات اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ ان کے درمیان موازنہ کیا جائے۔ جو ان کی باہم نمایاں صلاحیتوں کو محدود کر سکے جیسے کہ سوال کیا جائے کہ جریر، فرزدق اور اخطل میں سے کون اشعر یعنی سب سے بڑا شاعر مانا گیا ہے تو آپ کا صحیح جواب یہ ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک اشعر ہے۔ کیونکہ یہ تینوں شعراء اپنے اندر کوئی نہ کوئی ایسی لفظی معنوی یا موضوعی صفات رکھتے ہیں جو ہر ایک کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے اور ان میں کوئی وجہ اتفاق نہیں پائیں گے۔ جو ان کے درمیان موازنہ کی اجازت دے کیونکہ انسان کے اندر اس کے علاوہ ایک چیز یہ پائی جاتی ہے کہ جس چیز کو وہ پسند کرتا ہے، اس سے وہ متاثر ہوتا ہے۔ اور اس کے علاوہ کو وہ نظر انداز کر دیتا ہے۔

(۳) اور جب بھی تنقید کے عمل اور اس کی غرض و غایت کی تحقیق کا مسئلہ درپیش ہو تو ایک ناقد کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی نظر تیز ہو، دل بیدار ہو، ذوق عمدہ ہو، جذباتی طور پر ادیب سے ہم آہنگ ہو اور ان کے اثرات سے جو اس کے احکام اور رایوں کو فاسد کر دیں بری ہو۔ اور یہ تمام چیزیں ان کے علاوہ ہیں کہ ان کے اندر ادبی و علمی ثقافت ہو، ادب کی مشق ہو، اس کے تاریخی ادوار کی معرفت ہو، دوسرے علوم و فنون سے ادب کے تعلق کا علم ہو۔ اور گہرائی و گیرائی ہو تاکہ اس کے لئے انصاف، صحیح فیصلہ اور رائے دینا ممکن ہو جائے۔

پلوب نے (POB) نے تین اہم مصادر بتائے ہیں جن سے تنقید سیراب ہوتی ہے۔

۱۔ فطرت میں غور و فکر ۲۔ سلف اور متقدمین کے لئے ادبی سرمائے میں غور و فکر ۳۔ عقل کے اندر غور و فکر۔

اور اس کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ اور تنقید ادبی اندر اس کے ساتھ حصہ میں کو جانتے لکھ

مطلب یہ نہیں ہے کہ ادیب ان تینوں کے درمیان تقسیم ہا ہتا ہے۔ اور اس لئے بھی ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی طاقت دوسرے کی طاقت کو مضبوط کرتی ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم پہلے فطرت کی پیروی کریں تاکہ ہمارے لئے متقدمین کے ادبی سرمائے کا مطالعہ آسان ہو جائے۔ کیونکہ قدماء فطرت سے زیادہ قریب تھے۔ اور قدیم شعراء اور فطرت میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ قدماء کے اس ادبی سرمایہ کے مطالعہ کا مطلب ہے کہ فن کا مطالعہ جس کا اطلاق عمل پر ہوتا ہے۔

نقد کا پہلا معنی جو بتایا گیا ہے وہی آج استعمال ہو رہا ہے کیونکہ آج کل کی تنقید میں یہ ہوتا ہے کہ انسان ایک جز کو پرکھتا ہے پھر اس کا موازنہ دوسرے شعراء کے کلام سے کرتا ہے۔ اور فکر و کلام کے اعتبار سے اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرتا ہے۔ ہم اس سلسلے میں دو کتابیں پاتے ہیں ایک "نقد الشعر لِقدامة" اور دوسری نقد النثر۔ کتاب العمدة لابن رشیق"

اور جب ہم تنقید کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نئے دور میں پہلا معنی ہی لیا گیا ہے، یعنی کلام کا موازنہ کرنا، اس کی خوبی و خرابی کو دیکھنا۔ فلسفہ و افکار کی غرض تحلیل اور موازنہ اس کی قدر و منزلت ہے کرنا ہی تنقید کا کام ہے۔

۱ نقد کا کام ادب کے وجود میں آنے کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔ اسی لئے جب نقد موجود ہے تو گویا ادب لازماً موجود ہوگا۔ اس کے بعد یہ فن۔ اس ادبی کلام کی خامیوں اور خوبیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ موجود تو نہیں ہوتا لیکن اس کا اشتہار کرتا ہے۔ اس کو لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔

جو سرمایہ ادب میں موجود ہے اسکو سامنے رکھ کر اس کی تہوں میں جاتے ہیں اور اسکے بعد جو فیصلہ کرتے ہیں؛ یہی تنقید ہے؛ ادیب و نقد کا کام یہ ہے کہ جو اس میدان میں آئے تو وہ مسلح ہو جن موضوعات پر تنقید کی جا رہی ہو اور جن سے تشکیل ہوئی ہو وہ ان سے اچھی طرح واقف ہو اور اگر ایسا نہ ہوا تو وہ تنقید کرنے میں ناقص سمجھا جائے گا۔ یعنی یہ کہ اس کے انا ادبی مبادات، ادبی ثقافت، تاریخی ادوار پر معرفت، فنون سے تعلق، حسن فہم اور پرکھ کی تمام باتیں جانتا ہو۔ ناقد ذہن کے مشتبہات کو ختم کرتا ہے، الحاد کو کھولتا ہے۔ اس

ناقد ایک رابطہ اور ذریعہ ہے قاری وسامع اور فنکار کے درمیان۔ وہ فنکار کے ذہن کو دوبالا کرتا ہے اور اس کی رہبری کرتا ہے اور اسے بھٹکنے نہیں دیتا گویا وہ ایک ہراول دستہ ہوتا ہے قافلہ کے لئے۔ ناقد و ادیب ایک طرح سے قوم کے رہنما ہوتے ہیں۔ لوگ فنکار کو ممتاز دیکھتے ہیں۔ کون سے نظریات ہیں جسکے نتیجے میں مختلف مکتبۂ فکر وجود میں آتے ہیں جیسے متنبی اور جاحظ کا اسکول۔

نقد کا کام اس وقت شروع ہوتا ہے جب ادب عالم تخلیق میں آجاتا ہے، اور جب ادب وجود میں آجائے تو نقد اس کے بعد اپنا فریضہ انجام دیتا ہے۔ نقد سے یہ بات خود آشکار ہو جاتی ہے کہ ادب بالفعل موجود ہے۔ نقد کے توسط سے ادب کو پہچانا جاتا ہے۔ اور اس کی تشریح کی جاتی ہے۔ اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے، اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

نقد کا فن تحریروں کی تنقید کرتا ہے۔ اور ان کو سمجھنے کے لئے ضروری اصول بناتا ہے۔ اس طرح وہ قارئین کے لئے مطالعہ میں آسانی پیدا کرتا ہے اور قارئین و ادبار کے درمیان تعلق قائم کرتا ہے وہ ادبار کی رہنمائی کرتا ہے انہیں بھٹکنے نہیں دیتا۔ ان کی غلطیوں وخامیوں کی نشاندہی کرتا ہے اور ان کو صحیح راستہ بتاتا ہے، اور اگر وہ صحیح ہوتے ہیں تو ان کو متعارف کرتا ہے اور ان کے راستہ کو مضبوط کرتا ہے اور ان کے راستہ کو مضبوط کرتا ہے ان کے لئے ایک کامل مثال وضع کرتا ہے اور صحیح رخ پر لے جاتا ہے۔

وہ ادبار کو بتاتا ہے کہ ان کے بارے میں لوگوں کی کیا رائے ہے اور یہ کہ نقاد نے ان کی کیا قدر و قیمت متعین کی ہے اور ان کی تحریروں پر کتنی توجہ دی ہے وہ لوگوں کو غلو سے روکتا ہے تاکہ لوگوں کے تصورات کو توانائی نصیب ہو جس سے تہذیبی و ثقافتی تعاون وجود میں آتا ہے اور ادب زندگی میں داخل ہوکر اس کے راستوں کو روشن کرتا ہے۔

فن نقد ادبی قارئین کو مختلف گوشوں سے نفع پہونچاتا ہے: (۱) وہ قارئین سے ادبی تحریروں کو قریب کرتا ہے اور ان کو سمجھنے اور ان کی قدر قیمت متعین کرنے میں مدد کرتا ہے. خصوصاً جبکہ قارئین مختلف صلاحیتوں اور مختلف مزاجوں کے طبقہ سے ہوتے ہیں۔ جن میں بعض ادب کی تخلیق کے دور سے قریب اور ادیب کے ملک سے دور ہوتے ہیں۔

نقد کا فن قارئین کے لئے مفید قرأت کے طریقے وضع کرتا ہے۔ کیونکہ ناقد زیادہ ماہر اور سمجھدار ہوتا ہے اور وہ قارئین کی رہنمائی تحریر کے حسن و قوت کے نکات کی جانب کرتا ہے، یا اس کی خامیوں کی نشاندہی کرتا ہے جس سے قارئین کی صلاحیتوں کو جلا ملتی ہے۔

جب تک نقاد ادبار کی گرفت کرتے رہتے ہیں، ادب قوت حاصل کرتا ہے اور ترقی کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ ادبار میں مقابلہ سخت ہو جاتا ہے۔ اور نقد کے احکام و فیصلوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ اور عمدہ فکر، حسین تصور اور بلیغ تعبیر میں مبالغہ کرنے لگتے ہیں۔ اور اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے اور قرار کے درمیان مناسبت پیدا ہو۔ چنانچہ وہ ادب واضح اور جمیل ہوتا ہے اور اعلیٰ مثالوں کا حامل ہوتا ہے اور لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس لئے وہ بیک وقت ایک جمیل اور مفید فن ہوتا ہے۔ اس طرح مصنف اور انشار پرداز ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

تنقید جس میں تخلیق کی بھی شان ہوتی ہے۔ وہ صرف خوبیوں و خامیوں کے بیان پر محدود نہیں رہتی۔ بلکہ آگے بڑھ کر وہ ایسی تجویز پیش کرتی ہے جو ادب کو بیدار کر دے اور اس کے آفاق میں جدید فنون اور پر لطف اسالیب میں ایسے افکار کا ذریعہ بنتی ہے جو ادب کو شاداب اور اس کی ثروت میں اضافہ کرتے ہیں اور وسعت پیدا کرتے ہیں ہم برابر تنقیدی تحریروں کو دیکھتے ہیں کہ وہ قومی، ادبی تحریریں شمار کی جاتی ہیں۔

تنقید کا فن، ادب کے معادن میں اضافہ کرتا ہے اور قلوب پر ادب کا اقتدار قائم کرتا ہے اور ادب کے زمان و مکان اور افراد سے متعلق تعلقات کو واضح کرتا ہے اور اس کی فنی قدر و قیمت کو واضح کرنا، اور ادب کے لئے علوم و فنون میں گنجائش پیدا کرنا ہے خصوصاً اس دور میں جب کہ لوگوں کا رجحان مادی نفع یا سستے ادب کی طرف ہونے لگا ہے۔

تنقید کا موضوع

ادب کا موضوع طبیعت انسانی ہے۔ نقد ادبی کا موضوع نظم و نثر ہے۔ ادب عقل و شعور کی مصوری کرتا ہے اور نقد کا تعلق اس کی شرح تحلیل و تجزیہ معائب و محاسن سے ہے۔ اصول لغت

وقوانین نقد کا پورا احترام نقد کی پاسبانی عبارت ہے، نقد، فکر و تعبیر کی راہوں میں ایک شمع ہے اور تخلیقی ادب کی تاریخ میں معاشی زندگی کا ایک شعبہ ہے۔

ختم شد

بقیہ : ماخذ و ذرائع

۷۔ سفینۂ خوشگو	: بندرابن داس خوشگو	: تیبل پریس پٹنہ	۱۹۵۹ء
۸۔ سفینۂ ہندی	: بھگوان داس ہندی	: " " "	۱۹۵۸ء
۹۔ مرزا عبدالقادر بیدل	: سید نبی ہادی	: علی گڑھ	۱۹۸۲ء
۱۰۔ مردم دیدہ	: عبدالحکیم حاکم لاہوری	: پنجاب یونیورسٹی پریس لاہور	۱۹۶۱ء
۱۱۔ مقالات الشعراء	: قیام الدین حیرت	: دہلی	۱۹۶۸ء
۱۲۔ نکات الشعراء	: میر تقی میر	: انجمن ترقی اردو اورنگ آباد	۱۹۳۵ء
۱۳ نگارستان فارس	: محمد حسین آزاد	: لاہور	۱۹۱۲ء
۱۴۔ تذکرہ نویسی در ہند و پاک	: سید علی رضا نقوی	: علی اکبر علی چاپخانہ تہران	۱۹۶۴ء
۱۵۔ ذکر میر	: میر تقی میر	: انجمن ترقی اردو اورنگ آباد	۱۹۲۸ء
۱۶۔ شمع انجمن	: نواب محمد صدیق حسن خاں	: بھوپال	۱۲۹۲ھ

عہد مغلیہ یورپی سیاحوں کی نظر میں

(۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۷ء) قسط (۱)

ڈاکٹر محمد عمر شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

سر تھومس رو (۱۶۱۵ء۔۱۶۱۹ء)

سوانح عمری! ۱۵۸۰ء یا ۱۵۸۱ء میں تھومس رو کی لیٹن میں ولادت ہوئی تھی۔ وہ رابرٹ رو کا بیٹا تھا اور سر تھومس رو کا پوتا۔ کم سنی ہی میں اس کے والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ مشہور برکلے خاندان میں اس کی ماں نے دوسری شادی کرلی تھی۔ آکسفورڈ کے مگاڈین کالج میں اس نے ۱۵۹۳ء میں داخلہ لیا تھا۔ ملکہ الزبتھ کے محافظ دستے کا اسے ایک اعلیٰ افسر بنادیا گیا تھا اور دو سال بعد اس کے جانشین نے اسے نائٹ کا منصب عطا کیا تھا۔ ۱۶۱۴ء کی اڈلڈ پارلیمنٹ میں ٹوم ورتھ کے ایک نمائندہ کی حیثیت سے وہ شریک ہوا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے اس کا انتخاب مغل بادشاہوں کے دربار میں بحیثیت ایک سفیر بھیجنے کے لئے کیا اور انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کمپنی اس کے تمام اخراجات برداشت کرے گی۔ اس پر سخت پابندیاں عائد کردی گئی تھیں کہ "بذات خود وہ نجی تجارت سے الگ تھلگ رہے گا، حتی الوسع دوسروں کو بھی اس کام سے روکے گا اور کمپنی کے گماشتوں کے تجارتی سامان کے معاملے میں بھی مداخلت کرنے سے خود کو باز رکھے گا۔"

جیمس کی طرف سے اسے ایک تعارفی خط بھی دیا گیا۔ ۲، فروری ۱۶۱۳ء کو ٹلبری ہوپ سے لوئن نامی بحری جہاز پر سوار ہوکر وہ ہندوستان کے لئے روانہ ہوا۔ ۱۸، ستمبر ۱۶۱۵ء کو اس کا جہاز سوئلی ہول نامی بندرگاہ میں لگا۔ ۲۳، دسمبر ۱۶۱۵ء کو وہ اجمیر پہونچا۔ ۱۰، جنوری ۱۶۱۶ء کو وہ دربار میں حاضر ہوا۔

اسی سال ماہِ نومبر میں جہانگیر نے اجمیر سے کوچ کیا اور رو اس کے پیچھے پیچھے منڈو پہونچا۔ وہاں اسے ایک ویران مسجد میں قیام کے لئے جگہ ملی۔ اکتوبر ۱۶۱۷ء میں شہنشاہ نے احمد آباد کے لئے کوچ کیا اور دربار کے ساتھ رو وہاں پہونچا (۱۵ دسمبر) کو وہ شہر میں پہلے ہی پہونچ گیا۔ فروری ۱۶۱۸ء میں بادشاہ شکار کھیلنے گیا جس کی وجہ سے رو کو سرسری نظر سے برہانپور دیکھنے کا موقع مل گیا۔ ماہ مئی کے شروع میں وہ احمد آباد واپس آگیا اور وہاں اسے معلوم ہوا کہ پورے زوروں پر وبا پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے سارے رفقاء کار اس بیماری کے زد میں آگئے تھے۔ ان میں سے سات افراد مر بھی گئے۔ ماہ اگست میں بادشاہ نے دارالخلافہ کے لئے واپسی کی تیاری کی۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ دارالخلافہ میں اس کا قیام بے سود ثابت ہوگا۔ رو نے واپس جانے کی اجازت مانگی جو منظور کرلی گئی۔ بادشاہ کی طرف سے جیمس بادشاہ کے نام ایک خط اسے دیا گیا۔ اسے ایک فرمان دیا گیا کہ "شاہ مغلیہ کی مملکت میں انگریزوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے گا اور ان کے یہاں برابر آنے جانے پر کوئی پابندی نہ ہوگی"۔ ۱۷ فروری ۱۶۱۹ء کو رو ہندوستانی ساحل سے واپسی کے لئے روانہ ہوا۔

ہندوستان میں اپنے قیام کے دوران رو نے اپنے عہدے کی عظمت کو برقرار رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ اور اکثر و بیشتر اس بات پر زور دیا کہ اس کے ساتھ ایک فرد کی حیثیت سے برتاؤ ہونا چاہیئے۔

رو انگلستان واپس آیا اور کچھ دنوں پارلیمنٹ میں شرکت کی لیکن دوبارہ اسے باب عالی (ترکی حکومت) کی خدمت میں ایک خاص مقصد سے بھیجا گیا۔ ماہِ جنوری ۱۶۳۹ء میں اسے گارٹر کے اعزازی سلسلے کے چانسلر کا عہدہ تفویض کیا گیا۔ ماہِ جون ۱۶۴۰ء میں شیران شاہی کی رکنیت کی اسے حلف دلوائی گئی۔ آکسفورڈ کی طرف سے بحیثیت ایک رکن اس نے پارلیمنٹ میں شرکت کی۔ بعد ازیں ایک سفیر کی حیثیت سے وہ جرمنی گیا (۱۶۴۱ء) وہاں سے وہ واپس آیا اور ماہِ جولائی ۱۶۵۳ء میں ہاؤس آف کومنس (لوک سبھا) سے بچ چلے جانے کی اجازت مانگی۔ غالباً وہیں اس کا انتقال ہوا۔ اور وڈفورڈ کے گرجے میں غیر رسمی طور پر اسے دفن کردیا گیا (ماہ نومبر ۱۶۴۴ء)

ہکلیٹ سوسائٹی نے اس کے سفر نامے کو دو جلدوں میں شائع کر دیا ہے جس کی تدوین
یم فورسٹر نے کی تھی۔

(۱) شہر اور قصبات جو اس نے دیکھے تھے

چتوڑ :

روؔ نے چتوڑ کا قلعہ دیکھا تھا۔ اس نے اس قلعے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے "ایک پہاڑی پر ویران اور برباد ایک شہر ہے لیکن پھر بھی وہ تعجب خیز ایک مقبرہ معلوم ہوتا ہے"۔

سورت :

سورت میں محصول خانہ کو " الفنڈیگا" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ ہر چیز کی وہاں جانچ ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہاں کا گورنر وہاں خود جاتا اور معائنہ کرتا۔ سورت میں ایک سبزہ زار میدان بھی تھا جہاں گورنر اور اس کے ساتھی شکار اور پولو کھیلا کرتے تھے۔ یہاں وہ پیچھے کی طرف "ایک چھڑ کے اوپر رکھے ہوئے شتر مرغ کے انڈے کے خول پر یا میدان میں بنے ہوئے ایک نقطے پر تیر وکمان چلا کر اپنی دسترس دکھایا کرتے تھے۔ اپنی بندوقوں سے وہ لوگ اس چال کو دہراتے تھے۔ وہ لوگ اپنے شکار کا روپ بھر کر نیزوں سے اس کا شکار کرتے تھے۔

(۲) بادشاہ ۔ ذاتی حالات

انگریزی سواری گاڑی اور تلوار سے جہانگیر کی دلچسپی :

تھومس رو نے بادشاہ کی خدمت میں جو تحفے پیش کئے تھے ان میں انگریزی ایک سواری گاڑی بھی شامل تھی۔ اس گاڑی کو دیکھ کر بادشاہ بہت خوش ہوا تھا۔ یہاں تک کہ رات کو وہ اس پر سوار ہوا تھا اور روؔ کے دو تین آدمیوں سے اس نے یہ کہا کہ " تھوڑی دور وہ اسے کھینچ کرلے جائیں "۔ اسی طرح وہ انگریزی تلوار کا بھی گرویدہ ہو گیا تھا۔ اس نے روؔ سے یہ کہا کہ وہ ایک

ایسا آدمی بھیج دے جو انگریزی طرز پر اس کے اسکارف (رومال) اور تلوار باندھ دے۔ اس کے حکم کی تعمیل کی گئی اور بڑے فخریہ انداز میں پینترے بدلتے اور تلوار کھینچتے ہوئے وہ اوپر نیچے چڑھتا اور اترتا رہتا تھا۔ عوام میں وہ ہمیشہ اس تلوار کو لٹکا کر نکلتا تھا۔

شراب کی طرف جہانگیر کی رغبت!

رو نے لکھا ہے کہ جہانگیر سرخ شراب پینے کا بے حد دلدادہ تھا۔ اپنا جشنِ ولادت منانے کے موقع پر (۲ ار ستمبر ۱۶۱۶ء) اس نے رو کو کہلا بھیجا جو وہاں موجود تھا کہ وہ اگر شراب نوش کرے۔ اس کے بعد اس نے اس کے لئے تھوڑی سی شراب بھیجی۔ وہ شراب اتنی سخت تھی کہ رو کو چھینکیں آنے لگیں۔ اس انگریز آدمی کے لئے وہ شراب ایک پیالے میں لائی گئی تھی جس پر یاقوت اور رسان کے چھوٹے پتھر جڑے ہوئے تھے۔ اس پیالے کے غلاف پر بھی یاقوت، فیروزہ اور زمرد ٹکے ہوئے تھے۔ جہانگیر نے جب اسے چھینکتے ہوئے دیکھا تو اس نے "سونے کی ایک تشتری" میں رو کے لئے تریاق بھیجی۔ وہ سب چیزیں اسے دیدی گئیں۔

لطف وکرم کی علامت کے طور پر شکاری جانور بھیجنا!

اگر بادشاہ کسی کو شکار کیا ہوا جانور بھیجتا تو اس کو بڑے لطف وکرم کی بات سمجھی جاتی۔ ایک مرتبہ جہانگیر شکار کھیلنے گیا اور اس نے اپنے ہاتھوں شکار کردہ ایک سور رو کو بھیجا۔ دوسرے ایک موقع پر اس نے موٹا ایک جنگلی سور مارا اور رو کو بھیج کر اسے اس بات پر خوشی منانے کا حکم دیا۔ اس کے بعد اس نے رو کو ایک جنگلی سور بھیجا۔ ایک بار شکار کھیل کر واپسی کے بعد رو اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے دیکھا کہ جہانگیر کے سامنے شکار کردہ جانور پڑے ہوئے ہیں جن میں بہت سی مچھلیاں اور شکاری پرندے شامل تھے۔ بادشاہ نے رو کو حکم دیا کہ وہ بذات خود اپنے حصے کا انتخاب کرلے اور بقیہ کو اس نے اپنے امیروں میں تقسیم کر دیا۔

جھروکہ درشن! دو "چوکیوں" پر پردوں کے پنکھے لئے ہوئے دو خواجہ سرا کھڑے بادشاہ

پنکھے جھل رہے تھے۔ اسے بہت سے تحفے پیش کئے جا رہے تھے اور وہ بہت سے عطیے دے رہا
تھا۔ ان چیزوں کو جو وہ دے رہا تھا انھیں حلقے دار ایک آنے میں لپیٹ کر ریشمی ایک ڈوری کے
ذریعہ نیچے کر دیا جاتا تھا۔ جو چیزیں اسے پیش کی جاتی تھیں انھیں ایک بوڑھی خادمہ یکجا کرکے دوسرے
ایک طریقے سے ایک سوراخ سے اوپر کھینچ لیتی تھی۔

شاہی بیگمات کی ایک جھلک:

رو خوش نصیب تھا کہ اُسے جھروکے میں شاہی حرم کی بیگمات کی ایک جھلک دیکھنے کا موقع مل
گیا اس واقعہ کو وہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ "کھڑکی کی ایک سمت اس کی دو خاص بیگمات بیٹھی
ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھنے کی ان کی خواہشات نے سرکنڈے کے اس جنگلے میں جو ان کے سامنے تھا۔
چھوٹے چھوٹے سوراخ کرنے پر انھیں مجبور کر دیا۔ سب سے پہلے مجھے ان کی انگلیاں دکھائی دیں اور
اس کے بعد وہ اپنے چہروں کو کبھی اِدھر سے اور کبھی اُدھر سے دکھاتی تھیں۔ بعض مرتبہ ان کا پورا جسم
نظر آجاتا۔ بلاشبہ ان کے کالے سفید بال بڑے خوشگوار انداز سے سجے ہوئے تھے لیکن اگر ان کی
طرح کے میرے پاس الماس اور موتی ہوتے تو وہ انھیں دکھانے کے لئے کافی ہوتے۔ جب میں نظر اٹھا کر
ان کی طرف دیکھتا تو وہ پیچھے ہٹ جاتیں اور وہ اتنی خوش تھیں کہ میرے خیال میں وہ مجھ پر ہنس
رہی تھیں۔"

سفر کے موقع پر شاہی بیگمات!

(طویل ایک سفر کے موقع پر) شاہی محل کی مستورات شاندار طریقے پر سجے ہوئے پچاس
ہاتھیوں پر سفر کرتی تھیں۔ ان میں سے تین ہاتھیوں پر طلائی ہودے ہوتے تھے اور ادھر اُدھر باہر دیکھنے
کے لئے" طلائی تاروں کی جالیاں لگی ہوتی تھیں۔ نقرئی کپڑے کی ایک چھتری ان کے اوپر ہوتی تھی
بالعموم دوران سفر میں ان کی سواری، سواروں کے دستوں سے ایک میل پیچھے رہتی تھی۔

جہانگیر کے مذہبی عقائد!

رو نے لکھا ہے کہ" موجودہ بادشاہ ایک نئے تصور کی پیداوار ہونے کی وجہ سے اس کے

کبھی ختنے نہ ہوئے تھے اور بلا کسی مذہبی تعلیمات کی اس کی نشوونما ہوئی تھی۔ اس لمحہ تک وہ اکثر طرح کا ہے اور وہ ایک دہریہ ہے۔ بعض مرتبہ وہ ایک مسلمان ہونے کا اقرار کرے گا لیکن ہندوؤں کے ساتھ ہمیشہ ان کے رسوم اور تہوار مناتا ہے۔ وہ تمام مذاہب کو اچھا سمجھتا ہے لیکن وہ کسی ایک مذہب سے محبت نہیں کرتا بلکہ صرف اس سے جو تغیر پذیر ہو۔"

اسکی ظرافت!

ایک مرتبہ جہانگیر نے رو سے کچھ انگریزی گھوڑے مہیا کرنے کے لئے کہا۔ اس سفیر نے یہ عذر کرتے ہوئے کہا کہ ایسی چیزوں کے لانے کے لئے راستہ بند تھا اور بحری راستے سے انھیں لانا بہت مشکل تھا۔ بادشاہ نے کہا کہ اگر وہ ۸ یا ۹ گھوڑے پانی کے ایک جہاز پر سوار کریں تو ان میں سے ایک تو بچ ہی سکتا تھا۔ قدرتی طور پر وہ لاغر اور کمزور ہوگا لیکن وہ اسے کھلا پلا کر موٹا کرے گا۔ دوسرے ایک موقع پر تفریح طبع کے لئے ٹہلتے ہوئے جہانگیر نے رو کو کچھ باتیں کرنے کا حکم دیا۔ اس انگریز نے ایک ترجمان کی مانگ کی۔ بادشاہ نے یہ کہکر اس بات کو رد کردیا کہ اسے ٹوٹی پھوٹی فارسی میں گفتگو کرنی چاہیئے۔ رو نے حکم کی تعمیل کی۔ بادشاہ بہت خوش ہوا۔

ایک سادھو سے اس کی ملاقات!

راجستھان میں واقع ٹوڈا نامی مقام پر جہانگیر کی ایک سادھو سے ملاقات کا رو نے ذکر کیا ہے: میں نے بادشاہ کو اپنے تخت پر جلوہ افروز اور اس کے قدموں پر ایک فقیر کو بیٹھا ہوا دیکھا جو غریب ایک بے وقوف آدمی تھا اور اس کے سارے جسم پر بھبھوت ملی ہوئی تھی۔ ایک نوجوان پیوند لگے ہوئے ایک نمدا کو اوڑھے ہوئے اس کی خدمت کر رہا تھا۔ وہ مفلوک الحال مصیبت زدہ سادھو چیتھڑا پہنے ہوئے تھا۔ اس کے سر پر پروں کا تاج تھا اور جسم پر بھبھوت ملی ہوئی تھی۔

بادشاہ نے تقریباً ایک گھنٹے ایسی بڑی بے تکلفی اور لطف وکرم کا مظاہرہ کرتے ہوئے

ننگوں کی جو یکسانی بادشاہوں میں نہیں پائی جاتی تھی۔ وہ بھکاری بیٹھ گیا لیکن اس کے لڑکے
نے بیٹھنے کی ہمت نہ کی۔ اس نے بطور نذر بادشاہ کو ایک روٹی پیش کی جسے کوئلے میں سینکا
گیا تھا۔ اس پر راکھ لگی ہوئی تھی، وہ روٹی موٹے اناج کی بنی ہوئی تھی۔ اس روٹی کو بادشاہ
نے بڑی خوشی سے قبول کیا اور اس میں سے ایک ٹکڑا توڑا اور اس کو کھا لیا جس کا کھانا نفاست
پسند منہ بڑی مشکل سے قبول کرے گا۔ اس کے بعد اس نے وہ چھیتڑا اٹھایا، اس کو لپیٹ
لیا اور اس غریب آدمی کی چھاتی پر رکھدیا۔ بادشاہ نے سو روپے منگوائے اور اپنے ہاتھ
سے بذات خود اس کی جھولی میں ڈالدیئے۔ اوران کے علاوہ جو گر پڑے انھیں اس کے لئے
جمع کر لیا گیا۔ جب بادشاہ کے لئے خورد و نوش کی چیزیں لائی گئیں، تو جو چیز وہ کھانے کے لئے
اٹھاتا اس میں سے توڑ کر آدھا وہ فقیر کو دیدیتا۔ بہت سی مذلتوں اور مہربانیوں کے بعد وہ
اٹھا، اس مصیبت زدہ بوڑھے کو، جو چست اور پھرتیلا نہ تھا، اپنی باہوں میں اٹھالیا، جسے کوئی
صاف ستھرا انسان نہ اٹھاتا، اس سے بغلگیر ہوا اور اس کے سینے پر تین مرتبہ اپنا سر رکھا اسے
بحیثیت ایک باپ کے مخاطب کیا، وہ ہم سب کو چھوڑ کر چلا گیا۔ اور میں ایک ملحد بادشاہ میں
ایسے اوصاف حمیدہ کی تعریف کرتا رہا۔"

بادشاہ کا کسی کو کچھ دینا عطیہ سمجھا جاتا تھا!

جب بادشاہ کسی کو کوئی چیز عطا کرتا تھا تو پانے والے سے اس بات کی توقع کی جاتی تھی کہ وہ
گھٹنے کے بل بیٹھ کر اور سجدہ کر کے وہ چیز قبول کرے۔ جب آصف خاں نے رو کے معاملے کی پیروی
کی اور اس کی شکایتوں کی سماعت کی گئی تو بادشاہ نے اس تشتری میں سے جس میں سے وہ خود
کھا رہا تھا پان کے دو ٹکڑے اسے (خان موصوف کو) عطا کئے۔"

ایک امیر کی دعوت کو بادشاہ کی پذیرائی!

ایک مرتبہ آصف خاں نے اپنے گھر بادشاہ (جہانگیر) کو مدعو کیا۔ رو کے اندازے کے مطابق
اس امیر کا گھر شاہی محل سے انگریزی ایک میل کی دوری پر واقع تھا۔ اس راستے پر مخمل اور ریشم

کے فرش بچھے ہوئے تھے۔ جب بادشاہ اس فرش پر چل کر نکل گیا تو اسے لپیٹ لیا گیا۔ اس ضیافت میں آصف خان نے ۶ لاکھ روپے صرف کئے تھے۔

برہانپور میں پرویز کا دربار:

دربار کے باہر دو قطاریں باندھ کر ایک سو گھوڑ سوار دونوں طرف کھڑے تھے۔ دربار کے اندر ایک اونچے دالان میں پرویز بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دالان گول تھا۔ اس کے سر کے اوپر ایک چھتری تھی اور سامنے قالین بچھی ہوئی تھی۔ تخت پر چڑھنے کے لیے نیچے تین سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان لوگوں کی ایک قطار میں سے ہوکر رو اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور دور سے ایک کٹہرے کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا۔ کٹہرے کے قریب اس نے پہلی مرتبہ رسوم تعظیم ادا کئے۔ سر جھکائے ہوئے وہ کٹہرے کے اندر داخل ہوا۔ شہر کے تمام بڑے لوگ ہاتھ باندھے وہاں کھڑے تھے۔ وہاں ایک شاندار شامیانہ لگا ہوا تھا۔ اور نیچے زمین پر قالین بچھی ہوئی تھیں۔ رو کو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں کھڑا ہو۔ لہذا وہ دائیں طرف بڑھا اور شہزادہ کے روبرو سیڑھیوں کے قریب جاکر کھڑا ہوگیا جن پر معتمدین کھڑے تھے اور جو کچھ شہزادہ کہتا تھا وہ قلم بند کر لیتے تھے۔

اپنے کو نیچے کھڑا ہوا دیکھ کر رو نے اوپر جانے اور جاکر شہزادہ کے قریب کھڑے ہونے کی اجازت مانگی۔ اس سے کہا گیا کہ اس بات کی اجازت نہ تو ترکوں کے بڑے بادشاہ اور نہ شاہ ایران کو، اگر وہ یہاں موجود ہوتے، دی جاسکتی تھی۔ رو نے یہ کہکر معذرت چاہی کہ وہ درباری رسوم سے ناواقف تھا لیکن رو سے دوبارہ یہ غلطی سرزد ہوئی جب اس نے یہ مطالبہ کیا کہ اسکے ساتھ "ویسا سلوک" کیا جائے جیسا کہ ترکی کے سفیروں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ یہ سن کر پرویز نے کہا کہ پہلے ہی سے اس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کیا جارہا تھا۔

اس بات سے رو کو اطمینان نہیں ہوا۔ اس کے بعد بیٹھنے کے لیے اس نے کرسی کا مطالبہ کیا۔ اسے مطلع کیا گیا کہ دربار میں کسی شخص کو بیٹھنے کی اجازت نہیں دی جاتی بلکہ استحقاق خصوصی کے مطابق اگر وہ ایسا چاہتا ہو تو شامیانہ کے روپہلی کھمبوں میں ٹیک لگاکر وہ آرام کرلے۔ بعد میں اسے اس بات سے مطلع کیا گیا کہ اگر وہ شہزادہ کے "قریب تک جانا چاہتا ہو" تو وہ کسی اور جگہ ایسا کرسکتا

ہا لیکن کبھی دربار میں نہیں۔ (نومبر ۱۸ ؍ سنہ ۱۶۱۵ء)

شہزادہ خرّم!

روؔ نے شہزادہ خرّم کا کردار ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"وہ سنجیدہ تھا، رشوت خور، مغرور اور اپنی قوت کو جانتا تھا" ۹ ؍ نومبر سنہ ۱۶۱۶ء کی ایک رات کو جب وہ خیمہ زن تھا تو خرّم نے روؔ کو اپنے خیمہ میں طلب کیا۔ اپنے ملازم کے ساتھ روؔ جلدی سے وہاں پہونچا لیکن شہزادہ سے ملاقات کرنے کے لئے اسے چھ گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ جب اسے پیش کیا گیا تو اس وقت شہزادہ غسل خانہ میں پوری توجہ کے ساتھ تاش کھیلنے میں مصروف تھا۔ خرّم نے اسے اپنا خلعت تفویض کیا "شہزادہ جس خلعت کو پہنے ہوئے ہو اسے کسی کو عطا کرنا یا اس کے کندھے پر نئی ایک خلعت ڈالنا یہاں یہ بات بڑی نوازشوں میں شمار کی جاتی ہے"۔ اس نے لکھا ہے۔

خسرو شہزادہ!

روؔ نے لکھا ہے کہ "چونکہ ایسا ایک وقت آئے گا کہ اس مملکت کا سب کچھ اشتعال کی لپیٹ میں آجائے گا۔ اگر سلطان خسرو نے اپنے موروثی حق کو حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کرلی تو اس کی مملکت عیسائیوں کے لئے مقدس ایک مقام بن جائے گا۔ کیونکہ وہ ان سے محبت کرتا ہے اور ان کا احترام کرتا ہے۔ ان کے علم و ادب، بہادری اور میدان جنگ میں ان کے ڈسپلن کو سراہتا ہے اور ہر قسم کی خاطر و تواضع سے نفرت کرتا ہے اور اپنے آباء و اجداد اور امیروں کی رشوت خوری کو قابلِ نفرت سمجھتا ہے۔ اگر دوسرا (شہزادہ) خرّم کامیاب ہوتا ہے تو ہم خسارے میں رہیں گے کیونکہ وہ اپنے عقیدے میں بہت راسخ العقیدہ ہے۔ وہ تمام عیسائیوں سے نفرت کرتا ہے۔ وہ متکبّر، دقّتِ نظر کا حامل، دروغ گو اور وحشیانہ طور پر ظالم ہے"۔

معتوب ایک شہزادہ:

اجمیر شہر سے جہانگیر جب اپنے پڑاؤ کی طرف جا رہا تھا جو شہر کے باہر دو کوس کی دوری

پر واقع تھا تو اس نے خسرو کے مکان کے سامنے اپنی سواری روکی اور اسے اپنی خدمت میں بلایا۔ شہزادہ اپنے ہاتھوں میں ایک تلوار اور چھوٹی سی ایک ڈھال لے کر حاضر ہوا۔ "اس کی داڑھی اس کے جسم کے نصف حصے تک بڑھی ہوئی تھی" اور اس نے تسلیمات ادا کئے۔ بادشاہ نے اسے بلا سوار کے ایک ہاتھی پر سوار ہونے اور اس کے عقب میں چلنے کا حکم دیا۔ غربا میں ایک ہزار روپے تقسیم کرنے کا بھی اس نے حکم دیا۔ آصف خاں اور دوسرے وزرا ر پیدل چل رہے تھے۔

(۳) دربار اور وہاں کے ضوابط

دربار اور تسلیمات کا بیان؛

سارا دربار تین حصوں میں منقسم تھا، ان میں سے ہر ایک کے چاروں طرف ایک کٹہرا تھا۔ پہلے کٹہرے میں ٹرو کو دو آدمی ملے اور وہ اسے آگے لے گئے۔ جب وہ پہلے کٹہرے میں داخل ہوا تو اس نے شہنشاہ کی خدمت میں پہلی بار تسلیمات ادا کئے، اور دوسری بار دوسرے کٹہرے میں پہونچکر اور تیسری مرتبہ جب وہ بادشاہ کے نزدیک پہونچ گیا تھا۔ دربار وسیع تھا۔ اور ہر طبقے کے لوگوں کا وہ مرجع تھا۔ سفرا، مملکت کے بڑے لوگ اور مخصوص ہیئت کے مسافر تیسرے کٹہرے میں کھڑے ہوئے تھے جو زمین سے بلندی پر بنایا گیا تھا جس پر ریشم اور مخمل کے شامیانے لگے ہوئے تھے۔ زمین پر عمدہ قالینیں بچھی ہوئی تھیں۔ "ارذال لوگ" جن کا عوام میں شمار ہوتا تھا۔ تیسرے کٹہرے میں جمع ہوتے تھے۔ اور عوام اس کے باہر معمولی دربار میں۔

شہنشاہ کا یوم ولادت؛

ایسے ایک موقع پر ٹرو دربار میں موجود تھا۔ (۲۰ ستمبر ۱۶۱۶ء کو اجمیر میں) ہونے والے وزن مقدس کی ادائیگی کے رسوم کے دیکھنے کا اس نے موقع کھو دیا۔ لیکن اس نے دوسرے جشنوں کا مشاہدہ کیا۔ پہلے موقع کے جشن کا بیان اجمالی ہے شاہی ہاتھی، سونے کی زنجیریں گھنٹیاں، سونے کے ہودے، چاندی کے ملمع جھنڈے، ایسے موقع کے مناظر تھے۔ ایسے ۱۲ ہاتھی بادشاہ کے سامنے سے گذرے، جن میں سے سب سے پہلے کے " ماتھے اور چھاتی کی چادروں میں یاقوت اور زمرد جڑے ہوئے تھے۔

دوسری مرتبہ (۱ ستمبر ۱۶۱۷ء کو) منڈو میں اس نے مکمل طور پر یہ جشن مشاہدہ کیا۔ ایک باغ کے وسط میں ایک مینار نصب کیا گیا جہاں ایک ترازو لٹکایا گیا۔ اس ترازو کی ڈنڈی پتلے سونے کی بنی ہوئی تھی اور پلڑے وزنی سونے کے، جن کے کناروں پر قیمتی پتھر لگے ہوئے تھے۔ بادشاہ کے وہاں پہونچنے سے پہلے سارے امراء قالینوں پر بیٹھے ہوئے تھے اس موقع پر بادشاہ کا جسم الماسوں، یاقوتوں اور موتیوں وغیرہ سے لدا ہوا تھا جو بہت زیادہ بڑے اور چمکدار تھے۔ جہانگیر اپنی ہر انگلی میں تین انگوٹھیاں پہنے ہوا تھا۔ وہ ایک پلڑے میں چڑھا اور بیٹھ گیا اور اس کو تولا گیا۔ ہر وہ چیز جس سے اسے تولا گیا تھا اسے بڑی احتیاط سے اندر لے جایا گیا۔ چاندی کے علاوہ دوسری کسی چیز کو تولا نہیں گیا۔ سب سے پہلے چاندی کے بورے ایک پلڑے میں رکھے گئے اور انھیں چھ مرتبہ بدلا گیا۔ اس کے بعد طلائی زیورات اور بیش بہا پتھر لائے گئے جو بوروں میں بھرے ہوئے تھے اور انھیں پلڑے میں رکھا گیا۔ انھیں ہٹا کر ان کی جگہ پر طلائی ریشمی اور کتانی کپڑے، گرم مسالے اور ہر قسم کی چیزیں پوٹریوں میں رکھی گئیں۔

جب وزن ہو چکا تو بادشاہ پلڑے سے نیچے اتر آیا۔ اور جاکر تخت پر بیٹھ گیا۔ وہاں سے اس نے بادام، اگری دار میوے، پھل اور گرم مسالے مجلس میں لٹائے جو چاندی کے ورقوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ پیٹ کے بل لیٹ کر شرفاء لوگ انھیں لوٹنے کے لئے آپس میں گتھم گتھی کرنے لگے۔ رات کے وقت بادشاہ نے اپنے امیروں کے ساتھ شراب پی۔

جشن نوروز (۱۱ مارچ ۱۶۱۶ء) :

دربار میں زمین سے چار فٹ کی بلندی پر ایک تخت کھڑا کیا گیا۔ اس کے پیچھے ۵۶ قدم طول اور ۴۳ قدم چوڑائی کا مستطیل نما زمین کا حصہ کٹہرے سے گھیر دیا گیا۔ اس کے اوپر شاندار شامیانے لگا دئے گئے۔ جن کے لٹھے سونے چاندی سے منڈھے ہوئے تھے۔ اس زمین کے اگلے اگلے سرے پر فارس کی قالینیں بچھا دی گئیں۔ اس شامیانے کے نیچے تمام شرفاء بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے جمع ہو گئے۔ یہ لوگ ان کے علاوہ تھے جو تخت کی دائیں طرف کے چھوٹے کٹہرے میں تھے اور جنھیں احکام صادر ہوتے تھے۔

اس مربع زمین کے اندر چاندی کے مکانات نمائش کے ساتھ ساتھ بطور عجوبہ رکھے ہوئے تھے اور بادشاہ کی آرام کرسیوں میں موتی اور جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ وہ تحائف اور نذرانے قبول کر رہا تھا۔ آخر میں بذات خود اس نے تحفے اور گھوڑے عطا کئے۔

بائیں سمت شہزادہ خرم کے لئے علیحدہ ایک خیمہ تھا۔ اس کی ساخت چوکور تھی اور لٹھوں پر چاندی کی پرت چڑھی ہوئی تھی اور سیپی جڑی ہوئی تھیں۔ پردوں کے کپڑوں کے کناروں پر طلائی کپڑے لگے ہوئے تھے۔ اوپر حصے میں اچھے موتیوں کی ایک جھالر لٹکی ہوئی تھی۔ انار، نارنگی، ناشپاتی اور اسی قسم کے مصنوعی پھل اس پر لٹک رہے تھے۔ اس کے تحت کے آس پاس اشراف کے خیمے لگے ہوئے تھے۔

دربار میں اور اس کے باہر بادشاہ کو نذریں پیش کرنا!

دربار کی یہ رسم تھی کہ جو شخص بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا وہ اسے تحفے تحائف پیش کیا کرتا تھا۔ جن لوگوں کی بادشاہ تک رسائی نہ ہوتی تھی اور اس سے بات کرنے کا موقع نہ ملتا تھا وہ یا تو اپنے تحفے اندر بھجوا دیتے تھے یا نہ بھیجتے تھے۔ چاہے ایک ہی روپیہ کیوں نہ ہو وہ اس کو قبول کر لیتا تھا اور ان کا کام کر دیتا تھا۔ رو نے جہانگیر کی خدمت میں نذرانے میں ایک انگریزی گاڑی، انگریزی ایک گلو بند، چین کا بنا ہوا ایک خوبصورت پلنگ، جاپانی بکسے، اور دوسرے تحفے پیش کئے تھے۔ ان چیزوں کی ایک فہرست مرتب کرکے رضا بیگ نے دربار میں سنائی تھی۔ رو نے لکھا ہے کہ "یہ تحائف دربار میں پیش نہیں کئے گئے تھے بلکہ ان کی قیمت سنائی گئی تھی"۔ یہ بھی ایک دستور تھا کہ اگر بادشاہ کا کسی کے مکان کے سامنے سے گذر ہوتا تو مکان مالک بادشاہ کی خدمت میں کوئی نہ کوئی نذر پیش کرتا۔ یہ نذر "مبارک" کے نام سے یاد کی جاتی تھی۔ ایسے ایک موقع پر رو نے جہانگیر کی خدمت میں نقشوں کی ایک کتاب پیش کی تھی۔

شراب پی کر کوئی شخص غسل خانہ میں داخل نہیں ہوسکتا تھا!

حالانکہ شراب ایک "عام اور نمایاں برائی تھی" تاہم بعض موقعوں پر اس پر سخت

بندی عائد کردی جاتی تھی۔ اسی بنا پر شراب کے نشے میں کوئی شخص غسل خانے میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے والوں کے منہ دربان سونگھتا تھا۔ اگر کوئی شخص اپنے ساتھ شراب لے کر جاتا تو اسے اندر جانے سے روک دیا جاتا۔ اگر بادشاہ کو غیر حاضری کا علم ہو جاتا تو وہ شخص بڑی مشکل سے کوڑے کھانے سے بچ سکتا تھا۔" یہ کوڑا ایک بڑا خطرناک آلہ تھا جس کے سرے کی چار طنابوں میں آہنی مہمیز کی خاردار پھرکیاں لگی ہوئی تھیں۔ نتیجتاً ایک کوڑا لگنے پر چار زخم ہو جاتے تھے۔"

پگڑیوں میں جہانگیر کی چھوٹی ایک تصویر لگائی جاتی تھی!

تمام بڑے لوگ (صرف وہی جن کو یہ دی جاتی تھی) اپنی پگڑیوں میں جہانگیر کی چھوٹی تصویر لگاتے تھے۔ ایک سنہرہ تمغے کے علاوہ انہیں کچھ نہیں دیا جاتا تھا جو چھ پینس کے سکے کے برابر ہوتا تھا۔ اس کو سروں پر باندھنے کے لئے چار انچ کی ایک چھوٹی زنجیر لگی ہوئی تھی۔ اپنے خرچے سے وہ لوگ یا تو اس میں بیش بہا پتھر یا موتی جڑوا لیتے تھے۔

جائداد کی ضبطی کا قانون!

بادشاہ ہر شخص کی جائداد کا وارث تھا۔ ایک امیر کی حیثیت سے لوگ پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ شاہی لطف و کرم سے انھیں امیروں کے عہدوں تک ترقی دی جاتی تھی۔ روؔ نے لکھا ہے کہ "ان میں سے نہ تو کسی کے لئے رکھنے یا اضافہ کرنا ضروری تھا لیکن بادشاہ انھیں اتنی زیادہ زمین دیتا تھا کہ وہ اس کی لگان کی آمدنی سے اتنی تعداد میں گھوڑے رکھنے پر مجبور ہوتا تھا۔ ۲۵ پونڈ سالانہ فی گھوڑے کے حساب سے دیا جاتا تھا۔" روؔ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک امیر کی وفات پر بادشاہ اس کے وارثوں (بیوی، بچوں) کے لئے گھوڑے، کپڑے اور دوسری چیزیں چھوڑ دیتا تھا۔ اس کے بیٹوں کو وہ کم مرتبہ منصبوں پر مقرر کرتا تھا۔ یعنی اگر ان کا والد شش یا ہفت ہزاری منصب دار تھا تو اس کے بیٹوں کو شش یا پنج صدی کا منصب عطا کیا جاتا تھا۔ لہٰذا انھیں از سر نو زندگی شروع کرنی پڑتی تھی۔

دربار میں سفراء کا لباس؛

رو نے لکھا ہے کہ اس نے پہلے ہی اپنے ملک کا لباس پہننے کی اجازت لے لی تھی اس بات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ بیرونی ممالک کے سفیروں کو اس بات کی اجازت لینا ضروری تھا کہ وہ اپنے وطن کے ملبوس زیب تن کرکے دربار میں حاضر ہوں۔

تاجر پہلے بادشاہ کی خدمت میں اشیاء پیش کرتے تھے؛

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے بادشاہ کی خدمت میں چیزوں کو پیش کرنا اور متعلقہ "قیمت" پالینا اس ملک کا ایک دستور بن گیا تھا اس بارے میں رٹمنے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ ایک مرتبہ اس نے ایک تاجر کو روپے نہ ادا کئے جانے کی بادشاہ سے شکایت کی۔ جس نے بعض اشخاص کو چیزیں فروخت کی تھیں۔ جہانگیر نے جواب دیا کہ چونکہ اس تاجر نے سب سے پہلے اسے چیزیں نہیں دکھائی تھیں، اور قیمت نہیں لی تھی۔ اس کے برعکس اس نے اس کے بتلائے بنا اس کے نوکروں کو چیزیں دیدی تھیں اس لئے وہ (بادشاہ) اس بات کا ذمہ دار نہیں اگر اسے چیزوں کی قیمت ادا نہیں کی گئی۔ تاجر کی یہ خود اپنی ذمہ داری تھی فارس کے تاجر سب سے پہلے اپنی چیزیں بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے۔ وہ اپنی پسندیدہ چیزیں خرید لیتا اور جس چیز کو چاہتا وہ اپنے امیروں کو دیدیتا۔ اس کے سکریٹری ان کے نام اور اس کے عہدہ داران قیمت میں "کٹوتی" کرلیتے۔ اس فرد کی ایک نقل تاجر کو یہ کہکر دی جاتی کہ وہ جاکر متعلقہ چیزوں کی قیمت وصول کرلے۔ اس کے باوجود اگر کوئی فرد کی ادائیگی سے انکار کرتا تو ایک عہدہ دار اسے ادا کرنے پر مجبور کردیتا۔

(باقی آئندہ)

برہان

جلد ۱۱۴ | جون سنہ ۱۹۹۴ء مطابق محرم الحرام سنہ ۱۴۱۵ھ | شمارہ نمبر ۱

۔۔۔ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

نظرات

دنیا میں انسان کو جہاں راحت و خوشی اور آسائشیں مہیا ہیں وہیں انسانی زندگی خطرات و مشکلات اور پریشانیوں سے بھی بھری ہوئی ہے۔ اور کسی بھی خوشی یا غمی کو ہم مرضیٔ مولا ہی کہیں گے۔

امسال منیٰ میں حج کے دوران میں رمی جمرات کے وقت جو المناک حادثہ رونما ہوا اور جس میں ہزاروں حاجی جاں بحق ہو گئے اس پر ہر انسان کو دکھ و صدمہ ہوا ہے۔ مگر ہونی کو ٹالنا انسانی بس سے باہر ہے۔ مشیتِ ایزدی کے آگے بندہ کی لاچاری قدم قدم پر دیکھنے کو ملتی ہے اس پر بھی انسان کی اکڑ اور بلند بانگ دعوے بند نہیں ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ سرکشی بندے کی اور کیا ہوگی۔ تمام انسانی تدبیریں اللہ تعالیٰ کی مرضی کے آگے دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ غافل انسان اللہ کی ہونی اور انہونی کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی اپنے کو سنبھالنے کے قابل نہیں بنا سکا ہے یہ خود ایک ٹریجڈی ہے، جو اس ماڈرن دنیا کی چکا چوند کی وجہ سے انسان کو بیدار نہیں کر سکی ہے۔

ہر صاحب استطاعت مسلمان کے لئے حج پر جانا ضروری و فرض ہے اور اس مسلمان کی خوش نصیبی کا کیا ٹھکانہ ہے جو فرائضِ حج ادا کرتا ہوا موت سے ہمکنار ہو جائے ایک طرح سے یہ اس کے لئے انعامِ خداوندی بھی ہے۔

اس مقدس سرزمین پر جس پر اللہ تعالیٰ کے محبوب ترین رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک چلے ہوں اس پاک سرزمین پر حالت حج میں کسی مسلمان کا انجام بخیر ہو۔ وہ خداوند تعالیٰ کا مقرب بندہ ہے اور ایسے حاجیوں کا انجام بخیر ہم سب کے لئے قابلِ رشک ہی ہے۔

موت ہر انسان کا مقدر ہے ہر شے فانی ہے۔ جو پیدا ہوا ہے اس کے لئے فنا بھی ہے لیکن وہ موت جس میں اللہ کی رضا و خوشنودی کی صاف جھلک موجود ہو اس کی تمنا ہر مسلمان کی دلی آرزو ہے۔

رمی جمرات کے دوران میں امسال جو بھگدڑ مچی اور جس میں ہزار کے قریب بندگانِ خدا

لقمۂ اجل ہوئے یہ دنیاوی لحاظ سے ایک حادثہ ہے اور اس حادثہ میں ہم حج کے دوران میں مرنے والوں کے لواحقین سے اظہارِ تعزیت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومین کو اپنے جوارِ رحمت میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا کرے اور ان کے متعلقین کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

منیٰ جمرات حج کے دوران میں جو واقعہ رونما ہوا اس کے سلسلے میں کئی ملکوں نے عجیب و غریب تجویزیں پیش کرنا شروع کر دی ہیں جنھیں ہم افسوس ناک کہے بغیر نہ رہیں گے۔ ایک ملک نے یہ تجویز پیش کر کے تو تمام بین الاقوامی قواعد ہی کی دھجیاں اڑا دی ہیں کہ حج کا بندوبست و انصرام کسی بین الاقوامی ادارے کے ہی سپرد کر دیا جائے۔ یہ دینی لحاظ سے تو ہے ہی غلط مگر اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے بھی سراسر خلاف ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سعودی عرب حکومت کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی بدترین اور قابلِ مذمت تجویز ہے۔

افسوس اس بات کا اور بھی زیادہ ہے اس تجویز کی حمایت ان بعض مسلم ملکوں نے بھی کی ہے جن سے ایسی لچر اور بیہودہ تجویز کی امید نہیں رکھی جا سکتی تھی۔

اطمینان کی بات ہے کہ ہندوستان کے علماء کرام نے مذکورہ بالا بیہودہ تجویز کی سخت لفظوں میں مذمت کی ہے اور شاہی امام جامع مسجد دہلی کا اس سلسلے میں واضح بیان ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی ترجمانی کا حق ادا کرتا ہے۔

ہندوستان میں سعودی عرب کے قائمقام سفیر جناب عبدالرحیم ابو عوف نے مذکورہ تجویز کو شرارت آمیز اور سیاسی اغراض پر مبنی بجا طور پر قرار دیا ہے۔ سعودی عرب کے محترم سفیر کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ حج کے دوران بھگدڑ مچنے اور سینکڑوں حاجیوں کے مرنے جیسے واقعات کی ذمہ داری ان مسلم اور غیر مسلم ممالک کی سرکاروں پر ہے جو اپنے شہریوں کو حج کے طور طریقوں سے آگاہ کئے بغیر سعودی عرب کے لئے روانہ کر دیتی ہیں۔ حج کے دوران میں حرمین شریفین کا بندوبست کسی دوسرے مسلم ملک کو سونپے جانے کی کسی ملک کی تجویز پر محترم سفیر سعودی عرب کا فرمانا ہے کہ سعودی عرب حج جیسے مقدس معاملہ میں سیاست شامل کرنے کی ہر کوشش کی مذمت کرتا ہے۔ سعودی عرب حکومت حج کے بعد حج کے دوران ہونے والے واقعات کا ہر سال جائزہ لینے کے بعد اگلے حج کے لئے مناسب

بندوبست کرتی ہے لیکن اسمیں کسی باہر کے شخص کی رائے شامل کرنیکی کوئی ضرورت نہیں ہے۔
سعودی عرب کے سفیر جناب ابو عوف نے بالکل درست کہا کہ حج کرنے سعودی عرب پہنچنے والے بہت سے حاجیوں کو ارکان حج کا علم نہیں ہوتا۔ سعودی حکومت نے حرم شریف میں پورے کی طرف سے مجمع کی طرف بڑھنے کا راستہ مقرر کیا ہے لیکن کئی حاجی مخالف سمت میں چل پڑتے ہیں۔
سعودی سرکار ہر سال حاجیوں کے لئے بہتر انتظامات کرتی ہے۔ اب مکہ و مدینہ میں پانی کی ٹینکیں لگانے کا فیصلہ کیا گیا ہے تاکہ وہاں تیز گرمی سے حاجیوں کو راحت دلائی جاسکے۔ اس کے علاوہ عرفات کے میدان میں دو ہزار درخت بھی لگائے گئے ہیں۔ سعودی سفیر نے یہ بھی کہا کہ بدانتظامی کا ایک سبب دوسرے ملکوں سے حج کے لئے آنے والے وہ بھی ہیں جو وہاں پہونچکر چائے یا پانی فروخت کرنا شروع کردیتے ہیں۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ حج جیسے مقدس فرض کو کچھ لوگ تجارتی حصول کا ذریعہ بناتے ہیں۔
ہمیں اپنی کمیوں اور غلطیوں کا احساس کرنا چاہیئے نہ کہ خواہ مخواہ سعودی عرب کی حکومت کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے ایسی بھر وبے ہودہ تجاویز پیش کریں جس سے حج جیسا مقدس فریضہ دینی بھی سیاسی بازیگروں کا کھلونہ بن جائے۔ ہمیں ایسے موقع پر سعودی عرب کی سرکار کے ساتھ ہمدردی و تعاون کرنا چاہیئے اور ایسے اداروں یا ملکوں سے ہوشیار رہنا چاہیئے جو حج کے دوران ہوئے حادثہ کی آڑ میں اپنے مکروہ ناپاک منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اسلام دشمن طاقتوں کی شہ پر سعودی عرب سرکار کو مطعون و بدنام کرنے پر کمر بستہ ہیں۔ ہم ان کالموں کے ذریعہ سعودی عرب سرکار پر حج کے موقع پر اس کے بہتر سے بہتر انتظام و انصرام کا اپنے مکمل اعتماد کا اظہار کرتے ہیں۔ اور ایسی ہر تجویز و بیان کی سخت ترین مذمت کرتے ہیں جس سے سعودی عرب کی سرکار کو الجھن و پریشانی کا سامنا

ایک جائزے کے مطابق تمام دنیا میں مسلمانوں کا تعلیمی معیار انتہائی پست ہے۔ ہندوستانی مسلمان تو اس معاملے میں اور بھی زیادہ پچھڑے ہوئے ہیں۔ آخر انھیں اس طرف کیوں سوچنے کا موقع نہیں ملتا۔ کیا وہ جب بیدار ہوں گے جب ان کی تعلیمی پسماندگی لاعلاج ہوگی۔ کینسر کے مریض کو ابتدا میں تو قابو میں کیا جاسکتا ہے لیکن جب مرض کینسر انتہا کو پہنچ

اس کا علاج قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔ ہندوستانی مسلمان تعلیم سے بہت دور ہیں۔ اس کی وجہ جہاں یہ ہے کہ ان میں تعلیم کی اہمیت کا احساس ہی نہیں ہے وہاں یہ بھی ہے کہ رہنمایانِ ملت نے انہیں اس قسم کا احساس وشعور پیدا کرنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے۔ انہیں آسانی و راحت و آرام کے ساتھ سیاست کے میدان میں جذباتی تقریروں اور بیانوں سے اپنی لیڈری چمکانے کی فکر و تدبیر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ دہلی جیسے بڑے شہر میں کوئی بھی مسلمانوں کا اپنا کالج نہیں ہے نہ ہی مسلم لڑکیوں کا کوئی علیحدہ کالج بن سکا ہے۔ جبکہ مسلمانوں سے کہیں بہت کم تعداد میں سکھ اقلیت کے کئی گرلز کالج ہیں اسکول ہیں۔ اس سے زیادہ ہماری اور بدبختی کیا ہوگی — ایسی تاریک صورت حال کی موجودگی میں ایک روشن و تابناک پہلو دکھائی دیا ہے۔ جس سے ہمیں خوشی و مسرت حاصل ہوئی ہے کہ سیاسی رہنماؤں نے جو کام نہیں کیا ہے اسے دردمند حساس مسلم نوجوانوں نے کر دکھانے کی ٹھان لی ہے۔ مرحوم و مغفور حاجی محمد عمر (لیس والے) مسلمان پنجابی برادری کی بڑی ہی مخیر نیک اور قوم کی بے لوث خدمت کرنے والی شخصیت ہوئے ہیں۔ ان کے لائق و ہونہار صاحبزادے پروفیسر ڈاکٹر عمر ریاض صاحب ہیں۔ بس کیا بتایا جائے کہ ان میں قوم کی خدمت کرنے کا کس قدر جذبہ بھرا پڑا ہے۔ سیاسی بکھیڑوں سے دور تعلیمی میدان میں مسلم قوم کے لئے ہر ممکن طریقہ سے کوشاں و مستعد ہیں۔ مسلمان بچوں کو ابتدا سے اعلیٰ تعلیم سے سرشار کرنے کا انہوں نے خواب دیکھا اور اپنے خواب کو عملی جامہ پہنایا اپنی ذاتی لگن و محنت کے ساتھ کریسنٹ اسکول کے نام سے نرسری سے پانچویں کلاس تک کا قائم کیا۔ اسکول کے معیار کو اعلیٰ سے اعلیٰ اور بہترین سے بہترین بنانے میں انہوں نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ آج الحمدللہ کریسنٹ اسکول بارہویں کلاس تک ہو گیا ہے اور اس کے معیار کا یہ عالم ہے کہ دہلی کے موڈرن اسکول کا ہم پلہ ہے۔ موج پور دہلی میں کریسنٹ اسکول کی بڑی ہی عالیشان بلڈنگ زیر تعمیر ہے اندازہ ہے کہ اس پر تقریباً دس لاکھ روپیہ خرچ ہو چکا ہے۔ اس دور میں جبکہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت کوئی زیادہ اچھی نہیں ہے۔ اور تعلیم کے لیے وہ ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوئے ہیں۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر پروفیسر ریاض عمر صاحب نے کریسنٹ اسکول کو اعلیٰ معیار پر پہنچانے اور اس کی بلڈنگ بنانے کے لئے ۷۵ لاکھ روپیہ کے حصول کے لئے کس قدر محنت و مشقت رات دن ایک کر کے کس کس طرح

پاپڑ بیلے ہوں گے۔ شاباش ہے ان کی مساعی جمیلہ کو۔ ہر مسلمان کو ان کی محنت لگن کوشش کی پیروی و تقلید کرنی چاہیئے۔ تاکہ مسلم قوم کے بچے مستقبل میں حالات کا پروقار طریقے سے مقابلہ کر سکیں۔ اس ماڈرن دنیا میں اپنے دینی تشخص کو قائم رکھتے ہوئے اعلیٰ سوسائٹی میں جینے اور رہنے کے قابل بن سکیں۔ دینی اور دنیاوی دونوں تعلیم ضروری ہیں۔ اور جناب پروفیسر ڈاکٹر ریاض عمر اپنی انتھک کوششوں سے اس حقیقت کو عملی جامہ پہنانے کی سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی ان نیک کوششوں اور ملت کی ترقی و فلاح و بہبودگی اور تعلیمی لحاظ سے ان کی سربلندی کے لئے مساعی جمیلہ میں خیر و برکت اور ترقی عطا فرمائے۔

پروفیسر ریاض عمر کو خدمت ملی کا جذبہ اپنے آباواجداد سے ہی ملا ہے ان کے والد مرحوم حاجی محمد عمر لیس والے علماء کرام کی خدمت میں ہمیشہ ہی پیش پیش رہے اور مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سے تو ان کو والہانہ عقیدت تھی۔ ان کے صاحبزادے پروفیسر محمد ریاض عمر بھی اپنے والد مرحوم کے نقش قدم پر رواں دواں ہیں۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا انعام و اکرام ہے ان کو جذبہ خدمت خلق و خدمت ملت ورثہ میں ملا ہے۔

****

فلسطین کی معاصر ادبی صورتحال

عبدالحق حقانی القاسمی، ۶۹ - محمد حبیب ہال، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

" ایک شاعر کا سماجی منصب ماضی کی عظمتوں کا تحفظ، حال کے واقعات کی تشریح اور مستقبل کی تعمیر ہے۔ کیونکہ " ادب " بھی بنیادی طور پر ایک سماجی عمل ہے اور ہمیشہ سے ایک سماجی عمل رہا ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ سماجی عمل ادب کے وجود میں، اس کے مزاج میں، اس کے خون میں شامل ہے، اور یہی اس کا بنیادی رشتہ ہے۔ اس رشتہ کی وجہ سے ادب انسان کے سماجی رشتوں کا سب سے اہم مظہر بنتا کر قوم کی روح کے اظہار کا سب سے بڑا وسیلہ بن جاتا ہے۔" [۱]

اس سلسلے میں ٹی۔ ایس ایلیٹ کا خیال بہت صحیح ہے کہ!

" شاعر کے (بحیثیت شاعر) فرائض قوم سے بالواسطہ ہوتے ہیں، اس کا براہ راست فرض تو اس کی زبان سے ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ اسے محفوظ رکھے۔ دوسرے یہ کہ اسے آگے بڑھائے اور ترقی دے، اس بات کے اظہار سے کہ دوسرے لوگ کیا محسوس کر رہے ہیں، اور زیادہ باخبر کر دیتا ہے اور اس طرح انہیں ان کی ذات سے بھی زیادہ باخبر کر دیتا ہے لیکن صرف یہی نہیں کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ باخبر کر دیتا ہے وہ انفرادی طور پر دوسرے لوگوں حتیٰ کہ دوسرے شاعروں سے بھی مختلف ہوتا ہے اور شعوری طور پر اپنے پڑھنے والوں کو ان احساسات سے روشناس کرا دیتا ہے جو

---

[۱] جمیل جالبی، نئی تنقید (دہلی: ۱۹۸۸) ص ۲۷۴ -

اس سے پہلے ان کے تجربے میں نہیں آئے تھے" [۲]

ان خیالات کی روشنی میں دیکھا جائے تو شاعر کبھی بھی سیاسی و سماجی حالات سے بے خبر نہیں رہ سکتا اور وہ کسی نہ کسی طور پر سیاست سے ضرور متعلق ہوتا ہے اور اس نوع کی نظمیں بھی لکھتا ہے، ادب اور سیاست کے باہمی ربط کے سلسلے میں دو گروہ میں ایک گروہ نے ایسی شاعری کو بے اثر قرار دیا ہے جس کے تحت سیاست کی بات کی جائے۔ جبکہ دوسرے طبقے نے ہر چیز کو سیاسی قرار دیا ہے۔ ایک طبقے کی نظر میں گویا ادب اور سیاست آپس میں مستحکم طور پر مربوط ہیں۔ قدیم زمانے میں افلاطون نے شاعری اور سیاست پر زور ڈالتے ہوئے اپنے زمانے کے شاعروں کو روایتی اور سماجی اقدار کا حامل اور زندہ افسانوں کا محافظ قرار دیا ہے، انہوں نے خود بھی شعری زبان استعمال کی۔ اس لئے سیاست کی شاعری سے علیحدگی کلی طور پر ممکن نہیں ہے۔ دانتے (Dante) کا شاہکار Divine comedy دراصل سماجی اور سیاسی حالات کی شعری داستان ہے۔

شاعری اور سیاست کے درمیان تفریق و امتیاز کی ذمہ داری ارسطو پر ہے جس نے تاریخی صداقت کو شاعرانہ حقیقت سے الگ قرار دیا اس نے یہ لکھا کہ

> "میں یہ واضح طور پر کہنا چاہوں گا کہ شاعر کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ اس کی وضاحت کرے کہ کیا حقیقت میں ظہور پذیر ہوا ہے، بلکہ اس طرح کی چیزیں جو ہو سکتی ہیں یا جن کے ہونے کے امکانات ہوں اس کی وضاحت کرنا ہی اس کا منصب ہے۔"

ارسطو کے اس نظریہ کے باوجود بھی اس حقیقت سے انکار اب ممکن نہیں کہ سیاسی شاعری اپنا علیحدہ وجود رکھتی ہے، اور ایک صنف کی حیثیت سے نشو و نما پا رہی ہے اس لئے نہ تو اس کے وجود کو ختم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسکی ادبیت کا انکار ممکن ہے [۳]

---

[۲] جمیل جالبی، ایلیٹ کے مضامین (دہلی ۱۹۷۸ء) ص: ۸۷۔

[۳] Ferial Ghazoul "The Poetics of the Political Poem"
Arab Studies Quarterly V.8 No.2 Spring 1986

قدیم عرب شعری روایت میں بھی شاعروں نے اپنے قبیلے کے سماجی، سیاسی کوائف کی ترجمانی کی ہے۔ اس دور کے شعراء نہ صرف جمالیاتی اقدار کے محافظ تھے بلکہ انکی سیاسی و تباکلی شعور کے بھی پاسبان تھے۔ معاصر قومی عرب شاعری بھی اسی روایت کا ایک تسلسل ہے جو مختلف ادوار میں مختلف تجربوں سے گزر رہی ہے، اور فلسطین کی مزاحمتی شاعری اس میں ایک نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔

(۲)

عربوں کی ثقافتی روایت میں شاعری کی ایک امتیازی حیثیت رہی ہے قدیم عربوں نے اپنے جذبات کا مکمل اظہار شاعری کے ذریعہ ہی کیا ہے۔ چونکہ فلسطین بھی عرب ثقافت اور قومی تشکیل کا ایک حصہ ہے۔ اس لئے وہاں کے شاعروں نے بھی شاعری کو عرب تشخص کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اس صنف میں اپنے جذبات، احساسات اور تجربے کو پیش کیا۔

قیام اسرائیل (۱۹۴۸ء) کے قبل برطانوی انتداب کے دوران بھی شاعروں نے برطانوی اقتدار اور صہیونی استعمار کے خلاف اپنے جذبۂ بغاوت، غصہ و غم کا اظہار شاعری کے ذریعے کیا۔

قیام اسرائیل فلسطینی ادب کے لئے ایک نقطۂ انقلاب ہے۔ عرب ثقافت کے خلاف اسرائیل حکومت نے منظم پالیسی کے تحت شاعروں اور ادیبوں کے لئے اپنے جذبات کا کھلے طور پر اظہار کرنا ممنوع قرار دیدیا تھا۔ اندرون اسرائیل عرب فلسطین کو طاقت و قوت کی بنیاد پر بقیہ عرب دنیا سے رشتہ توڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ مگر چونکہ ان میں وطن سے محبت اور تعلق کا جذبہ تھا۔ اس لئے فلسطینی مزاحمتی شاعری وجود میں آئی۔ جو کہ ۱۹۴۸ء کی پسپائی اور قیام اسرائیل کا ردعمل تھی جس میں عربوں کے سیاسی اور قومی تشخص کے استیصال کے لئے قومی جبر و تشدد کے عمل کو صہیونیوں نے روا رکھا تھا۔ مزاحمتی شاعری کی تحریک پوری عرب دنیا میں ادب کی "خود آگہی کی ہیئت" کی

حیثیت سے ابھرنے لگی۔ اس تحریک کو توفیق زیاد، سالم جبران، محمود درویش، اور سمیح القاسم نے فروغ دیا۔ اور انتہائی مشکل حالات میں ان لوگوں نے قومی ایقان اور علانیہ نافرمانی و بغاوت کے جذبات کے ذریعہ جمالیاتی احساس کی تشکیل کی۔ انہی لوگوں نے التزامی شاعری commited poetry کی متحرک لہر کی بنیاد ڈالی، اور نئی شعری روایوں کے لئے نئی بنیادیں فراہم کیں [۴]

جب عرب دنیا نے محمود درویش، سمیح القاسم اور توفیق زیاد کی آوازیں سنیں تو انہیں حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی کیونکہ یہ اس بات کی علامت تھی فلسطین اب بھی عرب ہے اور عرب دل کی دھڑکنیں ابھی رکی نہیں ہیں۔

ان مزاحمتی شاعروں کے اندر عربیت کا احساس تھا، ان لوگوں نے کلاسیکی عربی میں شعر کہے تاہم ان کی مزاحمتی شاعری علاقائی اور مقامی لوک گیتوں سے متأثر رہے توفیق زیاد نے فلسطینی لوک گیتوں کا ایک مجموعہ شائع کیا، اور بہت سے مزاحمتی شاعروں نے فلسطینی علاقائی لہجے سے الفاظ، جملے اور تمثال مستعار لئے، پھر بھی کلاسیکی عربی شاعری ایک مدت تک عام تاریخی تجربے اور وحدت کی مشترک زبان رہی، کیونکہ یہی منتشر قوم کو باہم مربوط کرنے اور حال ماضی اور مستقبل سے رشتہ جوڑنے کا ایک ذریعہ تھی۔

۱۹۴۸ء کے بعد مختلف حادثات و واقعات رونما ہوئے، جن کے جدید شاعری کے تصور، نظریہ اور ترقی پر گہرے اثرات ہیں۔ ان حادثات میں مصری انقلاب

---

[۴] Abdelwahab M. Elmessiri. "The Palestinian wedding." Journal of Palestine Studies (Washington) V.10. No.3, 1981, pp.77-99.

Ibid.

(۱۹۵۵ء) حادثہ کفر قاسم (۱۹۵۶ء) اور عرب اسرائیل جنگ (۱۹۶۷ء) نمایاں طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی وجہ سے مختلف عرب ریاستوں میں ناگہانی تغیر و انقلاب پیدا ہوا اور اس کے علمی و ادبی زندگی پر گہرے اثرات پڑے۔

اسی دوران جدیدیت کا رجحان عام ہوا اور اس سے متعلق شعراء کلاسیکی ہیئت یا روایت کو قطعی طور پر برداشت کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ وہ خود کو اپنے زمانے کے حالات اور مسائل سے متعلق کرنا چاہتے تھے، فلسطینی قضیے نے انہیں ایک ثبوت اور شہادت مہیا کی، اور یہ لوگ عرب دنیا میں بغاوت اور ناراضگی کے جذبات کا اظہار کرنے لگے اور شاعر اور فنکار کے دل میں معاصر عرب وجود سے اجنبیت کا احساس پیدا ہوا انہیں اپنا حال خالی اور بے کیف سا محسوس ہونے لگا۔ تو انہوں نے پرانی دنیا کے مردہ ماضی سے اپنا رشتہ توڑ لیا اور نئے عرب فن کاروں نے دوسری تہذیبوں اور نئے اقدار، جدید انداز فکر سے استفادہ کیا اور روایتی تخیل کی محدود فضاؤں ــــــ سے ماوراء بھی شاعری میں نئے تجربے کئے۔ نئی زبان اور جدید ہیئت استعمال کی جو کہ حرکی اور مستقبل سے مربوط ہے کمال ناصر (۱۹۲۵ء ۱۹۷۳ء) نے "مونا لیزا" میں نہ صرف مخصوص ہیئت کے خلاف بغاوت کی بلکہ عمومی ہیئت کے خلاف بھی۔ ۵ـــ

مذکورہ بالا حادثوں میں سے دو حادثے خاص طور پر فلسطین سے متعلق ہیں اس لئے ان کے اثرات اور بھی زیادہ گہرے ہیں۔ کفر قاسم کا حادثہ جو صیہونی تشدد و انتہا پسندی کا ایک نمونہ ہے اس کا بنیادی مقصد عربوں کے دلوں میں خوف و دہشت پیدا کرنا تھا اس میں ہزاروں فلسطینی قتل ہوئے تھے۔ یہ حادثہ اس قدر سخت اور جان لیوا تھا کہ ایک یہودی شاعر "فتان الترمان" نے اس سے متعلق ایک قصیدہ

۵ـــ Abdelwahah M. Elmessiri "The Palestinian Wedding" Journal of Palestine studies (Washington) Vol. 10 No. 2, 1981, pp. 77-99.

لکھا، اور اس واقعہ کی سخت لہجہ میں مذمت کی۔

مقبوضہ سرزمین کے عرب شاعروں نے بھی اس کے متعلق نظمیں لکھیں جن میں سالم جبران، فدوی طوقان، ابراہیم اور محمود درویش کی دردناک نظمیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ محمود درویش کی دو نظمیں "ازھار الدم" اور "القتیل رقم ۱۸" اسی المیے سے متعلق ہیں۔ موخر الذکر نظم میں شاعر نے یہ کہا کہ شاخ زیتون کا ہرا پن اور آسمان کی نیل گونی اب ماضی کا فسانہ بن کر رہ گئی ہے، اس نظم میں بہیمانہ قتل عام پر گہرے دکھ کا اظہار کیا گیا ہے اس کے چند شعر یوں ہیں۔

كانَ قلبي مرةً عصفورةً زرقاء

يا حبيبي عندي كلها بيضاء

جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کا بھی عرب شاعری پر بہت گہرا اثر پڑا اور اس کی اس پسپائی نے ایک طبقے میں مایوسی اور کلبیت کی کیفیت پیدا کر دی اس سے متاثر ہو کر بعض شاعروں نے انتہائی جذباتی نظمیں لکھیں، اور موجودہ عرب ثقافت کو بدلنے پر زور دیا، ان میں نزار قبانی کی نظم "هوامش على دفتر النكسة" کو خاص مقبولیت اور شہرت ملی، مگر یہ نظم تمام عرب دنیا میں ممنوع قرار دی گئی۔ اس نظم کے چند شعر اس طرح ہیں۔

انعي لكم يا اصدقاء اللغة القديمة

والكتب القديمة

انعي لكم

كلامنا المثقوب كالاحذية القديمة

لست عميلا قذرا

كما يقول مخبروكم — سادتي الكرم

الصلوات الخمس لا انقطعي،

وخطبة الجمعة لا۔

وغیر شدی زوجتی لا اعرف الحرام

من ربع قرن وانا

امارس الرکوع والسجود ۶

اس طرح عبدالوہاب البیاتی نے بھی ایک نظم "بکائیۃ الیٰ شمس حزیران" کے عنوان سے لکھی جس کے چند شعر یوں ہیں:

نحن جیل الموت بالمجان، جیل الصّدقات۔

لم نمت یوما، ولم نولد، ولم نعرف عذاب الشہداء

فلماذا ترکونا فی العراء

یا الٰھی، للطیور الجارحات

نرتدی اسمال موتانا، ونبکی فی حیاء

آہ، لم تترک علی عورتنا، شمس حزیران رداء ۷

فلسطینی مزاحمتی شاعری اس جنگ میں پسپائی کے باوجود بھی حیرت انگیز طور پر مستقبل سے پر امید ہے۔ محمود درویش اور سمیع القاسم کے ہاں تو مستقبل کی طرف دیکھنے کا ایک جراتمندانہ رویہ ملتا ہے۔ ۸

سمیع القاسم نے ۵ رجون ۱۹۶۷ء کے متعلق یوں کہا:

نحن، فی الخامس

فی شہر حزیران،

ولدنا من جدید

سمیع القاسم کی طرح محمود درویش نے ۵ رجون ۱۹۶۷ء کے بارے میں رجائیت

---

۶ احمد سلیمان الاحمد، الشعر العربی والقضیۃ الفلسطینیہ (دمشق: ۱۹۷۳) ص ۹۷

۷ امجد اسلام امجد "عکس" (لاہور) مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۶

۸ " " " " " " " "

...

پسندانہ شعر ہے

ولیکن

لا بدلی

لا بد للشاعر من نخب جدید

واناشید جدید ہ

اس جنگ نے تو محمود درویش کے حوصلے اور بڑھا دیئے اور جد وجہد پر ان کا یقین اور گہرا ہوتا گیا۔

(۴)

فلسطینی مزاحمتی شاعری میں فلسطین (مادر وطن) سے حد درجہ تعلق اور شدت محبت کا اظہار ملتا ہے یہ اسی شاعری کا اہم مرکزی خیال ہے۔ عرب دنیا کے اس خاص مقام سے اپنی وابستگی اکثر شاعروں نے ظاہر کی۔ محمود درویش کی نظم "عن الامنیہ" بھی دراصل اسی تخصیص پسندی (particularism) کی ایک واضح یقین دہانی ہے اس تخصیص پسندی یا آزاد وفاقیت کا خیال فوزی الاسمر، راشد حسین کے یاں بھی ملتا ہے۔ ان شاعروں کی فلسطینی اشیاء سے محبت بھی تخصیص پسندی کو واضح کرتی ہے چنانچہ فلسطینی شاعری میں بار بار شاخِ زیتون، نارنگی، یاسمین اور دیگر فطری مناظر کے حوالے ملتے ہیں۔

فلسطین ان کے نزدیک ایک محبوب ہے اور یہی محبوب انہیں جذبات کی زبان عطا کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے شاعر اور محبوب کے درمیان کے فاصلے ختم ہوتے ہیں راشد حسین اپنی نظم "سیجارۃ" میں اپنی شدتِ محبت کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ سگرٹ کے عادی ہونے کے باوجود بھی وہ صرف فلسطین کی خاطر زندہ رہنا چاہتے ہیں جب کہ وہ سگرٹ اور اس کے دھواں کو لاشیئت کی علامت قرار دیتے ہیں۔ آخر میں وہ گویا اپنی سگریٹوں سے لگی آگ کے دھواں سے مر جاتے ہیں۔[9]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اپنی ایک نظم "ساعۃ الصفر" میں راشد حسین خود کو مادرِ وطن کی ہیئت کا اٹلس قرار دیتے ہیں۔ اور ان کے برادرِ خورد احمد حسین کو بھی یہ احساس ہے کہ باوجودیکہ وہ شاعر ہیں اور فلسطین کے لیے اپنی محبت کا نغمہ گاتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ خود نغمہ (گیت) ہو جاتے ہیں جب فلسطین (مادرِ وطن) سنتی ہے۔ اس میں شاعر نے ایک خوبصورت فضا پیدا کر دی ہے اس طرح پر کہ مرکزی خیال سامع اور نغمہ نگار ایک گیت بن جاتا ہے۔ شاعر نغمہ اور مادرِ وطن کے درمیان کی سرحدیں اور دیواریں ٹوٹ جانے کے بعد ایک پیچیدہ امیجری جنم لیتی ہے۔ جو محمود درویش کی نظم "عاشق من فلسطین" کو بھی مشخص کرتی ہے کہ اس کا آغاز شکستہ آئینہ کی تمثال کے ساتھ ہوتا ہے اور پھر آوازوں کی کرچیوں کے جمع کرنے کے بعد شاعر بربط کے دل میں ان کا پودا لگاتا ہے بعد میں فلسطین اس کے لب پر ایک آواز بن جاتی ہے اور اس وقت اس سے کہتی ہے کہ اس سے ایسے کی کتاب کی ایک نظم کی طرح پڑھے اور شاعر اسے اپنی ڈائری میں رکھ لیتا ہے کہ یہ اس کی نظموں کے لیے آگ اور زادِ راہ کی طرح ہے اس سے فلسطینی شاعری کے عالمی بعد کا بھی اندازہ ہوتا ہے ۱۰

معاصر فلسطینی مزاحمتی شاعری کا ایک مرکزی خیال "رثائی لہجہ" ہے جس میں شاعروں نے دیر یاسین اور کفر قاسم جیسے عظیم انسانی المیے کو شعری زبان عطا کی ہے۔ اسی طرح صمود و استقلال اور استحکام بھی اس کا ایک مرکزی خیال ہے جس کا اظہار چٹان، مٹی اور زمین کے حوالوں سے ہوتا ہے، محمود درویش کی نظم "ابی" اس کی نمائندہ مثال ہے

---

۹ Abdelwahab M. Elmessiri "The Palestinian wedding" Journal of Palestine studies (Washington) V.10 No.3, 1981, p. 77-99.

۱۰ Abdelwahab M. Elmessiri "The Palestinian wedding" Journal of Palestine studies (Washington) V.10 No.3, 1981, p. 77-99.

Ibid.

فلسطینی شاعری کا غالب انداز فکر علانیہ بغاوت کا ہے اور بسا اوقات اس میں تلخی کے ساتھ رنج و غم کا بھی امتزاج ہوتا ہے، توفیق زیاد کی نظمیں اس بغاوت کی نمائندہ مثال ہیں، ۱۹۶۰ء کی شاعری میں بھی شجاعت کے ساتھ المیہ کا لہجہ ملتا ہے۔ مختلف نظموں میں تشخص کا جذبہ ان شاعروں کو اندرونی قوت عطا کرتا ہے جو کہ آندھیوں کے رتھ میں ایک طاقت بن کر ابھرتا ہے۔ ایسے دو چار شاعروں کو جب وجود کے نیست و نابود کی دھمکی دی جاتی ہے تو ان کے اندر خودشعوری کے جذبے کے ساتھ موت سے مختلف ایک حقیقی وجود کا احساس ہوتا ہے۔

طنزیاتی طور پر جسمانی موت ان کے نزدیک معنی خیز وجود حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔

(۵)

مزاحمتی شاعری میں بکثرت علامات و اساطیر ملتے ہیں۔ ان شاعروں نے مثال تجربے اور اساطیری افراد کی تجسیم اپنی شاعری میں کی ہے۔ سالم جبران خود کو عبرانی روایات کے درمیان بائبلی شمشون کی طرح دیکھتے ہیں جو کہ تاریکی، فاقہ اور محرومی میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اور ایک عبادت گاہ تباہ کرنے کی کوشش میں اس پر فرد جرم عائد کیا جاتا ہے ایوب (Job) بھی بائبلی مثالی کردار ہے جو مشقتیں برداشت کرنے کا عادی ہے۔ اسی طرح کلاسیکی روایت نے بھی مزاحمتی شاعروں کو کچھ کردار اور شخصیات عطا کی ہیں۔ مثال کے طور پر "نیوبہ" (Niobe) جسے سمیع القاسم نے اپنی نظم "نیوبہ کا آخری لڑکا" میں استعمال کیا ہے جو اپنے بچوں کی جدائی کے غم میں روتے روتے پتھر بن جاتی ہے، سمیع کے خیال میں فلسطینی تناظر میں نیوبہ کا آخری لڑکا مرا نہیں ہے، وہ زخم خوردہ ہے مگر اپنی ماں، بہنوں اور بھائیوں کے ساتھ ہونے والے ظلم کا بدلہ ضرور لے گا۔ اور ان کے آنسوؤں کو پوچھے گا۔ اسی طرح قیامت اور تجدید شباب کو بھی بطور علامت استعمال کیا گیا ہے دور بعد کا شاعری میں خاصا اظہار ملتا ہے۔ فلسطینیوں کی گردش زندگی wanderings اور تشخص کے جدوجہد کے اظہار کے لئے odysses کی سیاحت زندگی اور Panelope کے مریضانہ

تمل کا بطور خاص استعمال ہوا ہے۔ "تموز" جیسے اسطور کا بھی عربی شاعری میں ذکر ملتا ہے۔ خصوصاً بدر الشاکر السیاب نے اسی کا استعمال اپنی مشہور نظم "انشودۃ المطر" میں کیا ہے۔ تموزین شاعروں نے بھی نئی نسل کے درمیان رجائی رجحان پیدا کیا[11] کچھ شاعروں نے سسی فس[12] اور پرومیتھیوس[13] (Prometheus) کو علامت کے طور اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ جن میں مؤخر الذکر کردار انسانیت کے لئے دیوتاؤں سے آگ چرا کر لاتا ہے۔ یہ غلامی سے آزادی کے راستے تک جانے کا ایک تصور دیتا ہے۔

محمود درویش نے "صلیب" کی علامت کا خاص طور پر استعمال کیا ہے۔ سمیح قاسم نے ایلیا جیسے مثالی کردار کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے جو یہودیوں کا نبی ہے اور فرقہ پرستی کے خلاف جہاد کرتا ہے۔ محمود درویش نے بھی "حبقوق" کے مثالی کردار کا اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے جو کہ یہودیوں کا نبی ہوتے ہوئے یہودیوں کی غلطیوں کے خلاف جہاد اور جنگ پر کمربستہ تھا[14]

(۴)

فلسطینی شاعری کا اسلوب حد درجہ سادہ اور سہل ہے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد خصوصاً بیزن

---

[11] Salma K. Jayyusi "The contempo[rar]y Arabic Poetry" in R.C.O[s]tle (ed), Studies in Mo[d]ern Arabic Literature (England, 1975) p. 4[?]

[12] سسی فس (سیزیف) ارسطور کا استعمال عرب شاعروں نے کثرت سے کیا ہے۔ ادونیس اپنی نظم "الی سیزیف" میں کہتے ہیں۔ اقسمت ان اظل مع سیزیف / اخضع للحمیٰ وللشرار" السیاب نے بھی اپنی ایک نظم میں اس ارسطور کا استعمال کیا ہے: "سیزیف القی عنہ عبء الدھور / واستقبل الشمس علی الاطلس"

[13] پرومیتھیوس کا استعمال شیلی اور گوئٹے نے کیا ہے عرب شاعروں نے گو کہ اس پر باضابطہ نہیں لکھی ہے مگر اسکے مفہوم کو اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے دیکھئے: جلیل کمال الدین الشعر العربی الحدیث وروح العصر"

[14] رجاء النقاش، شاعر الارض المحتلہ

واندرون فلسطین شاعروں کا ایک مشترکہ رویہ "سہل اظہار بیان" کا تھا اس زمانے میں قدیم ہیئت ترکیب الفاظ کے خلاف بغاوت ہوئی اور قدیم شاعری کے پرشکوہ اسلوب سے نجات حاصل کر کے زیادہ جامع اور واضح زبان استعمال ہونے لگی اور شاعروں نے عام لوگوں تک اپنا پیغام پہونچانے کی غرض سے روایتی ہیئت اور خیال کو مسترد کیا، آسان وسہل انداز میں انقلابی انداز فکر اختیار کرتے ہوئے ابہام، پیچیدگی اور حاکم طبقے (Bourgeois) کے سرپرستانہ رویے کو ختم کرتے ہوئے اس ذریعۂ اظہار کو بہتر سمجھا جو طبقہ اشرافیہ کے بجائے انقلابی شاعری کے مخاطب کسان اور مزدور بھی ہیں۔ ان لوگوں نے مخفی (Esoteric) اور انفرادیت پسندانہ اظہار سے گریز کرتے ہوئے اجتماعی شعور وادراک کے رویے کو برقرار رکھا اور عوام کو واضح اور بلند منشور عطا کیا تاکہ شاعری معنی خیز اور عوامی ہوسکے۔[۱۵]

(۷)

فلسطینی مزاحمتی شاعری عالمی ادبی روایات اور شعری تجربے سے متأثر ہے اس میں نئے اور تجرباتی رویئے، اساطیر، علامات اور شعری فارمولے مغربی انداز کے ہیں کیونکہ مشرقی یورپی اور انقلابی شاعری فلسطینی معاشرے میں حد درجہ معتبر تھی۔ ۱۹۶۰ء کے اخیر میں ایک وسیع تر شعری آگہی ان میں پیدا ہوئی اور شعری احیار کے نئے طریقے ایجاد ہوئے۔ ایلیٹ اور ایذرا پاونڈ کی تمثال پسند شعرار پر تنقیدی کاموں سے فلسطینی شاعروں نے "تخیل" حاصل کیا۔ اور ایٹس (W.B.Yeats) کے تصور اور علامت نے مزید نئے افق پیدا کئے۔ یہ شاعری معاصر تاریخی وادبی مغربی تحریکوں سے متأثر ہوئی اور اس تأثر نے فلسطینی شاعری میں ایک حرکی اور فعال تحریک پیدا کی۔ ان شاعروں نے آفاقی تصور کو اختیار کیا۔ اور انفرادی تجربوں کی محدودیت کو مسترد کردیا۔ اس لئے

---

[۱۵] Mikhail Ashraw, The contemporary Literature of Palestine, University of virginia, 1982 p.18.

فلسطینی شاعری عالمی انقلابی ادب میں ایک خاص مقام رکھتی ہے کہ ان کے لئے نہ ان کا لہجہ غیر مانوس ہے اور نہ ہی الفاظ و تصورات[۱۶]

۸

فلسطینی مزاحمتی شاعری انقلابی اور انسان پرستی کی شاعری ہے۔ اس لئے کہ استحصالی طاقتوں کے خلاف جدوجہد ہی اس کا بنیادی منشور ہے۔ یہاں کے شاعروں کی نگاہ صرف اپنی سرزمین تک محدود نہیں ہے بلکہ پوری دنیا میں ہونے والے مظالم پران کی نظر ہے اور وہ دنیا کے مظلوموں اور مقہوروں کے لئے بھی آوازیں بلند کرتے ہیں۔ چنانچہ فلسطین کے بیشتر شاعروں نے افریقہ، لاطینی امریکہ، کیوبا، ویتنام میں ہونے والے استعماری جبر و تشدد کے خلاف آوازیں اٹھائیں۔ اور ظلم کی چکی میں پسنے والے عوامی جدوجہد کی تائید کی۔ ان شاعروں نے مذہب و نسل، رنگ کے امتیاز کے بغیر ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کی۔ یہودیوں کی طرح کوئی جنگجو وطن پرست Chauvinist نہیں ہے۔ ان کی شاعری کا بنیادی مقصد اپنے وطن کی طرف مراجعت، اور اپنے وجود کا تحفظ ہے۔ کیونکہ یہ وطن سرزمین فلسطین صرف مٹی نہیں بلکہ ان کی پہچان ہے۔ اور یہ ان کی سوچ اور حوصلے سے جڑی ہوئی ہے۔[۱۷] گویا ان کے ہاں ایک جامع انسانی تصور ملتا ہے۔ اور یہ اشتراکیت سے تأثر کا نتیجہ ہے، جو کہ انسان اور سماج کی مشکلات کے سمجھنے میں بھی معاون ہے، اور ظلم و استبداد کے خلاف معاصر انسانی آواز کو قوت بہم بھی پہنچاتی ہے۔ اس لئے فلسطینی مزاحمتی شاعری کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہے کہ فلسطین ان کے ہاں صرف ایک علاقہ نہیں ہے۔ بلکہ انسانی جدوجہد کا ایک میدان کارزار ہے۔

---

۱۶ Mikhail Ashrawi, The Contemporary Literature of Palestine, p. 16.

۱۷ رادھا رمن اگروال، موت ان کے لئے نہیں (ہندی)، الہ آباد، ۱۹۹۱ ص ۱۱۵ - ۱۲۹

جہاں مذہبی امتیازات کے بغیر تمام شعراء ظلم و جبر و تشدد کے خلاف بغاوت کا علم اٹھائے ہوئے ہیں کہ ادیب کا بنیادی مقصد ہی یہی ہے ۱۸

---

۱۸ Abdel Wahab Elmessiri, "The Palestinian Wedding," J.P.S., V.10 No.3, 1981.

بقیہ : تبصرہ

امتیازات واشگاف کئے ہیں :"

علامہ جاحظ عربی زبان وادب کے ان اساطین اربعہ میں ہیں جن کی تحقیقات نے عربی ادب کو ہر دور میں نہ صرف سہارا دیا ہے بلکہ اس کی بنیادوں کو استوار، لب ولہجہ کو زرنگار اور اسلوب وآہنگ کو لالہ زار بنا دیا ہے۔ یہ ان کا دل آویز تذکرہ ہے۔

پوری کتاب مستند مآخذ پر مبنی اور فکر و تحقیق کا اچھا شاہکار ہے کہیں کہیں زبان میں ژولیدگی طرز ادا میں پیچیدگی در آئی ہے خداوند قدوس مصنف کے قلم کو باغ و بہار بنائے اور مثبت ومفید انداز تحقیق و تفتیش کی توفیق و توانائی بخشے اردو داں اہل علم طبقہ کے لئے یہ بے بہا تحفہ ہے۔

عہدِ مغلیہ یورپی سیاحوں کی نظر میں

قسط ۱۱

(۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۷ء)

ڈاکٹر محمد عمر شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

مغلوں کا خفیہ دستور (نمبر) !

جب وہ کسی بات کو صیغۂ راز میں رکھنا چاہتے تھے تو مغل بادشاہ مخصوص ایک خفیہ علامت کا استعمال کیا کرتے تھے۔ رو کے نقل کردہ دوسرے ایک واقعہ سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ غیب داں ایک لنگور بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا اس لنگور کی غیب دانی کی آزمائش کے لئے جہانگیر نے ایک کے پرزوں پر بعض نام لکھے اور لنگور سے صحیح آدمی کے نام کو نکالنے کے لئے کہا گیا۔ لنگور نے صحیح پرزہ نکال لیا۔" اس بات سے بادشاہ کو حیرت ہوئی اور اسے اس بات کا شبہ ہوا کہ اس کا مالک فارسی پڑھ سکتا تھا اور اس کی مدد کرسکتا تھا اس لئے اس نے درباری علامت کے رو سے ان ناموں کو دوبارہ لکھا اور دوبارہ انھیں اس کے سامنے رکھا گیا۔ وہ لنگور خاموش رہا اور دوبارہ اس نے صحیح پرچہ اٹھالیا۔

سرکاری ملازمین کو بخششیں اور دوسرے رسوم !

جب بادشاہ یا شہزادہ کسی شخص کو کوئی چیز دیتا تھا تو اس بات کو اس کی طرف سے ایک انعام سمجھا جاتا تھا۔ لہذا سرکاری ملازمین بخشش مانگا کرتے تھے۔ جہانگیر نے جب رو کو طلائی پیالہ عطا کیا تو رو کو" بادشاہ کے دربانوں اور غسل خانہ" کے خدمتگاروں

کو ۳۶ جہانگیری روپے دینا واجب ہوگیا۔ دوسرے ایک موقع پر شہزادہ خرم نے رو کو ایک خلعت دیا۔ جب وہ دربار سے جانے کے لئے باہر نکلا تو شہزادے کے تمام دربانوں اور خدمتگاروں نے اس کا تعاقب کیا۔ رو کے بیان کے مطابق باہر نکلنے سے پہلے ہی اس نے خلعت کی آدھی قیمت انہیں دیدی تھی۔

سنگین جرم کی سزا:

سنگین جُرم کی سزا موت تھی لیکن اگر ثبوت مشتبہ ہوتا یا بادشاہ اس آدمی کی زندگی بچانا چاہتا تو وہ اسے ایک غلام کی حیثیت سے اس امیر کے پاس بھجدیتا جس پر وہ نوازش کرنا چاہتا۔ غلام پاکر اس امیر کی بڑی عزت افزائی ہوتی۔

(۴) فوج اور شاہی خیمہ

شہر سے دو کوس کی دوری پر واقع اجمیر سے اپنے خیمے کے لئے جہانگیر کی روانگی کے بارے میں رو نے سارے رسوم پوری تفصیل سے قلم بند کئے ہیں۔ جوں ہی بادشاہ سیڑھی سے نیچے اترا تو " بادشاہ سلامت" کہکر اتنے پُرجوش نعرے لگائے گئے کہ " وہ نعرے توپوں کی آوازوں سے بھی بلند تھے"۔ سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہی ایک آدمی نے بہت بڑا ایک پیالہ پیش کیا اور دوسرے نے ایک تشت پیش کی جس میں خام جنس تھی۔ بادشاہ نے اس پیالے میں اپنی انگلیاں ڈبوئیں، مچھلی کو چھوا اور اس کے بعد اسے اپنے ماتھے پر مل لیا۔ تیسرے آدمی نے اس کے تلوار اور ڈھال باندھی، ڈھال میں بڑے یاقوت اور الماس جڑے ہوئے تھے۔ بادشاہ طلائی ایک بیلٹ بھی باندھے ہوئے تھا۔ چوتھے آدمی نے اس کا ترکش (جس میں تیس تیر تھے) اور ایک غلاف میں کمان لٹکائی۔

ایسے موقعوں کا لباس:

جہانگیر قیمتی ایک دستار باندھا کرتا تھا جس پر وہ " بگلا کے پروں کا چھوٹا ایک طرّہ"

باندھتا تھا۔ وہ پر لمبے ہوتے تھے لیکن زیادہ نہیں۔ دستار کے ایک طرف یغرجما ہوا یاقوت ہوتا تھا جو" اخروٹ کے برابر بڑا ہوتا تھا" دوسری طرف بڑا ایک الماس لٹکا ہوتا تھا۔ اس کے پٹکے میں چاروں طرف بڑے یاقوتوں، موتیوں اور الماسوں کی زنجیریں پڑی ہوتی تھیں جن میں سوراخ ہوتے تھے۔ عمدہ موتیوں کا تین لڑوں کا وہ ایک ہار گلے میں پہنتا تھا۔ (وہ اتنا بڑا تھا کہ میں نے ویسا کبھی نہیں دیکھا تھا) اس کی کہنیوں کے اوپر بازوبند تھے جن میں الماس جڑے ہوئے تھے اور اس کی کلائیوں میں مختلف قسم کے بنے ہوئے تین لڑیوں کا دست بند ہوتا تھا۔ اس کے ہاتھ غیر آراستہ تھے لیکن اس کی ہر ایک انگلی ایک انگوٹھی سے آراستہ تھی۔ اس کے انگریزی دستانے اس کی پیٹی کے نیچے کھونسے ہوئے تھے۔ بلا آستینوں کا اس کا لبادہ طلائی کپڑے کا تھا۔ اس کے پیروں میں چیتل کے کھال کے جوتے تھے جو منقش تھے۔ ان میں بھی موتی ٹکے ہوئے تھے۔ ان کے اگلے سرے نوکیلے اور مڑے ہوئے تھے۔

بادشاہ دوران سفر میں؛

دربارِ عام میں مسلح ہوکر وہ ایک انگریزی سواری (بگھی) میں سوار ہوا جس کے چلانے کے لئے انگریزی ملازمین موجود تھے۔ اس بگھی میں چار گھوڑے جُتے ہوئے تھے۔" جو طلائی مخملوں کے سازوسامان سے آراستہ تھے"۔ اس کے دونوں طرف دو دو خواجہ سرا ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں طلائی شاہی عصا تھے جن پر پوری طرح سے یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ اور مکھیوں کے اڑانے کے لئے ان کے ہاتھوں میں سفید گھوڑے کے دم کے بالوں کے پنکھے تھے۔ اس بگھی کے آگے آگے نقارچی بگلچی اور چھتری بردار چل رہے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ شہنشاہ کے شاہی علم بھی تھے جن پر یاقوت اور الماس جڑے ہوئے تھے کچھ زائد گھوڑے اور دوسری اقسام کا لکڑی کا سامان جن پر بھی الماس اور یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ چل رہے تھے۔ بادشاہ کے جلو میں (۱) تین پالکیاں تھیں۔ ان میں سے ایک میں طلائی چترا چڑھے

ہوئے تھے اور سروں پر بیش بہا پتھر ٹنکے ہوئے تھے۔ اس پر سُرخ مخمل چڑھا ہوا تھا جس پر موتیوں کے نقش ونگار بنے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ ایک آدمی پیدل چل رہا تھا جو ایک فٹ اونچا طلائی اسٹول لئے ہوئے تھا جس میں بھی بیش بہا پتھر جڑے ہوئے تھے۔ دوسری پالکیوں پر صرف طلائی کپڑا منڈھا ہوا تھا۔

(۲) پالکی کے پیچھے ایک دوسری بگھی چلتی تھی جس پر طلائی کپڑا پڑا ہوا تھا۔ اس پر "نور محل" سوار ہوتی تھی۔

(۳) اس کے پیچھے ایک تیسری بگھی چلتی تھی جو اس ملک کی بنی ہوئی اس کے مشابہ تھی۔ اس پر اس اس کے دو بیٹے سوار ہوا کرتے تھے۔

(۴) ان کے بعد شاہی بیس ہاتھی ہوتے تھے جن کے ہودے سنہری ہوتے تھے اور ان میں بیش بہا پتھر جڑے ہوتے تھے۔ ان میں سنہری، ریشمی اور اطلسی جھنڈے ہوتے تھے۔

(۵) ان ہاتھیوں کے پیچھے امراء چلتے تھے۔ شاہی سواروں کے دستوں سے ایک میل کی دوری پر حرم کی خواتین ہاتھیوں پر سوار ہو کر چلتی تھیں۔

دوران سفر میں بادشاہ محافظ ہاتھیوں کے درمیان سفر طے کرتے تھے جن میں سے ہر ایک کے اوپر ایک برُجی ہوتی تھی۔ چاروں کونوں پر زرد ریشمی کپڑے کے جھنڈے ہوتے تھے۔ ان کے سامنے گو پھن لئے ہوئے ایک سوار چلتا تھا۔ اس کے پاس ٹینس کی بڑی ایک گیند کے برابر ایک گولا ہوتا تھا۔ اس کے پیچھے تقریباً تین سو بندوقچی بیٹھے ہوتے تھے جبکہ دوسرے شاہی ہاتھی اس کے آگے پیچھے چلتے تھے۔ ان کی تعداد تقریباً چھ سو تھی۔ ان پر مخمل اور طلائی کپڑے کی جھولیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس سارے راستے میں پانی کی مشکیں لئے ہوئے بہشتی آگے آگے بھاگتے جاتے تھے اور اس راستے پر متواتر چھڑکاؤ کرتے جاتے تھے۔

پڑاؤ اور اپنے خیمے میں بادشاہ کا ورود!

بادشاہ کے خیمے کے ارد گرد انگریزی آدھے میل کے احاطے میں قناطیں لگی ہوتی تھیں باہر کی طرف کا رنگ سُرخ ہوتا تھا۔ اس خیمے کے وسط میں سیپیوں کا بنا ہوا ایک تخت زمین

سے اونچائی پر چار کھمبوں پر بنا ہوا تھا۔ یہ تخت بڑے ایک خیمے کے اندر ہوتا تھا جسکی بلیوں کے اوپری سروں پر طلائی مٹھیاں ہوتی تھیں۔ اس سونے پر قالین کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔

بادشاہ جب اس مقام پر پہونچا تو "بادشاہ سلامت" کے بلند نعروں سے وہ خیمہ گونج اٹھا۔ وہاں پہونچنے کے فوراً بعد اس نے پانی لانے کا حکم دیا۔ اس پانی سے اس نے اپنے ہاتھ دھوئے اور اپنی قیام گاہ میں چلا گیا۔

شاہی پڑاؤ میں شکار کھیلنے جانے کیوجہ سے شام کا دربار ملتوی!

جب بادشاہ پڑاؤ میں قیام پذیر ہوتا تھا تو شام کا دربار "ملتوی" رہتا تھا۔ اسکے بجائے وہ اپنا وقت ایک کشتی پر سوار ہوکر تالاب میں شکار کھیلنے اور شاہین بازی میں گذارتا تھا۔ اس طرح کی شاہین بازی سے بادشاہ بہت "محظوظ" ہوتا تھا۔ اس کی کشتیوں کو بیل گاڑی میں لاد کر اس کے ساتھ ساتھ لے جایا جاتا تھا۔ پڑاؤ کے قیام کے دوران وہ جھروکہ درشن کے لئے نمودار ہوتا لیکن گفتگو کرنا ممنوع تھا۔

پڑاؤ کا بیان!

شاہی پڑاؤ کے وسط میں باقاعدہ گلیاں بنائی جاتی تھیں اور خیمے ایک دوسرے سے مربوط ہوتے تھے۔ ہر ایک منصبدار اور تاجر کو اس بات کا علم ہوتا تھا کہ شاہی خیمے سے کتنی دوری پر اسے اپنا خیمہ نصب کرنا چاہیئے۔ اور اسے "کس جگہ کا انتخاب کرنا چاہیئے۔ اور سلا رد و بدل کے کس طرز پر خیمہ لگانا چاہیئے۔ تسبیح خانے سے (جہاں بادشاہ کو بطور نذر دی گئی چیزیں رکھی ہوتی تھیں) دستی ایک بندوق کی مار تک کے حدود کے اندر کوئی شخص داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ پڑاؤ میں بڑی سخت نگرانی رکھی جاتی تھی لیکن برائے نام۔ پڑاؤ کے حدود کے اندر ہر قسم کی دوکانیں ہوتی تھیں۔ وہ اس ترتیب سے لگائی جاتیں اور نمایاں ہوتیں کہ ہر ایک شخص کو یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ کون سی چیز کہاں سے خریدے۔ پڑاؤ کے خیمے بہت "عمدہ ساخت" کے ہوتے تھے۔ بعض سفید، بعض ہرے اور بعض رنگ برنگے۔ "محیط رقبہ

کے اندر ہر چیز ایسی ترتیب سے پائی جاتی تھی ... کہ
وہاں ایسی شان و شوکت تھی کہ ویسی میں نے کبھی نہیں دیکھی
کی طرح کہیں کبھی پائی جاتی تھی۔

ہر فرد کے لئے الگ الگ دو ساز و سامان ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک دوسرے دن
قیام کے لئے آگے جاکر لگا دیا جاتا تھا۔

پڑاؤ میں خرّم کی موجودگی!

رَو کا بیان ہے کہ" جیساکہ اس نے بادشاہ کے بارے میں لکھا ہے۔ اسی شان و
شوکت اور عظمت سے خرّم تخت پر بیٹھا کرتا تھا۔ اس کے تخت پر چاندی کی پتریں
چڑھی ہوئی تھیں جن پر پھولوں کے سنہرے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ اس تخت کے
اوپر ایک چوکور شامیانہ چاندی کے چار لٹھوں پر لگا ہوا تھا۔ چھوٹی ڈھال، کمان، تیر اور
کمان پر مشتمل اس کے ہتھیار اس کے سامنے ایک میز پر رکھ دیئے جاتے تھے۔

رَو نے لکھا ہے کہ" میں نے ایک ایسا باوقار چہرہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کوئی بھی
فرد ایسی سنجیدگی کو متواتر برقرار نہیں رکھ سکتا، وہ نہ تو کبھی مسکراتا۔ نہ ہی اس کے چہرے
سے آدمیوں کے لئے عزّت یا علامتِ امتیازی ظاہر ہوتی تھی لیکن بڑے تکبّر اور سب
لوگوں کے لئے نفرت کے مخلوط آثار نمایاں ہوتے تھے۔"

(۵) امراء

ایک معتوب امیر کی دربار میں حاضری!

احمد آباد کا گورنر عبداللہ خاں، معتوب ہوا (۱۰ اکتوبر ۱۶۱۶ء) کو اسے مجمع دکے کے
سامنے ننگے پیر جن پر بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں، دو امیروں نے پیش کیا۔ اپنی پگڑی اپنی
پیشانی پر کرکے اپنی آنکھیں ڈھک لی تھیں تاکہ بادشاہ کے دیکھنے سے پہلے اس کی نظر کسی
دوسرے پر نہ پڑے۔ تسلیمات ادا کرنے کے بعد اس سے چند سوالات کئے گئے اور اسے

بیڑیاں کھول دی گئیں۔ اسے ایک سنہری خلعت پہنایا گیا۔ مزید ایک دستار پہنائی گئی اور اس کی کمر میں ایک پٹکا باندھا گیا۔ شہزادہ خرم کی ... اس پر سے معاف کر دیا گیا۔

خرم کا شکریہ ادا کرنے کے لئے عبداللہ خاں اسکی خدمت میں حاضر ہوا!

بیس گھوڑوں پر طبل بجاتے ہوئے عبداللہ خاں خرم کے محل کے دروازے پر پہونچا (۱۶ اکتوبر ۱۶۱۶ء) اس کے آگے سفید علم لئے ہوئے پچاس گھوڑ سوار چل رہے تھے، اور ان کے پیچھے دو سو سپاہی سجے ہوئے گھوڑوں پر سوار، طلائی مخمل اور بھڑکیلے ریشمی لبادوں میں ملبوس ترتیب سے چل رہے تھے۔ ان کے بعد چالیس باوردی سپاہیوں کے ساتھ عبداللہ خاں کی سواری تھی۔ یہ سپاہی ڈھالوں اور تلواروں سے مسلح تھے۔ اس نے بڑے خضوع و خشوع کے ساتھ شہزادہ کو تسلیمات پیش کئے اور اس کی خدمت میں کالے رنگ کا عربی ایک گھوڑا پیش کیا جس کے ساز و سامان پر طلائی پھول بنے ہوئے تھے اور ان پر بیش بہا پتھر اور زمرد جڑے ہوئے تھے۔ اس شہزادہ نے اسے ایک دستار، خلعت اور پٹکا پیش کیا۔

سواری کا طریقہ!

امرا سو سے پانچسو کی تعداد میں پیدل سپاہیوں کیساتھ سواری کرتے تھے۔ ان کے آگے آگے ۵ یا ۶ جھنڈے چلتے تھے۔ سو سے دو سو تک گھوڑ سوار سپاہی بھی ان کے ہمراہ ہوتے تھے۔ وہ اپنے گھوڑوں کو بڑی احتیاط سے رکھتے تھے۔ وہ انھیں گھی اور شکر کھلایا کرتے تھے۔

طعام!

میر جمال الدین حسن نے رو کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا وہ قالینوں پر بیٹھے، علیحدہ دو جگہوں پر کھانے کا انتظام کیا گیا۔ کھانے کے لئے فرش پر دستر خوان بچھایا گیا۔

کے اندر ہر چیز ایسی ترتیب سے پائی جاتی تھی جیسے کہ ایک گھر میں یہ ایک ایسا عجوبہ تھا اور
وہاں ایسی شان و شوکت تھی کہ ویسی میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس وادی میں ایک شہر
کی طرح گہما گہمی پائی جاتی تھی۔

ہر فرد کے لئے الگ الگ دو ساز و سامان ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک دوسرے دن
قیام کے لئے آگے جاکر لگا دیا جاتا تھا۔

پڑاؤ میں خرم کی موجودگی!

رو کا بیان ہے کہ "جیساکہ اس نے بادشاہ کے بارے میں لکھا ہے۔ اسی شان و
شوکت اور عظمت سے خرم تخت پر بیٹھا کرتا تھا۔ اس کے تخت پر چاندی کی پرتیں
چڑھی ہوئی تھیں جس پر پھولوں کے سنہرے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ اس تخت کے
اوپر ایک چوکور شامیانہ چاندی کے چار لٹھوں پر لگا ہوا تھا۔ چھوٹی ڈھال، کمان، تیر اور
کمان پر مشتمل اس کے ہتھیار اس کے سامنے ایک میز پر رکھ دیئے جاتے تھے۔

رو نے لکھا ہے کہ "میں نے ایک ایسا باوقار چہرہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کوئی بھی
فرد ایسی سنجیدگی کو متواتر برقرار نہیں رکھ سکتا، وہ نہ تو کبھی مسکراتا۔ نہ ہی اس کے چہرے
سے آدمیوں کے لئے عزت یا علامتِ امتیازی ظاہر ہوتی تھی لیکن بڑے تکبر اور سب
لوگوں کے لئے نفرت کے مخلوط آثار نمایاں ہوتے تھے۔"

(۵) امراء

ایک معتوب امیر کی دربار میں حاضری!

احمد آباد کا گورنر عبداللہ خاں، معتوب ہوا (۱۰ اکتوبر ۱۶۱۶ء) کو اسے مجمع کے
سامنے ننگے پیر جن پر بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں، دو امیروں نے پیش کیا۔ اپنی پگڑی اپنی
پیشانی پر کر کے اپنی آنکھیں ڈھک لی تھیں تاکہ بادشاہ کے دیکھنے سے پہلے اس کی نظر کسی
دوسرے پر نہ پڑے۔ تسلیمات ادا کرنے کے بعد اس سے چند سوالات کئے گئے اور اسے

معاف کر دیا گیا۔ اس کی بیڑیاں کھول دی گئیں۔ اسے ایک سنہری خلعت پہنایا گیا۔ مزید برآں اسے ایک دستار پہنائی گئی اور اس کی کمر میں ایک پٹکا باندھا گیا۔ شہزادہ خرم کی سفارش پر اسے معاف کر دیا گیا۔

خرم کا شکریہ ادا کرنے کے لئے عبداللہ خاں اسکی خدمت میں حاضر ہوا!

بیس گھوڑوں پر طبل بجاتے ہوئے عبداللہ خاں خرم کے محل کے دروازے پر پہونچا (۱۶ اکتوبر ۱۶۱۶ء) اس کے آگے سفید علم لئے ہوئے پچاس گھوڑ سوار چل رہے تھے، اور انکے پیچھے دوسو سپاہی سجے ہوئے گھوڑوں پر سوار، طلائی مخمل اور بھڑکیلے ریشمی لبادوں میں ملبوس ترتیب سے چل رہے تھے۔ ان کے بعد چالیس باوردی سپاہیوں کے ساتھ عبداللہ خاں کی سواری تھی۔ یہ سپاہی ڈھالوں اور تلواروں سے مسلح تھے۔ اس نے بڑے خضوع و خشوع کے ساتھ شہزادہ کو تسلیمات پیش کئے اور اس کی خدمت میں کالے رنگ کا عربی ایک گھوڑا پیش کیا جس کے ساز و سامان پر طلائی پھول بنے ہوئے تھے اور ان پر بیش بہا پتھر اور زمرد جڑے ہوئے تھے۔ اس شہزادہ نے اسے ایک دستار، خلعت اور پٹکا پیش کیا۔

سواری کا طریقہ!

امرا سو سے پانچسو کی تعداد میں پیدل سپاہیوں کیساتھ سواری کرتے تھے۔ ان کے آگے آگے ۵ یا ۶ جھنڈے چلتے تھے۔ سو سے دو سو تک گھوڑ سوار سپاہی بھی ان کے ہمراہ ہوتے تھے۔ وہ اپنے گھوڑوں کو بڑی احتیاط سے رکھتے تھے۔ وہ انھیں گھی اور شکر کھلایا کرتے تھے۔

طعام!

میر جمال الدین حسن نے رو کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا وہ قالینوں پر بیٹھے، علیحدہ دو جگہوں پر کھانے کا انتظام کیا گیا۔ کھانے کے لئے فرش پر دستر خوان بچھایا گیا۔

جہاں رو کے کھانے کا انتظام کیا گیا تھا وہاں سے چند قدموں کی دوری پر اسی انداز سے دوسری جگہ انتظام کیا گیا تھا۔ یہ انتظام ان شرفا کے لئے کیا گیا تھا جو اس کے ہمراہ گئے تھے؛ کیونکہ وہ ہمارے ساتھ ملنا جلنا ایک قسم کی ناپاکی سمجھتے تھے" رو کے اس احتجاج پر کہ اس کے میزبان نے اس کے ساتھ کھانا کھانے کا دعدہ کیا تھا۔ میر جمال حسن اس کے دسترخوان پر آ گیا مختلف قسم کے کھانوں میں بادام، پستے اور پھل بھی تھے۔ رات کے کھانے کے وقت بھی دسترخوان بچھائے گئے۔ ایک دسترخوان پر رو، پادری جون ہال اور ایک تاجر کے ساتھ بیٹھا اور دوسرے دسترخوان پر اپنے دوسرے مہمانوں کے ساتھ میزبان بیٹھا۔ کھانے میں مختلف چیزیں تھیں۔ بھنا گوشت، اور شوربہ دار سالن، مختلف قسم کے چاول جیسے بریانی اور اُبلے ہوئے چاول۔

بطور تحفہ مصری پیش کرنے کا دستور :

اس (جمال الدین حسن) نے اس دستور کے مطابق جب کسی کو کھانے پر مدعو کیا جاتا ہے، بطور تحفہ مجھے مصری کے پانچ ڈبے دیئے۔ اور بہت عمدہ مصری کا ایک ٹکڑا جو برف کی طرح سفید تھا۔

متفرقات

جہانگیری غیظ و غضب :

۱۳ مارچ ۱۶۱۶ء کو رو غسل خانہ میں یہ شکایت لے کر گیا کہ اس کے ساتھ ناانصافی ہوئی تھی۔ پہلے تو آصف خاں نے اپنے ترجمان کو الگ رکھا۔ لیکن بعد میں جب دباؤ کی وجہ سے اسے بلانے پر مجبور ہو گیا تو وہ میرے ترجمان کے ایک طرف کھڑا ہو گیا، اور میں دوسری طرف۔ میں نے اسے اپنی شکایتوں کے بارے میں بتانا شروع کیا اور اس نے اس شکایت کو لکھ لیا۔ بڑی مشکل سے رو اپنی شکایتیں بادشاہ کی خدمت میں پیش کر سکا۔ "میری شکایت سنتے ہی یک بیک بادشاہ طیش میں آ گیا۔ اور بے حد غضبناک ہو کر اس بات کے جاننے پر زور دیا کہ کس نے ان کے ساتھ ناانصافی کی تھی۔ جو کچھ اس نے کہا میری سمجھ میں کچھ نہیں

آیا۔ ٹوٹی پھوٹی اسپینی زبان میں میں نے اپنے ترجمان سے کہا کہ وہ یہ کہدے کہ جو کچھ پیش آیا تھا، وہ اس کے بارے میں بادشاہ کو مزید تکلیف نہیں دینا چاہتا بلکہ وہ اس کے بیٹے شہزادہ سے انصاف کرنے کی مانگ کرے گا۔ اس کے لطف وکرم کے بارے میں اسے شبہ نہ تھا۔ لیکن بادشاہ نے میرے ترجمان کی بات نہ سنی بلکہ اپنے بیٹے کا نام سنتے ہی وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ غالباً میں نے اس پر الزام لگایا تھا اور اسے بلوا یا گیا۔ وہ بڑے انکسار اور خوف زدہ حالت میں آیا۔ آصف خاں کانپنے لگا اور جو لوگ وہاں موجود تھے وہ انگشت بدنداں تھے۔

ایک عورت کو سزا!

جس عورت کو سزا دی گئی تھی وہ نورمحل سے وابستہ تھی۔ اور کسی کام سے اسے خواجہ سرا کے ساتھ بادشاہ کے محل میں لے جایا گیا تھا۔" اس عورت کو کمر سے اوپر تک زمین میں گاڑ دیا گیا، اس کے پیروں کو بلی سے باندھ دیا گیا۔ وہاں اسے دو دن اور دو رات بلا کھانا پانی کے رکھا گیا۔ اس کا سر اور بازو کھلے تھے سورج کی تپش میں وہ کھڑی تھی۔ اگر وہ اس دوران مر جائے تو اسے معاف کر دیا جائے گا۔ لیکن خواجہ سرا کو ہاتھی کے پیر کے نیچے کچلوا کر مروا دیا گیا۔ روَ نے یہ بھی لکھا ہے کہ" وہ دوشیزہ باتوں کے فریب، جواہرات اور ایک لاکھ روپے کی لالچ میں آکر راضی ہو گئی تھی۔"

خسرو کا قضیہ!

روَ نے لکھا ہے کہ "خرم، نورجہاں، آصف خاں اور اعتماد الدولہ" اعلیٰ اختیار رکھتے تھے اور" سب لوگوں" پر حکومت کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک خسرو زندہ رہے گا اور قید سے اس کی آزادی" جنتا" کے مفاد کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگی۔ اس لئے انہوں نے اسے اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش کی۔

" ایک عورت کے سحر انداز چاپلوسی کے جھوٹے آنسوؤں سے،" نورمحل نے بادشاہ کا فریفتہ کر لیا اور اس سے یہ کہا کہ خسرو کی جان خطرہ میں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لہذا اس کی جا

کی حفاظت کے لئے اسے اس کے بھائی کے حوالے کر دینا چاہیئے۔ اور اسے راجپوت محافظ دستے کی نگرانی میں نہیں رکھنا چاہیئے۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر جب جہانگیر نشے میں تھا تو وہ اس بارے میں اس سے ایک حکم نامہ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک رات اپنے محافظ سپاہی کے ساتھ آصف خاں تواب رائے کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ بادشاہ کے حکم کے مطابق وہ خسرو کو اس کے حوالے کر دے۔ اس راجپوت نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ بادشاہ نے اپنے ہاتھوں سے خسرو کو اس کے حوالے کیا تھا۔ اور کوئی اسے اس سے اس وقت تک نہیں لے سکتا جب تک سویرے وہ بادشاہ سے اس بارے میں معلوم نہ کر لے۔ صبح جب اس نے جہانگیر سے اس بارے میں معلوم کیا تو اس نے جواب دیا۔ "تم نے وفاداری ایمانداری کا کام کیا ہے۔ تم نے دوراندیشی کا جواب دیا تھا۔ تم اپنا فرض انجام دیتے رہو اور کسی طرح کے حکم کی پرواہ نہ کرو۔"

۱۷ اکتوبر ۱۶۱۶ء کو خسرو کو آصف خاں کے حوالے کر دیا گیا۔ اس کی بہن اور حرم سرا کی بہت سی مستورات نے اس بات کا ماتم کیا اور کھانا نہیں کھایا۔ تمام لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ جہانگیر نے محض اپنے بیٹے کی زندگی نہیں بلکہ اپنی زندگی "ایک حوصلہ مند شہزادے اور دغا باز ایک جماعت" کے ہاتھوں میں سونپ دی تھی۔ رو نے لکھا ہے کہ "وہ غریب شہزادہ ایک ببر شیر کے قبضے میں ہے۔ وہ گوشت نہیں کھاتا اور اس کی یہ خواہش ہے کہ اس کا باپ خود ہی اس کی جان لے لے اور اس کے دشمنوں کو کامیابی اور خوشی حاصل نہ ہونے دے۔" سارے دربار کے لوگ کانا پھوسی میں لگے ہوئے ہیں۔ امراء رنجیدہ ہیں اور عوام شور و غل کر رہے ہیں۔ یہ مسئلہ بہت خطرناک ہے۔" (جاری)

****

تبصرہ نگار: حضرت مولانا حبیب الرحمٰن ندوی میوانی
اسلامک اسٹڈیز۔ ہمدرد یونیورسٹی نئی دہلی

نام کتاب : انوار خیال

مصنف : ڈاکٹر مولانا غلام یحییٰ انجم

صفحات : ۱۶۷

اشاعت : ۱۹۹۱ء بتعاون مالی فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی اتر پردیش لکھنؤ۔

ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم درس نظامی کے باضابطہ فارغ التحصیل اور علی گڑھ دانشگاہ کے ایم۔اے اور پی ایچ ڈی ہیں بظاہر قدیم وجدید کے سنگم۔

یہ کتاب مصنف کے چھ مختلف مگر مربوط ایسے مقالات پر مشتمل ہے جو اب سے پہلے متفرق رسائل میں اشاعت پذیر ہو چکے ہیں موضوعِ بحث عربی زبان وادب تاریخ وتذکرہ اور سیر وسوانح ہے۔ اردو داں طبقہ کو عربی زبان کی وسعت و ہمہ گیری جامعیت وخوردہ گیری اور اس کی لطیف طرز ادا وغیرہ سے روشناس کرانے کی مستحسن کوشش ہے۔

پہلا مقالہ "المقفی الکبیر" کے تعارف وتبصرہ اور اس کے جلیل القدر مؤلف علامہ تقی الدین المقریزی کے سوانح زندگی اور کارناموں پر مشتمل ہے۔

مصری تہذیب وثقافت بہت قدیم ہے اور حیرت انگیز عجائبات کی حامل۔ مصری تمدن نے عرصۂ دراز تک اس عالم رنگ و بو میں دھوم مچائی ہے اور اس کائنات کی فضائے بسیط کی لہروں میں ارتعاش پیدا کیا ہے۔ ظاہر ہے اس کی تاریخ اور ان افراد نادرۂ روزگار کے شئون وکوائف سے ہر ذہین آدمی واقف ہونا چاہتا ہے جنھوں نے اس تہذیب وتمدن کے نقش ونگار بنائے "المقفی الکبیر" مصری ارباب فضل وکمال علماء وشعراء، ادیب ونثر نگار، ہنرمند، حکماء اور مشہور تجارت پیشہ افراد

کی تفصیلی ڈائرکٹری ہے۔

علامہ تقی الدین مقریزی کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی ذہن رسا، پختہ شعور، فکر بلیغ، عقل سرمایہ دار، بے پایاں علم اور جادو نگاہ قلم فطرت کی طرف سے انھیں دیئے گئے۔ اور انھوں نے اپنی ان ساری توانائیوں کو مشاہیر مصر کی داستاں سرائی، حدیث و فقہ کی نکتہ آفرینی، آثار و علائم کی نشاندہی و تبصرہ وغیرہ میں بھرپور طریقہ سے صرف کیا اور اپنے ہمعصروں سے اپنا لوہا منوایا۔

اس مقالہ میں ان کی سیرت و اخلاق، فضائل و عادات اور دوسرے کمالات کو اجاگر اور ان کے تصنیفی کام کا اجمالی جائزہ اور "المقفی الکبیر" پر تفصیلی تبصرہ کیا گیا ہے۔

دوسرا مقالہ ملا صدرا کے تذکرہ اور ان کے اہم رسالہ "وحدۃ الوجود" کا سمجھ میں آنے والا تعارف ہے۔ ملا صدرا درس نظامی کے طلبہ کے لئے تو نہیں مگر عام قارئین کے لئے یقیناً نئے ہیں یہ بہت بڑے عالم و فاضل اور ادیب و مفکر تھے اور اس سے بھی بڑے منطقی و فلسفی ادبیات میں کم کوئی ان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ ان کی کتاب درس نظامی کے اعلیٰ نصاب میں داخل ہے مگر طلبہ ان کے نام کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتے۔ اس مقالہ میں ان کے کوائف حیات مختصراً بیان کئے گئے ہیں اور مستند حوالوں کے ساتھ اور رسالہ وحدۃ الوجود کا دلچسپ تعارف ہے۔

تیسرا مقالہ "اخبار الجمال" نامی ایک مخطوطہ کا تفصیلی تعارف ہے جو علی گڑھ کی تاریخ کا اہم ماخذ ہے۔ چوتھے کا عنوان ہے "درس نظامی کے جدید تقاضے" پانچویں کا نام ہے عربی زبان کی نمایاں خصوصیات" اور چھٹا مقالہ عربی دنیا کے عبقری ادیب، سحر طراز منشی اور نثر نگار دانشور علامہ جاحظ کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔

درس نظامی کا تفصیلی تعارف اور اس کے نشیبی مقامات کی نشاندہی اور ساتھ ساتھ مداوا بھی ذکر کرکے فاضل مصنف نے وقت کا اہم سوال چھیڑ کر اس کے جواب کی سعی محمود کی ہے واقعی حیرت کا مقام ہے کہ دانشگاہ مشرق کا فاضل حالات جہاں سے بے خبر انسانی ذہن کی جستجو کے آفاق جدیدہ سے بے بہرہ اور نئے دور کے مسائل کو اسلام کی روشنی میں حل کرنے سے قاصر اُف توبہ؟؟ ضرورت کی اہم چیزوں سے واقفیت نظام تعلیم کا ضروری حصہ ہے آخری دو مقالوں میں عربی زبان کی وسعت پنہائی، طرز ادا کی رعنائی اسلوب نگارش کی دلکشی و زیبائی اور اسی قسم کے دوسرے لغوی و فنی

(باقی صفحہ ۲ پر)

سرپرست

جلد ۱۱۴ | جولائی ۱۹۹۴ء مطابق صفر ۱۴۱۵ھ | شمارہ ۲

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

نظرات

ہوشیار۔ خبردار! اب مسلمانوں کے خلاف شیڈول کاسٹ طبقہ میں زہر بھرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور اس کے بعد اگر خدانخواستہ یہ ناپاک کوشش کسی طرح کامیاب ہوگئی تو پھر ہندوستان میں ملک گیر پیمانے پر ہندو مسلم فسادات کے ذریعہ اقلیت کا استحصال کیا جائے گا۔ ایسا اندیشہ و خدشہ کا اظہار کرنے کے لئے ہمارے پاس ماضی کے سینکڑوں واقعات کا ڈھیر بکھرا پڑا ہے ان سب کو ایک جگہ جمع کرکے ان کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ ہندوستان کی فرقہ پرست اور فاسسٹ طاقتیں غلط بیانی، جھوٹ، مکاری اور فریب دہی کے ذریعہ اقلیت کے خلاف عوام الناس میں غلط باتیں پھیلا کر غصہ و اشتعال پیدا کرنے کے درپہ ہیں۔

حالیہ اسمبلی انتخابات میں ان فرقہ پرست طاقتوں کو جس طرح شکست کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ اس سے یہ ایک طرح بوکھلا گئی ہیں۔ اور اس بوکھلاہٹ میں ملک کی سالمیت یا ملک کا مفاد بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل ہوگیا ہے۔ اور وہ اس کا بدلہ کسی بھی طرح لینا چاہتی ہیں۔ یوپی اسمبلی انتخاب میں فرقہ پرست طاقتوں کی شکست تو ان کے لئے سوہان روح بن گئی ہے۔ جہاں انہیں "جے شری رام" نعرے کی آڑ میں اور بابری مسجد کے انہدام کے معاوضہ و انعام کے حصول اور یوپی اسمبلی کے انتخابات میں پہلے سے بھی زیادہ بڑی اکثریت سے کامیابی حاصل ہونے کی امید ہی نہیں بلکہ یقین واثق تھا۔ ہاں یقین و امید خام خیال ثابت ہوکر رہی اور معاوضہ و انعام کے بدلے یوپی کے سمجھدار عوام نے کسی کھوکھلے نعرے میں نہ بہکتے ہوئے ایسے فرقہ پرست امیدواروں کو شکست سے دوچار کیا۔ اس شکست کی وجہ سے اب یہ فرقہ پرست طاقتیں کسی عمدہ صلاحیت کو اپنانے کے بجائے ایسے نازک ہتھکنڈے استعمال کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں جو ملک و قوم کی تباہی کا ہی راستہ ہے جس کو کوئی بھی محب الوطن برداشت نہیں کرسکتا۔ ملک اور

قوم کی سلامتی و ترقی چاہنے والے کبھی بھی فرقہ پرست طاقتوں کے ناپاک منصوبوں کو کامیاب نہ
ہونے دیں گے۔ یو پی میں بڑی خاموشی کے ساتھ کچھ فرقہ پرست طاقتیں شیڈول کاسٹ طبقہ
اور مسلمانوں کے بیچ نفرت کے بیج بونے میں مصروف ہیں۔ اس کے لئے بہوجن سماج پارٹی کے
بعض ارکان جن میں ایک خاتون بھی ہیں دانستہ یا نادانستہ طور پر ان کے معاون بنے ہوئے
ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ دکھ و افسوس کی بات ہے۔ ایسے موقع پر یو پی حکومت جو ابھی اقتدار
شاہی کے دلدل سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئی ہے بابا صاحب امبیڈکر کی ان تحریروں کی اشاعت
میں لگی ہوئی ہے جو انہوں نے کسی جذباتی و غصہ کے موقع پر لکھے تھے لیکن بعد میں ان کا ان تحاریر
سے کوئی واسطہ و تعلق ہی نہیں تھا۔

اس وقت ہمارے پیش نظر ۲۰ جون ۱۹۹۴ء کا نئی دہلی سے شائع ہونے والا "جن ستا"
ہے اس کے پہلے صفحہ پر اس کے نامہ نگار مسٹر ہیمنت شرما کی تفصیلی رپورٹ ہے جس کے مطابق
باسپا میں گہرا تا سنکٹ اب مایاوتی بنام مسلمان ہوتا جا رہا ہے۔ مظفر نگر اور رڑکی کے جلسوں
میں مسلمانوں کو مایاوتی نے غدار کہا اس پر ڈاکٹر مسعود جو بہوجن سماج پارٹی کے ٹکٹ پر یو پی
اسمبلی کا انتخاب جیتے اور پھر یو پی حکومت میں وزیر تعلیم بنائے گئے، مگر پھر پارٹی کی ہی ایک
اہم رکن مایاوتی کے مذکورہ بالا جملے پر انہوں نے وزارت تعلیم یو پی سے استعفیٰ دیدیا ہے کہ
مسلمانوں کو صرف مایاوتی ہی نے غدار نہیں کہا ڈاکٹر امبیڈکر بھی مسلمانوں کو ترقی پسند اور وطن پرست
نہیں مانتے تھے۔ مسلمانوں کے بارے میں بابا صاحب امبیڈکر کے کیا خیالات تھے اسے مسلمانوں کو
بتانے کی باقاعدہ اسکیم بنی ہے۔ صوبائی حکومت ڈاکٹر امبیڈکر کا لٹریچر آٹھ حصوں میں چھاپ رہی
ہے ان میں شروع کے دو حصے چھپ چکے ہیں آٹھویں حصے میں ڈاکٹر امبیڈکر کے خیالات
مسلمانوں کے بارے میں ہیں اس میں ڈاکٹر امبیڈکر کے خیالات مسلمانوں کے بارے میں ہیں اس
میں ڈاکٹر امبیڈکر نے کہا ہے کہ " ہندو مسلم اتحاد ممکن نہیں ہے مسلمانوں کی وفاداری پر سوال
کرتے ہوئے یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہندو مسلمانوں کی ایکتا بے قابو ہے۔
آٹھویں حصے کے صفحہ ۳۰۱ پر تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ " اگر بھارت پر کوئی غیر ملکی فوج
حملہ کرے تو کیا بھارتی فوج کے مسلمانوں پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے مان لیجئے حملہ آور مسلمان ہو

تو مسلمان حملہ آور کی طرف ہو جائیں گے؟ یہ اہم سوال ہے؟ یا ان کے خلاف لڑیں گے؟ یہ اہم سوال ہے ڈاکٹر امبیڈکر نے مسلمانوں کی وطن پرستی پر سوال کھڑا کیا ہے۔ آزادی سے پہلے جو ہندو مسلم دنگے ہوئے اس کے لئے بھی ڈاکٹر امبیڈکر مسلمانوں کو قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے اس بات پر غصہ جتایا ہے کہ گاندھی جی کے من میں مسلمانوں کے لئے اس کے بعد بھی ہمدردی تھی ڈاکٹر امبیڈکر کہتے ہیں کہ ہندوؤں کے لئے بہتر راستہ کیا ہوگا؟ مسلمان ملک کے باہر رہ کر ملک کی مخالفت کریں یا ملک کے اندر رہ کر خلافت کریں کوئی بھی ہوشیار آدمی اس کا یہ ہی جواب دے گا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف رہنا ہی ہے۔ ملک کے باہر رہ کر خلافت کریں بجائے اس کے کہ وہ ملک کے اندر رہیں۔ (صفحہ ۹۹)

ہندو اور مسلمانوں کی بابت ذکر کرتے ہوئے بابا صاحب لکھتے ہیں کہ مسلمان اپنی ضد کو تب ہی چھوڑتے ہیں جب ہندو مسلمانوں کو کچھ سہولتیں دیکر ان کی قیمت چکانے کو تیار ہو جاتے ہیں اسلامی قانون میں قربانی کے لئے گائے [illegible] نہیں ہے اور کوئی بھی مسلمان حج کے وقت مکہ مدینہ میں گائے کی قربانی نہیں کرتا ہے لیکن بھارت کے [illegible] مسلمان کسی اور جانور کی قربانی پر راضی نہیں ہوتے سبھی مسلمان ملکوں میں بغیر کسی اعتراض کے مسجد کے سامنے باجہ بجایا جاسکتا ہے لیکن بھارت میں چونکہ ہندو اس حق کا دعویٰ کرتے ہیں اس لئے مسلمان اسے روکنے میں لگے ہیں۔ . . . مسلمانوں نے سیاست میں اجتماعی غنڈہ گردی کا طریقہ اپنا لیا ہے۔ دنگوں سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ غنڈہ گردی سیاست میں ان کے طریقہ کار کا مستقل حصہ بن گیا ہے۔ (صفحہ ۲۶۹) بھارت کا ہر مسلمان اسی وجہ سے یہ کہنے کے لئے تیار رہتا ہے کہ وہ مسلمان پہلے ہے اور بھارتی بعد میں اسی وجہ سے پتہ چلتا ہے کہ بھارت کے مسلمانوں نے بھارت کی ترقی میں اتنا چھوٹا سا حصہ کیوں لیا ہے۔ (صفحہ ۲۹۰)

نہ معلوم ڈاکٹر امبیڈکر نے مذکورہ بالا باتیں کن حالات کن حالات میں کہیں بعد میں ان کے خیالات مسلمانوں سے متعلق جس قدر اچھے تھے وہ سب ہی کو معلوم ہے مگر اس وقت ان باتوں کی اشاعت نہ معلوم کس مقصد سے کی جارہی ہے یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے اگر بہوجن سماج پارٹی سے ناراض مسلمان اسے اپنے فائدے میں سمجھ رہے ہیں تو انھیں اس حقیقت کو بھی اپنے گلے میں اتارنا ہوگا۔

یہ من حیث القوم خطرناک بات ہوگی اس سے مسلم اقلیت کو مستقبل میں خطرناک حالات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ لہذا وقتی فائدے کی خاطر آنے والے نقصانات و خطرات کو خدا کے لئے نظر انداز نہ کیا جائے یہ ہماری گذارش ہے۔

آجکل بنگلہ دیش میں تسلیمہ نسرین نام کی ایک عورت کی کہی ہوئی کچھ قابل اعتراض باتوں پر ایک عجیب وغریب ماحول پیدا ہوا دکھائی دیتا ہے جس کا اثر تمام دنیا میں دکھائی دے رہا ہے۔
پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر ایک انڈا گندہ نکل جاتا ہے تو ہم اسے فوراً کوڑے دان میں پھینک دیتے ہیں۔ نہ کہ اسے فرج میں سجا کر لوگوں کو دکھانے کے لئے رکھیں۔ اسلام ایسا مذہب تو ہے نہیں کہ اسے ایک گندی عورت کی واہیات باتوں سے کسی قسم کا خطرہ پیدا ہو جائے۔ اسلام تو ایک اعلیٰ و اکمل مذہب ہے جو اپنی خوبیوں پر کیوں کی وجہ سے صدیوں سے انسانوں کے دلوں کی گہرائیوں میں جگہ لئے ہوئے ہے ایسے تسلیمہ نسرین نام کی کوئی عورت یا سلمان رشدی نام کا کوئی مرد اپنی گندی باتوں سے ذرا بھی گزند نہیں پہنچا سکتا ہے۔ ایسے گندے شخص اور ایسی گندی عورت کی باتوں کا نوٹس لینا ہی حماقت کی بات ہے۔ ماں باپ کی باغی لڑکی کسی کوٹھے ہی پر بیٹھتی ہے نہ کہ کسی مینارۂ عظمت پر اسے بٹھایا جاتا ہے۔ ہم لوگ ایسی مردود کم بخت بدکار عورت کی مکارانہ تحریروں پر صدائے احتجاج بلند کر کے ایک طرف تو اس کو شہرت کی بلندی پر پہنچانے کی جانے انجانے میں کوشش کر ڈالتے ہیں۔ بدنام ہوئے تو کیا نام نہ ہوگا دوسری طرف مخالفین اسلام کے ہاتھ میں خواہ مخواہ کا ایک حربہ دے ڈالتے ہیں جس سے انہیں کچھ دنوں تک مسلمانوں کی دل آزاری کرنے کے لئے ہرزہ سرائی کا موقع مل جائے ــــ جو ایسے موقع پانے کی ہمیشہ تاک میں رہتے ہیں۔ ہمارے خیال میں ایسے بدکار مردود ملعون سلمان رشدی و تسلیمہ نسرین کی بکواس کا ہمیں کو نوٹس ہی نہیں لینا چاہیئے۔ ایک پاگل کی پاگلانہ باتوں کے جواب میں کیا ہمیں خود بھی پاگل بن جانا چاہیئے؟ ہرگز نہیں تو پھر اس کا علاج یہ ہی ہے کہ تسلیمہ نسرین یا سلمان رشدی کی ہفوات کو گندگی کا ڈھیر یا پاگل خانہ کی سڑی گلی چیز سمجھ کر نظر انداز کر دینا چاہیئے اس سے نہ تو ایسے مردودوں کو انکی توقع و منشا و خواہش کے مطابق شہرت و دولت ملے گی۔ اور مخالفین اسلام کو مسلمانوں کی دل آزاری کرنے کا موقع ہاتھ نہیں آئے گا اس طرح انشاء اللہ پھر کبھی کوئی مردود و ملعون بننے کی ہمت و جرأت نہ کرے گا۔

مولانا ذوالفقار علی دیوبندی

حیات اور علمی کارنامے

قسط (۱)

محمد نجم خاں، ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

نسل اور خاندان:

قصبہ دیوبند یوپی کے ضلع سہارنپور میں واقع ہے۔ یہ شرفاء کا قصبہ ہے۔ زیادہ تر صدیقی فاروقی، اور عثمانی شیوخ آباد ہیں۔ زمانۂ قدیم میں یہ کافروں کی بستی تھی۔ جس کا ثبوت یہاں کے قدیم مناظر ہیں۔

قدیم تذکرہ "زبدۃ المقامات" میں اس کے پرانے متدرا دیوی کنڈ کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس میں لکھا ہے "دیبن موضع است از مضافات سہارنپور (۱) یہ قصبہ اکابر مشائخ کی قیام گاہ رہا ہے۔ چنانچہ سید احمد شہید رحمۃ اللہ نے یہاں کافی عرصہ تک قیام کیا ہے۔ اور ان کے رفقاء افکار بھی رہے ہیں، قابل ذکر ناموں میں مولانا سید مقبول احمد، مولوی شمس الدین، شیخ رجب علی شیخ منور علی، مولوی بشیر اللہ، مولوی زفیر الدین، شیخ عبدالرزاق، شیخ حفیظ اللہ ہیں۔ سید احمد شہیدؒ سے بہت سے لوگ مرید ہوئے جن کی اولاد میں سید محمد عابد شاہ رفیع الدین۔ مولانا ذوالفقار علی، مولانا مہتاب علی ہیں۔ مولانا ذوالفقار علی کا دیوبند کے عثمانی شیوخ سے نسبی تعلق ہے۔ یہ سلسلہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ کے والد شیخ فتح علی، آپ کے تین بھائی مولانا مہتاب علی، مولانا ذوالفقار علی، مولانا مسعود علی ہیں۔ آپ رحمہ اللہ کے بڑے بھائی مولانا مہتاب علی نے عربی کالج دہلی میں استاذ العلماء مولانا مملوک علی سے تعلیم حاصل کی۔

---

(۱) تاریخ دیوبند از زبدۃ المقامات ص: ۲۱

ن کا قیام زیادہ تر دیوبند میں رہا۔ ان کا شمار مدرسہ عربیہ دیوبند کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے تا دم حیات مدرسہ کی ترقی کے لئے جدوجہد کی۔ دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے طالب علم مولانا محمود حسن (شیخ الہند) نے ابتدائی فارسی اور عربی کی کتابیں آپ ہی سے پڑھیں۔

پیدائش اور تعلیم:

مولانا ذوالفقار علی ۱۲۴۷ھ میں بمقام دیوبند پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم دیوبند میں حاصل کی بعدازاں اس وقت کے مشہور عربی کالج دہلی میں داخلہ لیا۔ یہاں استاذ العلماء مولانا مملوک علی نانوتوی اور مفتی صدرالدین آزردہ سے استفادہ کیا۔ اور وہاں سے تعلیم مکمل کر کے بریلی کالج میں ملازم ہوگئے۔(۱)

مولانا عبدالحئی الحسنی نے ان سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی سوانحی و علمی تفصیلات یوں لکھی ہے۔

"الشیخ الفاضل ذوالفقار علی بن فتح علی الحنفی الدیوبندی احد العلماء المشہورین فی الفنون الادبیۃ ولد و نشاء بدیوبند و سافر للعلم الی دہلی، فقرا الکتب الدرسیۃ علی مولانا مملوک علی نانوتوی، والمفتی صدرالدین الدہلوی ولازمہما ملازمۃ طویلۃ، حتی برع و فاق اقرانہ فی المعانی والبیان والنحو و قرض الشعر، و ولی تفتیش المدارس الابتدائیۃ من قبل الحکومۃ، فاستمر علی ذالک سنین واحدۃ [illegible] وجدتہ حبراً ماہراً بالفنون الادبیۃ بین الکہولۃ والشیخوخۃ۔"(۲)

اولاد و احفاد:

آپ کے اولاد و احفاد میں آٹھ افراد ہیں۔ آپ کی دو صاحبزادیاں اور چار صاحبزادے ہیں۔ (۱) مولانا محمود حسن (شیخ الہند) (۲) مولانا حامد حسن (۳) حکیم محمد حسن (۴) مولانا احمد حسن۔

---

(۱) نزہۃ الخواطر ص: [illegible]

(۲) تاسیس دارالعلوم دیوبند ص۱۸

(۱) مولانا محمود حسن، اکابر دیوبند میں سے سیاسی مصروفیت کے ساتھ دارالعلوم سے ہمیشہ تعلق اور سرپرستی رہی۔

۲ - حامد حسن، مولانا ان کی ملازمت کا بیشتر وقت ضلع بجنور میں گزرا (م ۱۳۲۹)

۳ - مولانا حاجی حکیم محمد حسن نے ازابتدا تا انتہا دارالعلوم دیوبند ہی میں حصول علم کیا ۱۲۹۰ھ میں فراغت ہوئی۔ کچھ دنوں گنگوہ میں قیام کرکے اسباق حدیث مولانا رشید احمد گنگوہی سے پڑھا بعدہٗ دہلی چلے گئے جہاں علم حکمت وطب حکیم عبدالمجید خاں سے حاصل کی مولانا گنگوہی سے شرفِ بیعت بھی ملا، ۱۳۰۲ھ میں دارالعلوم دیوبند ہی میں بحیثیت استاذِ طب تقرر ہوا۔ ان کے ذمہ طلبہ کے علاج ومعالجہ کے علاوہ تفسیر، حدیث اور فقہ کی کتابیں پڑھانا تھا۔ ۱۳۲۲ھ روداد دارالعلوم میں دوبارہ آ، مولانا تحریر ہے کہ دارالعلوم کو ایک ایسے عالم کی ضرورت تھی جو علوم اسلامیہ کے علاوہ طب کی بھی تعلیم دے سکے۔ اور حسب ضرورت طلباء کی مداوت بھی کرسکے، اس ضرورت کے تحت ۱۳۰۲ھ میں ان کا تقرر ہوا۔ اور اس وقت سے برابر درسی کتب کی تدریس کے علاوہ طب کی تعلیم اور مطب کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں (۱)

مولانا شیخ الہند رحمہ اللہ ان کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ چنانچہ بقولِ مولانا اصغر حسین دیوبندیؒ " مالٹا سے خطوط میں سب سے پہلے خاندان کو ان کی تعظیم واطاعت کی تاکید فرماتے تھے۔ (۲)

دارالعلوم میں ۴۳ سال علمی وطبی خدمات انجام دیتے رہے اور ۱۵ ربیع الاول ۱۳۴۵ھ میں وفات پائی۔ اور قبرستان قاسمی میں آسودۂ خاک ہوئے۔

۴ - مولانا رحمۃ اللہ کے چھوٹے صاحبزادے حافظ محمد حسن صاحب کے متعلق مولانا اصغر حسین لکھتے ہیں "شیخ الہند رحمہ اللہ ان کو سب سے چھوٹا بھائی ہونے کی وجہ سے نہایت عزیز رکھتے تھے اور بزرگانہ و پدرانہ شفقت اور ضروری نصائح فرماتے تھے ان کو بھی شیخ الہندؒ سے غایت درجہ الفت وعقیدت تھی، آپ کے زمانۂ اسیری میں زار و قطار رویا کرتے تھے اکثر عمر میں مشغلہ ملازمت رہا۔

---

(۱) روداد دارالعلوم دیوبند ۱۳۲۳ھ

(۲) حیات شیخ الہند ص ۸۱

شیخ الہند مولانا محمود حسن

دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے شاگرد حضرت شیخ الہند کی پیدائش آپ کے والد مولانا ذوالفقار علی کے انسپکٹر آف اسکولس کی سرکاری ملازمت کے دوران دیوبند سے باہر بریلی میں قیام کے دوران بریلی میں ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۱ء میں ہوئی۔ اظہار مسرت کرتے ہوئے والد بزرگوار نے "محمود حسن" نام رکھا۔[1]

ابتدائی تعلیم اپنے مشہور عالم چچا مولانا مہتاب علی سے حاصل کی۔ قدوری و شرح تہذیب پڑھ رہے تھے کہ دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا آپ اس میں داخل ہوگئے ۱۲۸۶ھ میں نصاب دارالعلوم کی تکمیل کے بعد حضرت نانوتوی سے علم حدیث کی تحصیل کی۔ بعد ازاں فنون کی بعض اعلیٰ کتابیں والد ماجد سے پڑھیں۔ ۱۲۹۱ھ میں دارالعلوم میں مدرس چہارم کی حیثیت سے تقرر ہوا[2] اور تدریجاً ۱۳۰۸ھ میں منصب صدارت پر فائز ہوئے۔ ۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء میں ہمراہ حضرت نانوتوی شریف بہ حج ہوئے مکہ مکرمہ میں حاجی امداد اللہ سے شرف بیعت حاصل کیا۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے فیض تعلیم نے مولانا انور شاہ کشمیری، عبید اللہ سندھی، منصور انصاری، حسین احمد مدنی، کفایت اللہ دہلوی، شبیر احمد عثمانی، اصغر حسین دیوبندی، سید فخر الدین احمد، اعزاز علی، ابراہیم بلیاوی، مناظر احسن گیلانی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے مشاہیر و نامور علماء کی جماعت تیار کی۔

خصوصیات درس کی ایک جھلک مولانا عبید اللہ سندھی کے الفاظ میں "میں نے حضرت شیخ الہند سے حضرت مولانا قاسم کی حجۃ الاسلام پڑھی، کتاب پڑھتے ہوئے کبھی کبھی یوں محسوس کرتا کہ جیسے علم اور ایمان میرے دل پر اوپر سے نازل ہو رہا ہے"[3]

پہلی جنگ عظیم ابھی شروع نہیں ہوئی تھی مگر اس کے آثار سلطنت عثمانیہ کے خلاف

۱۔ مولانا رحمان علی، ترجمہ محمد ایوب قادری، تذکرہ علماء ہند ص ۴۶۶

۲۔ تذکرۃ الخلیل (مولانا عاشق الٰہی میرٹھی) ص ۱۱۰

۳۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۲۶۶

اعصابی جنگ کی شکل میں نمایاں تھے بالآخر ۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑ گئی۔ ۱۹۱۱ء میں ترکی حکومت کے خاتمہ کے لئے خفیہ سازش و معاہدہ ہوا۔ شیخ الہند نے اس زمانے میں مسلح انقلاب کے ذریعہ انگریزی اقتدار کے خاتمہ کے لئے وسیع منصوبہ تیار کیا۔ اگست ۱۹۱۶ء میں اسی سے متعلق واقعات ریشمی خطوط کا انکشاف ہو گیا۔ مجوزہ اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے حجاز کے سفر کے دوران والی مکہ نے بہ ایماء انگریز آپ کو ۱۳۳۵ھ میں گرفتار کر کے جدہ پھر مالٹا بھیجا گیا۔ سوا تین سال بعد ۱۹۲۰ء میں رہائی کے بعد دیوبند پہونچے۔ سیاسی سرگرمیوں کے دوران پیرانہ سالی میں خرابی صحت پر ڈاکٹر مختار انصاری کے یہاں دہلی لے جایا گیا لیکن وقتِ موعود آچکا تھا بالآخر ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کی صبح کو عازم ملک بقا ہو گئے۔

آپ کا علمی سرمایہ (۱) کتابیں (۲) فتاوی (۳) تقریریں (۴) شاعری پر منقسم ہے بقول مصنف تذکرہ شیخ الہند" کتابی سرمایہ میں (۱) ادلہ کاملہ (۲) ایضاح الادلہ (۳) احسن القری (۴) الجہد المقل (۵) افادات محمودیہ (۶) الابواب والتراجم (۷) کلیات شیخ الہند (۸) حاشیہ مختصر المعانی (۹) تصحیح ابی داؤد (۱۰) فتاوی (۱۱) ترجمہ قرآن شامل ہیں۔

ملازمت!

فراغت کے بعد سریلی کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ چند ہی سالوں میں حکومت کی طرف محکمۂ تعلیم میں انسپکٹر مدارس کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔

اور چونکہ آپ مغربی علوم سے واقف تھے اس لئے پنشن پانے کے بعد دیوبند میں آنریری مجسٹریٹ بنا دیئے گئے۔ آپ نے بہت ہی ذمہ داری کے ساتھ اپنا فرض پورا کیا۔

مگر آخری چند سالوں میں استعفیٰ دیکر گوشہ نشینی و سبکدوشی حاصل کر لی۔ دوران ملازمت علم و ادب سے رشتہ برقرار رہا۔ اور مختلف کتابیں بھی تحریر کیں (۲)

---

۱ تذکرہ شیخ الہند (مفتی عزیز الرحمن) ص ۷۲-۸۱۔

۲ تذکرہ شیخ الہند حیات اور کارنامے۔ ص ۱۶۔ (مفتی عزیز الرحمن) (اقبال حسن خاں)

شادی :

مولانا ذوالفقار علی دیوبندی کی شادی دیوبند کے ایک معزز شخص شیخ بو علی بخش صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی۔ آپ نہایت نیک اور شریف طبیعت کی حامل تھیں مولانا اصغر حسین کے لفظوں میں :

ان کی حسن نیت سے گھر میں ہر طرح خیر و برکت کا ظہور تھا مال و عزت کے علاوہ جیسی قابل رشک اولاد میں مولانا شیخ الہند رحمہ اللہ جیسی عطا فرمائی ایسی عظمت دنیا میں شاذ و نادر ہی نصیب ہوتی ہے۔ دو صاحبزادیاں نہایت عفیفہ دیندار صالحہ منتظمہ چار صالح عالم دین بزرگ یوی عظمت کے حامل صاحبزادے آپ کو خدائے پاک نے عطا کئے تھے۔ (۱)

اساتذہ :

آپ کے اساتذہ میں مولانا مملوک علی نانوتوی۔ اور مفتی صدر الدین آزردہ ہیں، ذیل میں مختصر تعارف۔

- مولانا مملوک بن حکیم، نانوتہ کے شیخ زادگان سے ہیں۔ دہلی میں مولانا رشید الدین کے شاگردوں میں سے تھے دہلی کالج میں عرصہ تک مدرس رہے۔۔۔ تحریر اقلیدس کا اردو میں ترجمہ کیا۔ مولوی عبدالحق کے مطابق! مولانا مملوک جید عالم تھے، طول و عرض میں انکے علم و فضل کا شہرہ تھا۔ مولوی کریم الدین کی "طبقات الشعراء کے حوالے سے!

"مدرس اول مدرسہ دہلی عالم بے بدل اور متقی بے مثل اور فاضل کامل ہیں۔ عہدہ میر مولوی بہ مشاہرہ سو روپے ماہواری مدرسے میں مقرر ہیں۔ حق یہ ہے کہ اس فاضل کی جیسی قدر ہونی چاہیئے تھی نہیں ہے کیونکہ ایسے عمدہ فاضل بہت کم ہوتے ہیں۔ اور واقع میں بنائے مدرسہ عربی ان کی ذات سے مستحکم ہے۔ فارسی، اردو اور عربی تینوں میں کمال رکھتے تھے بیشتر علوم میں مہارت تامہ تھی۔

۱۔ حیات شیخ الہند ص: ۸

اعصابی جنگ کی شکل میں [illegible] بالآخر ۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑ گئی ۱۹۱۱ء میں ترکی حکومت کے خاتمے کے لئے خفیہ سازش و معاہدہ ہوا۔ شیخ الہند نے اس زمانے میں مسلح انقلاب کے ذریعہ انگریزی اقتدار کے خاتمہ کے لئے وسیع منصوبہ تیار کیا۔ اگست ۱۹۱۶ء میں اسی سے متعلق واقعات ریشمی خطوط کا انکشاف ہوگیا۔ مجوزہ اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے حجاز کے سفر کے دوران والی مکہ نے بہ ایماء انگریز آپ کو ۱۳۳۵ھ میں گرفتار کر کے جدہ پھر مالٹا لے جایا گیا۔ سوا تین سال بعد ۱۹۲۰ء میں رہائی کے بعد دیوبند پہونچے۔ سیاسی سرگرمیوں کے دوران پیرانہ سالی میں خرابیٔ صحت پر ڈاکٹر مختار انصاری کے یہاں دہلی لے جایا گیا لیکن وقتِ موعود آچکا تھا بالآخر ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کی صبح کو عازم ملک بقا ہوگئے۔

آپ کا علمی سرمایہ (۱) کتابیں (۲) فتاویٰ (۳) تقریریں (۴) شاعری پر منقسم ہے بقول مصنف تذکرہ شیخ الہند "کتابی سرمایہ یہ ہیں (۱) ادلۂ کاملہ (۲) ایضاح الادلہ (۳) احسن القریٰ (۴) الجہد المقل (۵) افادات محمودیہ (۶) الابواب والتراجم (۷) کلیات شیخ الہند (۱) (۸) حاشیہ مختصر المعانی (۹) تصحیح ابی داؤد (۱۰) فتاویٰ (۱۱) ترجمۂ قرآن شامل ہیں۔

ملازمت!

فراغت کے بعد بریلی کالج میں پروفیسر ہوگئے۔ چند ہی سالوں میں حکومت کی طرف محکمۂ تعلیم میں انسپکٹر مدارس کی حیثیت سے تقرر ہوگیا۔

اور چونکہ آپ مغربی علوم سے واقف تھے اس لئے پنشن پانے کے بعد دیوبند میں آنریری مجسٹریٹ بنا دیئے گئے۔ آپ نے بہت ہی ذمہ داری کے ساتھ اپنا فرض پورا کیا۔

مگر آخری چند سالوں میں استعفیٰ دیکر گوشہ نشینی و سبکدوشی حاصل کرلی۔ دوران ملازمت علم وادب سے رشتہ برقرار رہا۔ اور مختلف کتابیں بھی تحریر کیں (۲)

۱۔ تذکرہ شیخ الہند (مفتی عزیزالرحمٰن) ص ۷۲-۸۱۔

۲۔ تذکرہ شیخ الہند حیات اور کارنامے۔ ص ۱۶۔ (مفتی عزیزالرحمٰن) (اقبال حسن خاں)

شادی :

مولانا ذوالفقار علی دیوبندی کی شادی دیوبند کے ایک معزز شخص شیخ بو علی بخش صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی ۔ آپ نہایت نیک اور شریف طبیعت کی حامل تھیں مولانا اصغر حسین کے لفظوں میں :

ان کی حسن نیت سے گھر میں ہر طرف خیر و برکت کا ظہور تھا مال و عزت کے علاوہ جیسی قابل رشک اولاد میں مولانا شیخ الہند رحمہ اللہ جیسی عطا فرمائی ۔ ایسی عظمت دنیا میں شاذ و نادر ہی نصیب ہوتی ہے ۔ دو صاحبزادیاں نہایت عفیفہ دیندار صالحہ منتظمہ چار صالح عالم دین نیز دینوی عظمت کے حامل صاحبزادے آپ کو خدائے پاک نے عطا کئے تھے ۔ (۱)

اساتذہ :

آپ کے اساتذہ میں مولانا مملوک علی نانوتوی ۔ اور مفتی صدر الدین آزردہ ہیں ، ذیل میں مختصر تعارف ۔

- مولانا مملوک بن حکیم ، نانوتہ کے شیخ زادگان سے ہیں ۔ دہلی میں مولانا رشید الدین کے شاگردوں میں سے تھے دہلی کالج میں عرصہ تک مدرس رہے ۔ ۔ ۔ تحریر اقلیدس کا اردو میں ترجمہ کیا ۔ مولوی عبدالحق کے مطابق ! مولانا مملوک جید عالم تھے ، طول و عرض میں انکے علم و فضل کا شہرہ تھا " مولانا کریم الدین کی " طبقات الشعراء کے حوالے سے !

" مدرس اول مدرسہ دہلی عالم بے بدل اور متقی بے مثل اور فاضل کامل ہیں ۔ عہدۂ میر مولوی بہ مشاہرہ سو روپے ماہواری مدرسے میں مقرر ہیں ۔ حق یہ ہے کہ اس فاضل کی جیسی قدر ہونی چاہیئے تھی نہیں ہوئی ہیں کیونکہ ایسے عمدہ فاضل بہت کم ہوتے ہیں ۔ اور واقع میں بنائے مدرسہ عربی ان کی ذات سے مستحکم ہے ۔ فارسی ، اردو اور عربی تینوں میں کمال رکھتے بیشتر علوم میں مہارت تامہ تھی ۔

---

۱ حیات شیخ الہند ص : ۸

مدرسہ کو ان کی ذات سے اتنا فیض ملا کہ شاید کسی زمانہ میں کسی استاذ سے ملا ہو۔ اگر ان کو معدن علم اور مخزن اسرار کہا جائے تو بجا ہے۔ کوئی کتاب کسی فن سے متعلق ہو حفظ پڑھا دیں گے، گویا کہ حفظ کر رکھی ہے۔ اسی لئے رات دن مدرسہ کے علاوہ ان کے گھر طلبہ پڑھتے تھے، اور وہ خلیق اس طرح ہیں کہ کسی سے انکار نہیں کر سکتے، سب کو پڑھاتے ہیں . . . ذکی ذہین تیز فہم محقق اور دقیقہ سنج ہیں۔ (۱)

مولانا عبیداللہ سندھی نے آپ کے بارے میں لکھا ہے!

"آپ فقہ، عربی اور دوسرے علوم و فنون میں اپنے زمانے کے علماء سے ممتاز دہلی کالج میں اپنے استاذ مولانا رشید الدین کے بعد مدرس کا منصب دیا گیا۔ آپ کے شاگردوں میں مولانا مظہر نانوتوی، شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی عبدالرحمٰن پانی پتی، احمد علی (محدث سہارنپوری)، رشید احمد گنگوہی، شیخ محمد معتقد ابن مملوک علی، سید احمد دہلوی بانی جامعہ علی گڑھ، نذیر احمد (مترجم قرآن) ذکاء اللہ اور دوسرے نامور اہل علم کو ان کی شاگردی کا شرف و فخر حاصل ہے۔" (۲)

سرسید احمد خاں نے ان کی علمی عظمت کو یوں بیان کیا ہے:

"علم معقول و منقول میں استعداد کامل اور کتب درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان کتابوں سے گنجینۂ عالم خالی ہو جائے تو ان کے لوح محفوظ سے پھر ان کی نقل ممکن ہے۔" (۳)

مولانا مملوک علی کا ۱۲۶۷ ہجری میں انتقال ہوا۔ اور آپ مقبرہ ولی اللہ دہلوی میں آسودہ خواب ہوئے۔

---

(۱) طبقات شعراء ہند، مولوی کریم الدین

(۲) مفتی صدر الدین آزردہ

(۳) بحوالہ مولانا عبیداللہ سندھی: شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ ص ۲۰۶۔

مفتی صدرالدین آزردہ

مفتی محمد صدرالدین خاں صدرالصدور دہلوی آزردہ آپ تمام علوم صرف، نحو، منطق، حکمت، ریاضیات، معانی، بیان، ادب و انشاء، فقہ حدیث اور تفسیر وغیرہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور درس بھی دیتے تھے آپ کے آباء و اجداد کاشمیر کے اہل بیت علم و صلاح سے تھے مگر آپ کی ولادت سنہ ۱۲۰۴ھ میں دہلی میں ہوئی۔ علوم نقلیہ و حدیث وغیرہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کے بھائیوں سے حاصل کی، اور ان سے سندیں لیں، اور فنون عقلیہ کو مولوی امام خیرآبادی والد مولوی فضل حق سے اخذ کیا۔ اس کے علاوہ شیخ محمد اسحاق دہلوی نے بھی آپ کو سند حدیث کی اجازت لکھ کر دی۔ آخری عمر میں ایک دو سال مرض فالج میں مبتلا ہو کر اکاشی سال کی عمر میں یوم پنجشنبہ ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ میں فوت ہوئے مولانا ذوالفقار علی دیوبندی کے علاوہ مولانا فقیر محمد جلبی، سر سید احمد خاں، نواب یوسف علی خاں والی رام پور، نواب صدیق حسن خاں، قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی آپ کے شاگردوں میں سے ہیں۔

کتابوں میں رسالہ منتہی المقال فی شرح حدیث لاتشد الرحال، در المنفود فی حکم امرأۃ المفقود وغیرہ ہیں۔

وفات

مولانا رحمۃ اللہ کی ۱۳۲۲ھ بمطابق ۱۹۰۴ء یوم دوشنبہ بچاسی سال کی عمر میں وفات پائی۔ مولانا قاسم نانوتوی کے پہلو میں مزار قاسمی میں آسودۂ خواب ہیں، آپ کے بائیں پہلو مولانا احسن نانوتوی کی قبر ہے۔ آپ کی وفات سے خانوادۂ علم و ادب و سررشتہ دارالعلوم دیوبند کو گہرا رنج و قلق ہوا۔

خاقانیٔ ہند مولانا فضل الرحمٰن عثمانی (والد ماجد مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی) نے وصال پر ملال سے متاثر ہو کر درج ذیل قطعۂ تاریخِ وفات تحریر فرمایا:[1]

---

[1] ربود دارالعلوم ۱۳۲۲ھ

صاحب جاہ و مراتب مولوی ذوالفقار　　آنکہ حسب فضل او رفتہ بعالم سو بسو

آنکہ زینب اہل علم و فخر اہل شہر بود　　نیک سیرت، نیک نیت، نیک خو

ذوالفقار گردش شد نامور فتح علی　　در نیام خاک داد از این جہاں پوشیدہ رو

لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار　　در مقام مدح گویا گفتہ شد در شان او

بود دارفع بالتی ہی احسن از وصاف ولے　　اگرے دم طائر دو، بود خلق نکو

زندگی کرد در دنیا چوں خلق حسن　　آفریں از خلق باد و رحمت از خالق برو

پانزدہ تاریخ بودہ از رجب وقت سحر　　سال ہجری یکہزار و سہ صد و ہم بست و دو (۱۳۲۲)

بود کاں کاں سرمایہ فخر جہاں باصد نشاط　　عازم جنت بشد زیں خاکداں تیرہ رو

سال نقل او خراشیدہ زغم روئے　　عاش محمود احمید امات مشہورا بگو [1]

تصانیف

(۱) عطر الوردۃ شرح قصیدہ بردہ۔
(۲) الارشاد شرح قصیدہ بانت سعاد
(۳) تسہیل الدراسۃ شرح دیوان الحماسۃ
(۴) التعلیقات علی السبع المعلقات
(۵) تسہیل البیان شرح دیوان المتنبی
(۶) تذکرۃ البلاغۃ فی المعانی والبیان
(۷) الہدیۃ السنیۃ فی ذکر المدرسۃ الاسلامیۃ الدیوبندیہ
(۸) تسہیل الحساب فی اصول ومبادی الریاضی

---

[1] مشاہیر دار العلوم دیوبند ص ۱۳

تاریخ شاہجہاں - ایک مطالعہ

عبدالرؤف خاں ایم۔اے تاریخ - ادونی کلاں (راجستھان)

ترقی اردو بورڈ نئی دہلی نے انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ نئی دہلی کے اشتراک سے ڈاکٹر بنارسی پرساد سکسینہ کی انگریزی زبان میں لکھی گئی تصنیف "ہسٹری آف شاہ جہاں آف دہلی" کا اردو ترجمہ ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب سے کرایا اور ۸۰۔ ۱۹ء میں شائع کیا جس کا حال ہی میں مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوا کہ مترجم موصوف نے فنِ ترجمے کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے نہایت رواداری و بے دلی سے ترجمہ سپردِ قلم فرمایا ہے جسے نہ تو صحیح معنوں میں ترجمہ ہی کہہ سکتے ہیں اور نہ ترجمانی ہی کیوں کہ بہت سے انگریزی فقرات کا ترجمہ یا تو ناقص ہے یا معکوس و مقلوب مستزاد یہ کہ بیسیوں فقروں کا ترجمہ کیا ہی نہیں گیا، یا بیشتر طویل جملوں کے ترجمے کا حق صرف علامتی طور پر نہایت مختصر طور پر ادا کیا گیا ہے جسے ایجاز بیانی کا نمونہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ رہی سہی کور کسر کا تب نے پوری کر دی اس طرح سکسینہ صاحب کی پوری تصنیف کا اردو ترجمہ مضحکہ خیز بن کر رہ گیا۔ ہم مترجم موصوف کا یہ فرمانا کہ "طویل جملوں کو اپنے طور پر بالاختصار انداز میں پیش کرنے میں پس و پیش آجاتا ہے اس صورت میں کبھی کبھی مجھے ایک جملہ کو اردو میں حسن و اثر کے ساتھ ترجمہ کرنے میں گھنٹوں صرف کرنا پڑا ہے۔" (چند باتیں ص ۵)

لیکن جب ترجمہ کا اصل انگریزی متن سے مقابلہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مترجم نے گھنٹوں تو کجا چند ثانیے بھی اس کارِ خیر کو حسن و خوبی انجام دینے میں صرف نہیں کیے جیسا درج ذیل صرف چند مثالوں سے واضح ہو جائے گا۔ ہم یہاں پہلے انگریزی متن اور پھر موصوف کا ترجمہ پیش کریں گے:

ڈاکٹر صاحب نے تمہید (Preface) کے آخر میں معاونین کا شکریہ ادا کرنے کے لئے

یہ عبارت لکھی ہے:

"In the end, let me acknowledge with thanks The assistance I received from my pupils Messrs Bhawani Prasad and Shambhu saran lal, Hafiz Ahmed Ali Khan, the librarian of the state library Rampur, Miss Murray Browne, The Deputy-Librarian of the school of oriental studies, London, and Mr. Sarju Prasad, the Deputy-librarian of Allahabad university library".

(History of Shah Jahan of Dehli Ed. 1958)

اب مذکورۃ الصدر طویل فقرہ کا "حسن و اثر" کے ساتھ کیا ہوا اردو ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:

" اپنے شاگردوں بھوانی پرشاد (؟ پرساد) سمھو شرن (؟ سرن) لال اور حافظ احمد علی خاں کا شکریہ ادا کروں، نیز اسٹیٹ لائبریری رامپور کے لائبریرین مرے براؤن۔ ڈپٹی لائبریرین اورینٹل اسٹڈیز لندن اور ڈپٹی لائبریرین الہ آباد یونیورسٹی لائبریری کا شکرگزار ہوں"

(دیباچہ ص ۲)

یہ ترجمہ کئی اعتبار سے گمراہ کن ہے کیونکہ اس میں اسٹیٹ لائبریری رام پور کا کتابدار حافظ احمد علی خاں کے بجائے (مس) مرے براؤن کو بتلایا ہے جو اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کی ڈپٹی لائبریرین ہیں اور وہ بھی صیغۂ تذکیر میں علاوہ ازیں مسٹر سرجو پرساد کو حذف کر گئے ہیں اور علاماتِ سکتہ (commas) بے محل لگائے ہیں جن کے سبب اس کا مفہوم بھی ضبط ہو گیا ہے جبکہ مذکورہ انگریزی عبارت کا سیدھا سا ترجمہ ہو سکتا تھا۔

" آخر میں اس تعاون کا شکریہ ادا کروں (یا ادا کرنا واجب ہے) جو مجھے اپنے تلامذہ بھوانی پرساد اور سمھو سرن لال سے حاصل ہوا (علاوہ ازیں) اسٹیٹ لائبریری رامپور کے کتابدار حافظ احمد علی خاں، اورینٹل اسٹڈیز اسکول لندن کی ڈپٹی لائبریرین مس مرے براؤن نیز الہ آباد یونیورسٹی لائبریری کے ڈپٹی لائبریرین مسٹر سرجو پرساد کا شکرگذار ہوں۔

مغول اسلاف ہندوستانیوں کے تئیں جس قسم کے خیالات رکھتے تھے ان کے بارے میں سکینہ صاحب نے بطور احتجاج اور تردیداً یہ فقرہ لکھا ہے:

"Thees common epithet of barbarian to Indians is a clear proof of their narraw out look." P. XX

اس فقرہ کا ترجمہ یہ کیا ہے:

"ہندوستانیوں کے لئے وحشی کا عام لقب ان کی زبان زد تھا، یہی ایک بات ان کی زبان زد تھی، یہی ایک بات ان کی زبان زد تھی، یہی ایک بات ان کی تنگ خیالی کی واضح دلیل ہے۔" (ص ۳۰)

شہزادہ خرم کو شہنشاہ جہانگیر نے مختلف اعزازات سے سرفراز کرنے کے علاوہ مہر اُزک بھی اس کے سپرد کردی۔ مہر ازک، مدور یا بیضاوی شکل کی ایک چھوٹی مہر ہوتی تھی جس پر بادشاہ کا نام کندہ ہوتا تھا جو خاص فرامین پر لگائی جاتی تھی یہی وجہ تھی کہ اسے انتہائی معتمد شخصیت کے حوالہ کیا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر سکینہ صاحب نے لکھا ہے کہ:

"To crown it all the 'Muhruzak' was placed in his charge" (P. 9)

ترجمہ: "ان اعزاز (کذا) کو اور معزز بنانے کے لئے ایک مہر ازک کے سپر (۹ سپرد) کی گوی۔" (ص ۴۵)

مترجم موصوف نے یہاں ازک کو شخصیت ظاہر کیا ہے۔ اور اعزاز کو جمع کے صیغہ میں استعمال کیا ہے۔ شہزادہ خرم اپنی سیاسی پیش بینی کے طور پر شاہنواز خاں ابن عبدالرحیم خان خاناں کو اپنے ذاتی مصاحبوں میں شریک کرنا چاہتا تھا۔ اس سلسلہ میں ہسٹری آف شاہ جہاں آف دہلی میں یہ فقرہ ہے:-

"... and Khurram wanted To include him in The circle of his personal adherents, whose number he was now skilfully increasing" P. 14

ترجمہ: "خرم چاہتا تھا کہ اس کو اپنے ذاتی مصاحبوں کی تعداد سمجھ بوجھ کر وہ بڑھا رہا تھا" (ص ۔ ۴۹) جبکہ ترجمہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ: اور خرم اسے اپنے ذاتی مصاحبوں کے زمرہ میں شریک کرنا چاہتا تھا جن کی تعداد میں وہ اب ہوشیاری کے ساتھ اضافہ کر رہا تھا۔

دکن میں ملک عنبر کا مقابلہ کرتی ہوئی مغل افواج کو بوجوہ پسپا ہونا پڑا۔ اس بارے میں انگریزی متن کا فقرہ یہ ہے: ۔

"This encouraged the Daccanis, and they pursued the Mughals to Balapur, which they sacked thoroughly."

اس فقرہ کا مضحکہ خیز ترجمہ دیکھئے:

"اس پسپائی نے دکنی فوجوں کو ہمت دلائی انہوں نے دشمن کو آگے بڑھنے سے روکتی رہی" (ص: ۵۸)

"فارسی ضرب المثل من چہ می سرایم و طنبورہ من چہ سراید شاید ایسے ہی موقع کے لئے کہی گئی ہوگی یعنی کہ میں کیا گا رہا ہوں اور میرا طنبورہ کیا گا رہا ہے۔ جبکہ فقرہ کا مفہوم یوں بھی ادا کیا جا سکتا تھا کہ (اس پسپائی سے) دکنی افواج کی حوصلہ افزائی ہوئی اور انہوں نے بالاپور تک مغلوں کا تعاقب کیا جسے وہ مکمل طور پر تاراج کر چکے تھے۔

خانخاناں دکن کی مہم سر کرنے میں ناکام رہا تو اس نے برائے کمک کئی عرضداشت دربار میں بھیجیں، اس ذیل میں متنی فقرہ یہ ہے:

"... and he sent appeal after appeal to the court for help." P. 26.

اس سادہ فقرہ کا ترجمہ دیکھئے: ۔ "وہ بادشاہ کو درخواست پر مدد کے لئے بھیج رہا تھا"

[illegible] کی درخواست [illegible]

[illegible] مدد کے [illegible] بادشاہ [illegible]

نیز [illegible] متن میں ایک فقرہ ہے: ۔

she tolerated him because there was no other leader competent to deal with Shah Jahan." P.52

متذکرہ فقرہ کا ترجمہ جس ایجاز بیانی کے ساتھ کیا گیا ہے وہ یہ ہے: "اول الذکر اس سے بہتر کوئی اور شخص نہ تھا" (ص ۷۶)

شاہجہانی عہد کی بغاوتوں کے اسباب کے بارے میں ایک طویل فقرہ ہے:

"In the following instances it will be noticed that either the grant of 'Jagirs' in their own native land, or undue favouritism, or a combination of both, was responsible for the outbreaks." P.66 -

ترجمہ: "حسب ذیل مثالوں میں یہ نظر آئے گا کہ جاگیریں خواہ کسی کو خواہ اس کے وطن میں دی گئیں یا غیر مناسب مراعات یا دونوں کے امتزاج کے مرکب کا نمونہ تھیں سلطنت کی شکست و ریخت کی ذمہ دار ثابت ہوئیں۔" (ص ۸۶)

بغاوتوں کے سلسلہ میں ہی ڈاکٹر سکسینہ صاحب کا ایک طویل فقرہ ہے:

"The three important rebellions which occurred in the reign of Shah Jahan furnish an indication of the revival of a tendency so commonly to be met with in the history of Muslim rule in India." P.66

ترجمہ: "تین اہم بغاوتیں جو شاہجہاں کے عہد حکومت میں ہوئیں" (ص ۸۶) مترجم موصوف نے یہاں جس اختصار اور ایجاز سے کام لیا ہے اسے ان کے قلم کی اعجاز بیانی کا کرشمہ کہا جائے گا۔ اسے کوزہ میں دریا کو بند کرنا بھی کہہ سکتے ہیں:-

ضبط گریہ نے تماشا طرفہ تر دکھلا دیا
چشم کے کوزے میں دریا بند کر دکھلا دیا

ترجمہ: "خرم چاہتا تھا کہ اس کو اپنے ذاتی مصاحبوں کی تعداد سمجھ بوجھ کر وہ بڑھا رہا تھا" (ص۔ ۴۹) جبکہ ترجمہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ: اور خرم اسے اپنے ذاتی مصاحبوں کے زمرہ میں شریک کرنا چاہتا تھا جن کی تعداد میں وہ اب ہوشیاری کے ساتھ اضافہ کر رہا تھا

دکن میں ملک عنبر کا مقابلہ کرتی ہوئی مغل افواج کو بوجوہ پسپا ہونا پڑا۔ اس بارے میں انگریزی متن کا فقرہ یہ ہے :۔

"This encouraged the Daccanies, and they pursued the Mughals to Balapur, which they sacked thoroughly."

اس فقرہ کا مضحکہ خیز ترجمہ دیکھئے :

"اس پسپائی نے دکنی فوجوں کو ہمت دلائی انہوں نے دشمن کو آگے بڑھنے سے روکتی رہی۔" (ص: ۵۸)

"فارسی ضرب المثل من چہ می سرایم و طنبورہ من چہ سراید شاید ایسے ہی موقع کے لئے کہی گئی ہوگی یعنی کہ میں کیا گا رہا ہوں اور میرا طنبورہ کیا گا رہا ہے۔ جبکہ فقرہ کا مفہوم یوں بھی ادا کیا جا سکتا تھا کہ (اس پسپائی سے) دکنی افواج کی حوصلہ افزائی ہوئی اور انہوں نے بالا پور تک مغلوں کا تعاقب کیا جسے وہ مکمل طور پر تاراج کر چکے تھے۔

خانخاناں دکن کی مہم سر کرنے میں ناکام رہا تو اس نے برائے کمک کئی عرضداشت دربار میں بھیجیں، اس ذیل میں متنی فقرہ یہ ہے :

"... and he sent appeal after appeal to the court for help." P. 26.

اس سادہ فقرہ کا ترجمہ دیکھئے :۔ "وہ بادشاہ کو درخواست پر مدد کے لئے بھیج رہا تھا" (ص ۵۸)۔ اس ترجمہ سے متبادر ہوتا ہے کہ کمک کے لئے درخواست کسی اور کا نہ مارنے کی جسکا پرسا [illegible] مدد کے لئے خانِ خاناں بادشاہ کو بھیج رہا ہے۔

[illegible] فقرہ ہے :۔

"Th[illegible]

she tolerated him because there was no other leader competent to deal with Shah Jahan" P. 52

متذکرہ فقرہ کا ترجمہ جس ایجاز بیانی کے ساتھ کیا گیا ہے وہ یہ ہے:۔ "اول الذکر اس سے بہتر کوئی اور شخص نہ تھا"۔ (ص ۷۶)

شاہجہانی عہد کی بغاوتوں کے اسباب کے بارے میں ایک طویل فقرہ ہے:

"In the following instances it will be noticed that either the grant of jagirs in their own native lands, or undue favouritism, or a combination of both, was responsible for the outbreaks." P. 66 -

ترجمہ:۔ "حسب ذیل مثالوں میں یہ نظر آئے گا کہ جاگیریں خواہ کسی کو خواہ اس کے وطن میں دی گئیں یا غیر مناسب مراعات یا دونوں کے امتزاج کے مرکب کا نمونہ تھیں سلطنت کی شکست و ریخت کی ذمہ دار ثابت ہوئیں"۔ (ص ۸۶)

بغاوتوں کے سلسلہ میں ہی ڈاکٹر سکسینہ صاحب کا ایک طویل فقرہ ہے:

"The three important rebellions which occured in the reign of Shah Jahan furnish an indication of the revival of a tendency so commonly to be met with in the history of Muslim rule in India". P. 66

ترجمہ:۔ "تین اہم بغاوتیں جو شاہجہاں کے عہد حکومت میں ہوئیں"۔ (ص ۸۶) مترجم موصوف نے یہاں جس اختصار اور ایجاز سے کام لیا ہے اسے ان کے قلم کی اعجاز بیانی کا کرشمہ ہی کہا جائے گا۔ اسے کوزہ میں دریا کو بند کرنا بھی کہہ سکتے ہیں:۔

ضبط گریہ نے تماشا طرفہ تر دکھلا دیا
چشم کے کوزے میں دریا بند کر دکھلا دیا

ترجمہ: "خرم چاہتا تھا کہ اس کو اپنے ذاتی مصاحبوں کی تعداد سمجھ بوجھ کر وہ بڑھا رہا تھا" (ص ۔ ۴۹) جبکہ ترجمہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ: اور خرم اسے اپنے ذاتی مصاحبوں کے زمرہ میں شریک کرنا چاہتا تھا جن کی تعداد میں وہ اب ہوشیاری کے ساتھ اضافہ کر رہا تھا

دکن میں ملک عنبر کا مقابلہ کرتی ہوئی مغل افواج کو بوجوہ پسپا ہونا پڑا۔ اس بارے میں انگریزی متن کا فقرہ یہ ہے :۔

"This encouraged the Deccanis, and they pursued the Mughals to Balapur, which they sacked thoroughly."

اس فقرہ کا مضحکہ خیز ترجمہ دیکھئے :

"اس پسپائی نے دکنی فوجوں کو ہمت دلائی انہوں نے دشمن کو آگے بڑھنے سے روکتی رہی۔" (ص : ۵۸)

"فارسی ضرب المثل من چہ می سرایم و طنبورہ من چہ سراید شاید ایسے ہی موقع کے لئے کہی گئی ہوگی یعنی کہ میں کیا گا رہا ہوں اور میرا طنبورہ کیا گا رہا ہے۔ جبکہ فقرہ کا مفہوم یوں بھی ادا کیا جا سکتا تھا کہ، (اس پسپائی سے) دکنی افواج کی حوصلا فزائی ہوئی اور انہوں نے بالا پور تک مغلوں کا تعاقب کیا جسے وہ مکمل طور پر تاراج کر چکے تھے۔

خانخاناں دکن کی مہم سر کرنے میں ناکام رہا تو اس نے برائے کمک کئی عرضداشت دربار میں بھیجیں، اس ذیل میں متنی فقرہ یہ ہے !

"... and he sent appeal after appeal to the court for help." P. 26.

اس سادہ فقرہ کا ترجمہ دیکھئے :۔ "وہ بادشاہ کو درخواست پر مدد کے لئے بھیج رہا تھا۔" (ص ۵۸)۔ اس ترجمہ سے متبادر ہوتا ہے کہ کمک کے لئے درخواست کسی اور کا ندارنے کی جس کی مدد کے لئے خانِ خاناں بادشاہ کو بھیج رہا ہے۔

نورجہاں، شاہجہاں اور مہابت خاں کے ضمن میں ایک فقرہ ہے :۔

"The former had been her life-long enemy and

she tolerated him because there was no other leader competent to deal with Shah Jahan" P.52

متذکرہ فقرہ کا ترجمہ جس ایجاز بیانی کے ساتھ کیا گیا ہے وہ یہ ہے :۔" اول الذکر اس سے بہتر کوئی اور شخص نہ تھا۔" (ص ۷۶)

شاہجہانی عہد کی بغاوتوں کے اسباب کے بارے میں ایک طویل فقرہ ہے :

" In the following instances it will be noticed that either the grant of 'jagirs' in their own native lands or undue favouritism, or a combination of both, was responsible for the outbreaks" P.66 -

ترجمہ :" حسب ذیل مثالوں میں یہ نظر آئے گا کہ جاگیریں خواہ کسی کو خواہ اس کے وطن میں دی گئیں یا غیر مناسب مراعات یا دونوں کے امتزاج کے مرکب کا نمونہ تھیں سلطنت کی شکست و ریخت کی ذمہ دار ثابت ہوئیں۔" (ص ۸۶)

بغاوتوں کے سلسلہ میں ہی ڈاکٹر سکسینہ صاحب کا ایک طویل فقرہ ہے :

" The three important rebellions which occured in the reign of Shah Jahan furnish an indication of the revival of a tendency so commonly to be met with in the history of Muslim rule in India" P.66

ترجمہ :" تین اہم بغاوتیں جو شاہجہاں کے عہد حکومت میں ہوئیں" (ص ۸۶) مترجم موصوف نے یہاں جس اختصار اور ایجاز سے کام لیا ہے اسے ان کے قلم کی اعجاز بیانی کا کرشمہ ہی کہا جائے گا۔ اسے کوزہ میں دریا کو بند کرنا بھی کہہ سکتے ہیں :۔

ضبط گریہ نے تماشا طرفہ تر دکھلا دیا
چشم کے کوزے میں دریا بند کر دکھلا دیا

پرتگالیوں کے ادائگی تاوان کے ذیل میں ہسٹری آف شاہجہاں آف دہلی میں یہ جملہ ہے:

"After some descussion The Purtugues paid 10,000 'Tank's The first instalment of the indemnity. and promised to pay soon the other instalment of 200,000 'tankas' " P. 111 -

ترجمہ: "کچھ بات چیت کے بعد پرتگالیوں نے دس ہزار ٹن کا تاوان جنگ کی پہلی قسط ادا کی اور وعدہ کیا کہ دولاکھ ٹن کی دوسری قسط جلد ادا کر دیں گے۔" (ص ۱۱۶)

اس فقرہ میں محترم مترجم نے "تنکہ" نام کے سکّہ کو، جو اڑتالیس یا چونسٹھ "جیتل" کا ہوتا تھا، وزن کے پیمانے "ٹن" (جو ۲۸ من کے مساوی ہوتا ہے) میں تبدیل کرتے ہوئے جدت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔

مترجم موصوف عنوان "چند باتیں" کے تحت فرماتے ہیں "کہ اردو کی لفظیات کا ذخیرہ بھی اتنا وافر نہیں جتنا انگریزی کا۔ (اس لیے) ہر موقع کے تاثرات کی تصویر کشی کے لئے الفاظ کی کمی نے کبھی کبھی حسن بیان کو ابھرنے نہیں دیا۔" (ص ۵،۶)

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ اردو جس کا خمیر ہندوستان کی تمام زبانوں کے علاوہ فارسی اور عربی جیسی الہامی و عالمگیر زبان کے خونِ جگر سے گوندھا گیا ہو، مترجم موصوف اس کے ذخیرۂ الفاظ (Vocabulary) کی کم مائگی کا شکوہ فرمارہے ہیں، جس نے ان کے حسن بیان کو ابھرنے نہیں دیا ع

اسی غریبی نے میرے فن کو ابھرنے نہ دیا

بقول اُن کے اگر اردو غریب کا دامن اتنا تنگ نہ ہوتا تو معلوم نہیں وہ ترجمہ میں کیا گل کھلاتے؟ ترجمہ کا یہ مضحکہ خیز سلسلہ کتاب کے آخری صفحہ تک چلا گیا ہے جس کے احاطہ کے لئے علیحدہ کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ لیکن ہم متذکرہ صدر مثالوں پر اکتفا کرتے ہوئے اب چند ایسے فقرات پیش کرتے ہیں جن کی حسن آفرینی قابل توجہ ہے۔

(۱) "جہانگیر نے خرم کو اجین کا جاگیر اور حصار فیروزہ (حصار فیروزہ) کی سرکار عطا کی" ص ۴۵

(۲) "لیکن اُس وقت بیدار ہوا پانی سر سے اونچا ہو گیا تھا" ص ۶۳ (۳) "اس علاقہ میں مرہٹہ

کی مستقبل حکومت کے بیج بوئے جارہے تھے۔ ص ۱۴۰ (۴) لیکن ان کا بھائی نظر محمد (فنذر محمد) چیقراپا منگوں کا آدمی تھا۔ ص ۱۶۹ (۵) وہ عبداللہ خاں سے ملنے آیا صرف کمر پر ایک کپڑا باندھے تھا اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑے تھا۔ ص ۱۲۱۔ ترجمہ میں "حسن داثر" میں ڈوبے ہوئے اس قسم کے فقرات کا سلسلہ بھی لامتناہی ہے مگر تطویل کے سبب یہاں صرف فقروں پر اکتفا کیا گیا ہے۔

اب بطور نمونہ چند الفاظ کے املا اور اغلاط کتابت کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا جنہیں ہم نے خطوط وحدانیہ میں درست املا کے ساتھ لکھ دیا ہے۔

تعلیم تور ص ۱۳ (تسلیم تور) طومان تنغ ص ۵۱ (تومان توغ یا تمن طوغ) تمرعہ ص ۵۱ (قمرغہ) اولاد کہ ص ۵۴ (اولادِ کبیر تاکہ شہنشاہ اکبر کی اولاد کی طرف قاری کا ذہن منتقل نہ ہو)۔ نورتی ص ۵۶ (مشاورتی) سراول ص ۶۷ (سزاول بمعنی داروغہ یا سپرنٹنڈنٹ المحصل) دل آزادی ص ۱۶ (دل آزاری) دربدی ص ۸۷ (دربدری غالباً دربدر کے حاصل مصدر کے طور پر استعمال کیا ہے) دعوادار ص ۹۹ (دعویدار) کھٹک ص ۱۲۶ (خٹلک یا ختلک) کمانوں کا راجا ص ۱۲۶ (کماؤں...) یوسف قمری ص ۱۲۹ (... زئی) نوشیرہ ص ۱۲۹ (نوشہرہ) جنگلی جہاز (جنگی جہاز) حکمت عمل ص ۱۳۲ (حکمت عملی) تحفہ ص ۱۳۷ (تحفے) اطاعت ص ۱۳۷ (اطاعت) آزدہ ص ۱۳۷ (آزردہ) سارا املاک ص ۱۴۰ (ساری ...) پیانی گھاٹ ص ۱۴۰، ۱۴۱ (پائین گھاٹ) ابی سینائی ص ۱۴۶ (جبشی یا ابی سینیائی) دکھنی جتھاؤں ص ۱۴۶ (دکنی جتھوں) گمنانی ص ۱۶۸ (گمنامی) رحجان ص ۱۷۰، اور دیگر صفحات (رجحان) کھکھروں ص ۱۷۰ (گھکھڑوں) اجدیوں ص ۱۷۸ (احدیوں) فوجوں افسروں ص ۲۰۴ (فوجی افسروں) قطاص ص ۲۰۲ (قطار) بست کی سرنگ ص ۲۰۶ (بست کی سڑک) نمازبوسی ص ۲۱۶ (زمین بوسی) نیطل ص ۲۰۴ (تیطل) وضع محل ص ۲۶۳ (وضع حمل) گوالیلر (گوالیار) رانتھور ص ۲۶۳ (رنتھبور) بازنطان کے حکمراں ص ۲۵۴ (بازنطینی حکمران) فرمابرداری ص ۲۰۸ (فرماں برداری) ولی عبد ص ۲۶۷ (ولیعہد) چکرورتین (چکرورتی) بیربار ص ۲۳۷ (بیربر) دیوانِ تان یا ٹان کئی صفحات پر (دیوانِ تن) مصطوفی ص ۲۳۸ (مستوفی) مہرازاک ص ۲۳۷، ۲۹۸ (مہرازک یا یزک) چار لاکا دین مہر مقرر ہوا ص ۲۶۶ (چار لاکھ روپیہ بطور کابین مقرر ہوا) ایک سلطان السلاطین بھی ہے ص ۱۸ (ایک عالم الغیب طاقت احکم الحاکمین بھی ہے) ——— (باقی آئندہ)

عہد مغلیہ یورپی سیاحوں کی نظر میں

(سنہ ۱۶۱۶ء - سنہ ۱۶۱۹ء)

قسط ۱۲

پروفیسر محمد عمر، شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ایڈورڈ ٹیری: سوانح عمری

ٹیری کی ولادت سنہ ۱۵۹۰ء میں ہوئی تھی اور اسکی تعلیم و تربیت روچسٹر اسکول اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ سنہ ۱۶۱۶ء میں اس نے اس فوجی بحری بیڑے کے پادری کا عہدہ قبول کر لیا جس کی قیادت کیپٹن بنجامن جوسف کر رہا تھا۔

سر تھومس رو کے خاندانی پادری کا انتقال ہو گیا تو اس نے سورت میں مقیم اعلیٰ عہدہ داروں سے کسی دوسرے پادری کے بھیجنے کی درخواست کی۔ ٹیری نے اس عہدہ کو قبول کر لیا در فروری سنہ ۱۶۱۷ء میں وہ اجین میں رو کے پاس پہونچ گیا۔ وہ اس سفیر کے ہمراہ منڈو گیا۔ ور وہاں سے احمد آباد گیا۔ ٹیری کو صرف گجرات اور مالوہ کے صوبوں کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔

سنہ ۱۶۱۸ء میں وہ ہندوستان سے واپسی کے لئے روانہ ہو گیا اور ۷ ارفروری سنہ ۱۶۱۹ء میں وہ انگلستان پہونچا۔ لندن کے قریب اپنے وطن میں اس نے گریٹ گرین فورڈ میں ریکٹر کا عہدہ سنبھال لیا اور سنہ ۱۶۲۹ء میں اپنی وفات تک وہ اسی عہدہ پر برقرار رہا۔

سنہ ۱۶۲۲ء میں ٹیری نے ہندوستان کے بارے میں اپنا روزنامچہ پرنس آف ویلس (چارلس) کی خدمت میں پیش کیا۔ بعد میں اضافے کے ساتھ اس نے اس روزنامچہ کو دوسری بار شائع کیا۔

پرچاز نے PILGRIMAGE نامی اپنی تصنیف میں اس کو شامل کر لیا ہے اور فوسٹر نے EARLY TRAVELS INDIA نامی اپنی کتاب میں بھی اس روزنامچہ کو

ں کر لیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۲۱ء میں اکسفورڈ پریس سے شائع ہوئی تھی۔

شہروں، سرائیوں اور تالابوں وغیرہ کا بیان

ملتان

ملتان کی صنعتوں کا ذکر کرتے ہوئے ٹیری نے لکھا ہے کہ وہاں اعلیٰ قسم کے تیر و کمان
ئے جاتے تھے۔ کمانیں "سینگوں کے بنائے جاتے تھے اور سریش لگا کر انہیں آپس میں اچھی
، جوڑ دیا جاتا تھا" چھوٹے سرکنڈوں کے ٹکڑوں اور بیتوں سے تیر بنائے جاتے تھے۔ تیر و
ن دونوں پر نقش و نگار بنائے جاتے تھے۔ ان پر پالش کی جاتی تھی۔ وے بہت اچھے
، صاف ستھرے دکھائی دیتے تھے۔ ہندوستان میں کسی دوسرے اور مقام پر اتنے خوبصورت
و کمان نہیں بنائے جاتے تھے۔

منڈو

ٹیری نے لکھا ہے کہ "منڈو شہر بہت اونچے ایک پہاڑ پر واقع ہے جس کی چوٹی وسیع
ہموار اور مسطح ہے۔ سوائے ایک سمت کے، اس کے آس پاس واقع تمام حصوں سے چڑھائی بہت
نچی اور ڈھلوان سیدھا ہے۔ جس پر منڈو واقع ہے اس پہاڑ کے چاروں طرف اچھے
رخت لگے ہوئے تھے۔ یہ درخت آگے پیچھے ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر لگے ہوئے تھے
، انھیں دیکھنے میں بڑی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ چاہے انھیں نیچے یا پہاڑی کی چوٹی سے دیکھا
ائے۔"

"بڑے اور دور تک پھیلے ان جنگلات میں شیر، ببر شیر اور دوسرے شکاری درندے
، بہت سے جنگلی ہاتھی رہتے ہیں۔"

"حالانکہ ہم لوگ وہاں گئے تھے لیکن منڈو، جو اس وقت مغل حکمراں کا صدر مقام تھا
ہت زیادہ آباد نہ تھا۔ بنے ہوئے مکانات کی بہ نسبت وہاں دور دور تک کھنڈرات
ہی باقی رہ گئے تھیں، ان میں سے بیشتر ویران مسجدیں تھیں۔"

"ان ویران مسجدوں میں سے ایک مسجد ایسی تھی کہ اس کے قریب ایک مقبرہ واقع تھا۔ ان دونوں کی چھتیں محرابی تھیں۔

میرے آقا روآ اور اس کے ساتھیوں کے ٹھہرنے کے لئے وہ عمدہ جگہ تھی۔ ہم لوگ اپنے ساتھ اپنے بستر ے، اس سے متعلق دوسری چیزیں، باورچی خانہ کی ضروری چیزیں اور انکے علاوہ پہننے کی دوسری چیزیں بھی لے گئے تھے۔"

تالابوں اور سرائیوں کے بارے میں بعض عام تبصرے؛

اینٹوں اور پتھروں سے سرائیں بہت مضبوط بنی ہوئی تھیں۔ بلا کرایہ ان میں مسافروں کو رہنے کے لئے کمرے مل سکتے تھے۔ اپنی ضرورت کی دوسری چیزیں انھیں بذاتِ خود فراہم یا خریدنی پڑتی تھیں۔

کنوئیں گول کھودے جاتے تھے۔ وہ "بڑے اور وسیع ہوتے تھے۔ سخت پتھروں کو کاٹ کر کنوئیں بنائے جاتے تھے اور اندر کی طرف عمدہ پلاسٹر کیا جاتا تھا۔ عام طور پر اس کے اوپر ایک ڈھانچہ بنا کر اسے ڈھک دیا جاتا تھا۔ بیل پانی کھینچ کر نکالتے تھے۔" بہت سے چھوٹے ڈولوں سے پانی باہر نکالا جاتا تھا۔ ان میں سے بعض ہمیشہ نیچے کی طرف جاتے تھے۔ اور دوسرے مسلسل اوپر کی طرف آتے تھے اور ناندوں یا نالیوں میں پانی اونڈیل دیتے تھے۔ ان ناندوں میں پانی جمع کر لیا جاتا تھا اور حسب الضرورت نالیوں سے پانی دوسری جگہ لے جایا جاتا تھا۔

نشیبی جگہوں میں تالاب بنائے جاتے تھے۔ وہ "گہرے اور بہت بڑے ہوتے تھے۔ ان کا گھیر ایک میل سے چار میل تک ہوتا تھا۔ ان کے چاروں طرف کنوئیں بنے ہوئے تھے اور نیچے جانے کے لئے سیڑھیاں بھی موسم گرما میں بھی ان میں پانی باقی رہتا تھا۔

(۲) بادشاہ

جہانگیر کا کردار؛

وہ بہت زیادہ "خوبصورت اور شریف النفس تھا؛ درندگی

کی حد تک ظالم اور ہر معاملے میں انتہا پسند تھا۔ بعض مرتبہ شراب کے نشے میں وہ دوسروں کو بلا قصور سزا دیا کرتا تھا۔ وہ لوگوں کو سختی سے کوڑے لگوانے کی سزا دیا کرتا تھا۔ خللِ دماغ کی وجہ سے وہ لوگوں کو مطیع بناتا تھا۔ اس میں بعض اچھی خوبیاں بھی پائی جاتی تھیں۔ بہت سے غریبوں کو وہ "متواتر" افلاس سے نجات دلاتا رہتا تھا۔ وہ اپنی ماں کا بڑا احترام کرتا تھا۔ اور اس کی خدمت کرکے اپنے فرائض کو ادا کرتا تھا۔ جب وہ پالکی پر سوار ہو کر کہیں جاتی تو وہ اسے اپنے کندھے پر اٹھا کرلے جاتا۔ اپنے منظورِ نظر لوگوں کے ساتھ وہ بڑی شرافت اور بے تکلفی سے پیش آتا تھا اور ان سے بہت محبت کرتا تھا۔ بڑے احترام کے ساتھ وہ عیسیٰ مسیح کا ذکر کرتا تھا لیکن ان کے وصف، سلسلۂ نسب اور انہیں سولی پر چڑھائے جانے کے بارے میں وہ کچھ نہیں سمجھتا تھا اور نہ ہی ان کے خدا کے بیٹے ہونے کے تصوّر کو اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔

لباس :

شہنشاہ اپنے جسم پر بالکل سفید اور عمدہ چھینٹ کے کپڑے کا لباس پہنا کرتا تھا۔ ایسا ہی لباس اس کے امیر پہنا کرتے تھے۔ ایک دن پہننے کے بعد دوسرے دن اس لباس کو دھو دیا جاتا تھا۔ الماس، موتی یا یاقوت جو وہ پہنا کرتا تھا، وہ غیر معمولی بڑے اور بیحد بیش بہا ہوتے تھے۔ جواہرات کی لمبی لمبی زنجیروں سے بھی وہ خود کو آراستہ کیا کرتا تھا جو اس کی گردن سے لٹکی ہوتی تھیں۔ اپنی کلائیوں اور انگلیوں میں بھی وہ نیلورات پہنا کرتا تھا۔ وہ اپنی تلواروں اور خنجروں میں بھی جواہرات جڑوایا کرتا تھا۔ ٹیری نے لکھا ہے کہ " چاہے ایک مغل بادشاہ کا لباس زیادہ خوبصورت اور قیمتی نہ ہو، تاہم مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ ساری دنیا میں کوئی دوسرا ایسا بادشاہ نہیں ہے جسے روزانہ اتنے زیادہ جواہرات سے آراستہ کیا جاتا ہے جیسا کہ وہ بذاتِ خود ہے "

مکانات :

منڈو اور احمد آباد ان دونوں مقامات میں بادشاہ کے قیام کے لئے " عمدہ اور

اعصابی جنگ کی شکل میں نمایاں تھے بالآخر ۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑ گئی ۱۹۱۱ء میں ترکی حکومت کے خاتمے کے لئے خفیہ سازش و معاہدہ ہوا شیخ الہند نے اس زمانے میں مسلح انقلاب کے ذریعہ انگریزی اقتدار کے خاتمہ کے لئے وسیع منصوبہ تیار کیا۔ اگست ۱۹۱۶ء میں اسی سے متعلق واقعات ریشمی خطوط کا انکشاف ہو گیا۔ مجوزہ اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے حجاز کے سفر کے دوران والی مکہ نے بہ ایما انگریز آپ کو ۱۳۳۵ھ میں گرفتار کر کے جدہ پھر مالٹا بھیج دیا گیا۔ سوا تین سال بعد ۱۹۲۰ء میں رہائی کے بعد دیوبند پہونچے۔ سیاسی سرگرمیوں کے دوران پیرانہ سالی میں خرابیٔ صحت پر ڈاکٹر مختار انصاری کے یہاں دہلی لے جایا گیا لیکن وقتِ موعود آچکا تھا بالآخر ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کی صبح کو عازم ملک بقا ہو گئے۔

آپ کا علمی سرمایہ (۱) کتابیں (۲) فتاویٰ (۳) تقریریں (۴) شاعری پر منقسم ہے بقول مصنف تذکرہ شیخ الہند "کتابی سرمایہ میں (۱) ادلہ کاملہ (۲) ایضاح الادلہ (۳) احسن القری (۴) الجہد المقل (۵) افادات محمودیہ (۶) الابواب والتراجم (۷) کلیات شیخ الہند (۸) حاشیہ مختصر المعانی (۹) تصحیح ابی داؤد (۱۰) فتاویٰ (۱۱) ترجمۂ قرآن شامل ہیں۔

ملازمت:

فراغت کے بعد بریلی کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ چند ہی سالوں میں حکومت کی طرف محکمہ تعلیم میں انسپکٹر مدارس کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔

اور چونکہ آپ مغربی علوم سے واقف تھے اس لئے پنشن پانے کے بعد دیوبند میں آنریری مجسٹریٹ بنا دیئے گئے، آپ نے بہت ہی ذمہ داری کے ساتھ اپنا فرض پورا کیا۔

مگر آخری چند سالوں میں استعفیٰ دیکر گوشہ نشینی و سبکدوشی حاصل کر لی۔ دوران ملازمت علم و ادب سے رشتہ برقرار رہا۔ اور مختلف کتابیں بھی تحریر کیں (۲)

۱۔ تذکرہ شیخ الہند (مفتی عزیز الرحمن) ص ۷۲-۸۱۔

۲۔ تذکرہ شیخ الہند حیات اور کارنامے۔ ص ۱۶۔ (مفتی عزیز الرحمن) (اقبال حسن خاں)

شادی:

مولانا ذوالفقار علی دیوبندی کی شادی دیوبند کے ایک معزز شخص شیخ ابو علی بخش صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی۔ آپ نہایت نیک اور شریف طبیعت کی حامل تھیں مولانا اصغر حسین کے لفظوں میں:

ان کی حسن نیت سے گھر میں ہر طرف خیر و برکت کا ظہور تھا۔ مال و عزت کے علاوہ جیسی قابل رشک اولاد میں مولانا شیخ الہند رحمہ اللہ جیسی عطا فرمائی۔ ایسی عظمت دنیا میں شاذ و نادر ہی نصیب ہوتی ہے۔ دو صاحبزادیاں نہایت عفیفہ دیندار صالحہ منتظمہ چار صالح عالم دین نیز دیو عظمت کے حامل صاحبزادے آپ کو خدائے پاک نے عطا کئے تھے۔ (۱)

اساتذہ:

آپ کے اساتذہ میں مولانا مملوک علی نانوتوی۔ اور مفتی صدر الدین آزردہ ہیں، ذیل مختصر تعارف۔

- مولانا مملوک بن حکیم، نانوتہ کے شیخ زادگان سے ہیں۔ دہلی میں مولانا رشید الدین کے شاگ میں سے تھے دہلی کالج میں عرصہ تک مدرس رہے۔۔۔ تحریر اقلیدس کا اردو میں ترجمہ کیا۔ مولا عبدالحق کے مطابق! مولانا مملوک جید عالم تھے، طول و عرض میں انکے علم و فضل کا شہرہ تھا: کریم الدین کی "طبقات الشعراء" کے حوالے سے!

"مدرس اول مدرسہ دہلی عالم بے بدل اور متقی بے مثل اور فاضل کامل ہیں۔ عہدہ میر مو بہ مشاہرہ سو روپے ماہواری مدرسے میں مقرر ہیں۔ حق یہ ہے کہ اس فاضل کی جیسی و ہونی چاہیئے تھی ویسی ہیں کیونکہ ایسے عمدہ فاضل بہت کم ہوتے ہیں۔ اور واقع بنائے مدرسہ عربی ان کی ذات سے مستحکم ہے۔ فارسی، اردو اور عربی تینوں میں کمال بیشتر علوم میں مہارت تامہ تھی۔

۱؎ حیات شیخ الہند ص: ۸

مدرسؔ کو ان کی ذات سے اتنا فیض ملا کہ شاید کسی زمانہ میں کسی استاذ سے اتنا ملا ہو۔ اگر ان کو معدن علم اور مخزنِ اسرار کہا جائے تو بجا ہے۔ کوئی کتاب کسی فن سے متعلق ہو متن پڑھا دیں گے، گویا کہ حفظ کر رکھی ہے۔ اسی لئے رات دن مدرسؔ کے علاوہ ان کے گھر طلبہ پڑھتے تھے، اور بہ خلیق اس طرح ہیں کہ کسی سے انکار نہیں کر سکتے، سب کو پڑھاتے ہیں۔ . . ذکی ذہین تیز فہم محقق اور دقیقہ سنج ہیں۔ (۱)

مولانا عبیداللہ سندھی نے آپ کے بارے میں لکھا ہے!

"آپ فقہ، عربی اور دوسرے علوم و فنون میں اپنے زمانے کے علماء سے ممتاز۔ دلی کالج میں اپنے استاذ مولانا رشید الدین کے بعد مدرس کا منصب دیا گیا۔ آپ کے شاگردوں میں مولانا مظہر نانوتوی، شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی عبدالرحمن پانی پتی، احمد علی (محدث سہارنپوری)، رشید احمد گنگوہی، شیخ محمد معتمد ابن مملوک علی، سید احمد دہلوی بانی جامعہ علی گڈھ، نذیر احمد (مترجم قرآن) ذکاءاللہ اور دوسرے نامور اہل علم کو ان کی شاگردی کا شرف و فخر حاصل ہے۔" (۲)

سرسید احمد خاں نے ان کی علمی عظمت کو یوں بیان کیا ہے:

"علم معقول و منقول میں استعداد کامل اور کتب درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان کتابوں سے گنجینۂ عالم خالی ہو جائے تو ان کے لوحِ محفوظ سے پھر ان کی نقل ممکن ہے۔" (۳)

مولانا مملوک علی کا ۱۲۶۷ھ میں انتقال ہوا۔ اور آپ مقبرۂ ولی اللہ دہلوی میں سپرد خواب ہوئے۔

---

(۱) طبقات شعراء ہند، مولوی کریم الدین

(۲) مفتی صدر الدین آزردہ

(۳) بحوالہ مولانا عبیداللہ سندھی، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء ص ۲۰۶۔

مدرس کو ان کی ذات سے اتنا فیض ملا کہ شاید کسی زمانہ میں کسی استاذ سے اتنا ملا ہو۔ اگر ان کو معدن علم اور مخزنِ اسرار کہا جائے تو بجا ہے۔ کوئی کتاب کسی فن سے متعلق ہو عنفواں پڑھا نہ سا گے، گو یا کہ حفظ کر رکھی ہے۔ اسی لئے رات دن مدرسہ کے علاوہ ان کے گھر طلبہ پڑھتے تھے، اور وہ خلیق اس طرح ہیں کہ کسی سے انکار نہیں کر سکتے، سب کو پڑھاتے ہیں۔ . . . ذکی ذہین تیز فہم محقق اور دقیقہ سنج ہیں۔(۱)

مولانا عبید اللہؒ سندھی نے آپ کے بارے میں لکھا ہے!

" آپ فقہ، عربی اور دوسرے علوم و فنون میں اپنے زمانے کے علماء سے ممتاز ؛ دہلی کالج میں اپنے استاذ مولانا رشید الدین کے بعد مدرس کا منصب دیا گیا۔ آپ کے شاگردوں میں مولانا مظہر نانوتوی، شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی عبدالرحمن پانی پتی، احمد علی (محدث سہارنپوری)، رشید احمد گنگوہی، شیخ محمد معتمد ابن مملوک علی، سید احمد دہلوی بانی جامعہ علی گڑھ، نذیر احمد (مترجم قرآن) ذکاء اللہ اور دوسرے نامور اہل علم کو ان کی شاگردی کا شرف و فخر حاصل ہے۔" (۲)

سرسید احمد خاں نے ان کی علمی عظمت کو یوں بیان کیا ہے:

"علم معقول و منقول میں استعداد کامل، اور کتب درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان کتابوں سے گنجینۂ عالم خالی ہو جائے تو ان کے لوحِ محفوظ سے پھر ان کی نقل ممکن ہے۔" (۳)

مولانا مملوک علی کا ۱۲۶۷ھ میں انتقال ہوا۔ اور آپ مقبرۂ ولی اللہ دہلوی میں آسودۂ خواب ہوئے۔

---

(۱) طبقات شعراء ہند، مولوی کریم الدین

(۲) مفتی صدر الدین آزردہ

(۳) بحوالہ مولانا عبید اللہ سندھی: شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ ص ۲۰۶-

مفتی صدر الدین آزردہ

مفتی محمد صدر الدین خاں صدر الصدور دہلوی آزردہ آپ تمام علوم صرف، نحو، منطق، حکمت، ریاضیات، معانی، بیان، ادب و انشار، فقہ حدیث اور تفسیر وغیرہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور درس بھی دیتے تھے آپ کے آباء و اجداد کاشمیر کے اہل بیت علم و صلاح سے تھے مگر آپ کی ولادت ۱۲۰۴ھ میں دہلی میں ہوئی۔ علوم نقلیہ و حدیث وغیرہ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی اور ان کے بھائیوں سے حاصل کی، اور ان سے سندیں لیں، اور فنون عقلیہ کو مولوی امام خیر آبادی والد مولوی فضل حق سے اخذ کیا۔ اس کے علاوہ شیخ محمد اسحاق دہلوی نے بھی آپ کو سند حدیث کی اجازت لکھ کر دی۔ آخری عمر میں ایک دو سال مرض فالج میں مبتلا ہو کر اکاسی سال کی عمر میں یوم پنجشنبہ ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ میں فوت ہوئے مولانا ذوالفقار علی دیوبندی کے علاوہ مولانا فقیر محمد جلبی، سرسید احمد خاں، نواب یوسف علی خاں والی رام پور، نواب صدیق حسن خاں، قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی آپ کے شاگردوں میں سے ہیں۔

کتابوں میں رسالہ منتہی المقال فی شرح حدیث لاتشد الرحال، در المنفود فی حکم امرأة المفقود وغیرہ ہیں۔

وفات

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ۱۳۲۲ھ بمطابق ۱۹۰۴ء یوم دوشنبہ بچاسی سال کی عمر میں وفات پائی۔ مولانا قاسم نانوتوی کے پہلو میں مزار قاسمی میں آسودۂ خواب ہیں، آپ کے بائیں پہلو مولانا احسن نانوتوی کی قبر ہے۔ آپ کی وفات سے خانوادۂ علم و ادب و سررشتہ دار العلوم دیوبند کو گہرا رنج و قلق ہوا۔

خاقانی ہند مولانا فضل الرحمٰن عثمانی (والد ماجد مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی) نے وصال پر ملال سے متاثر ہو کر درج ذیل قطعۂ تاریخ وفات تحریر فرمایا: ؎

صاحب جاہ ومراتب مولوی ذوالفقار — آنکہ حسب فضل اور رفتہ بعالم سوبسو
آنکہ زینب اہل علم وفخر اہل شہر بود — نیک سیرت، نیک نیت، نیک خو
ذوالفقار کز دمش شد نامور فتح علی — در نیام خاک داد از این جہاں پوشیدہ رو
لافتیٰ الا علی لاسیف الا ذوالفقار — در مقام مدح گو یا گفتہ شد درشان او
بود دارفع بالتی ہی احسن از وصاف او لے — آرے دم طاز دو، بود خلق نکو
زندگی کرد در دنیا چوں خلق حسن — آفریں از خلق باد و رحمت از خالق برو
پانزدہ تاریخ بود از رجب وقت سحر — سال ہجری یکہزار وسہ صد و ہم بست [۱۳] [۲۲] دو
بود کان کان سرمایہ فخر جہاں با صد نشاط — عازم جنت بشد زیں خاکدان تیرہ رو
سال نقل او خراشیدہ زغم روئے — عاش محمود احمید امات مشہود ابگو [۱]

تصانیف

(۱) عطر الوردة شرح قصیدہ بردہ۔
(۲) الارشاد شرح قصیدہ بانت سعاد
(۳) تسہیل الدراسة شرح دیوان الحماسة
(۴) التعلیقات علی السبع المعلقات
(۵) تسہیل البیان شرح دیوان المتنبی
(۶) تذکرة البلاغة فی المعانی والبیان
(۷) الہدیة السنیة فی ذکر المدرسة الاسلامیة الدیوبندیہ
(۸) تسہیل الحساب فی اصول ومبادی الریاضی

لہ مشاہیر دار العلوم دیوبند ص ۱۳

تاریخ شاہجہاں - ایک مطالعہ

عبدالرؤف خاں ایم۔ اے تاریخ۔ اودی کلاں (راجستھان)

ترقی اردو بورڈ نئی دہلی نے انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ نئی دہلی کے اشتراک
سے ڈاکٹر بنارسی پرساد سکسینہ کی انگریزی زبان میں لکھی گئی تصنیف "ہسٹری آف شاہ جہاں
آف دہلی" کا اردو ترجمہ ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب سے کرایا اور ۱۹۸۷ء میں شائع کیا جس
کا ساں ہی میں مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوا کہ مترجم موصوف نے فنِ ترجمے کے تمام اصولوں
کو بالائے طاق رکھتے ہوئے نہایت رواداری و بے دلی سے ترجمہ سپردِ قلم فرمایا ہے جسے نہ تو صحیح
معنوں میں ترجمہ ہی کہہ سکتے ہیں اور نہ ترجمانی ہی کیوں کہ بہت سے انگریزی فقرات کا ترجمہ
یا تو ناقص ہے یا معکوس و مقلوب مستزاد یہ کہ بیسیوں فقروں کا ترجمہ کیا ہی نہیں گیا۔ یا بیشتر
طویل جملوں کے ترجمے کا حق صرف علامتی طور پر نہایت مختصر طور پر ادا کیا گیا ہے جسے ایجاز بیانی
کا نمونہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ رہی سہی کور کسر کاتب نے پوری کر دی اس طرح سکسینہ صاحب کی
پوری تصنیف کا اردو ترجمہ مضحکہ خیز بن کر رہ گیا۔ ہمہ مترجم موصوف کا یہ فرمانا کہ
"طویل جملوں کو اپنے طور پر بالاختصار انداز میں بلیغ کرنے میں پیش آجاتا ہے اس صورت
میں کبھی کبھی مجھے ایک جملہ کو اردو میں حسن و اثر کے ساتھ ترجمہ کرنے میں گھنٹوں صرف کرنا پڑا ہے"

(چند باتیں ص ۵)

لیکن جب ترجمہ کا اصل انگریزی متن سے مقابلہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مترجم نے
گھنٹوں تو کجا چند ثانیے بھی اس کارِ خیر کو بحسن و خوبی انجام دینے میں صرف نہیں کیے جیسا درج
ذیل صرف چند مثالوں سے واضح ہو جائے گا۔ ہم یہاں پہلے انگریزی متن اور پھر موصوف کا
ترجمہ پیش کریں گے:

ڈاکٹر صاحب نے تمہید (Preface) کے آخر میں معاونین کا شکریہ ادا کرنے کے لئے

یہ عبارت لکھی ہے:

"In the end, let me acknowledge with thanks the assistance received from my pupils Messrs Bhawani Prasad and Shambhu Saran Lal, Hafiz Ahmad Ali Khan, the librarian of the state library Rampur, Miss Murray Browne, the deputy-librarian of the school of oriental studies, London, and Mr. Sarju Prasad, the deputy-librarian of Allahabad university library"–

(History of Shahjahan of Dihli Ed. 1958)

اب مذکورۃ الصدر طویل فقرہ کا "حسن و اثر" کے ساتھ کیا ہوا اردو ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

"اپنے شاگردوں بھوانی پرشاد (؟ پرساد) سجھوشرن (؟ سرن) لال اور حافظ احمد علی خاں کا شکریہ ادا کروں، نیز اسٹیٹ لائبریری رامپور کے لائبریرین مرے براؤن۔ ڈپٹی لائبریرین اورینٹل اسٹڈیز لندن اور ڈپٹی لائبریرین الہ آباد یونیورسٹی لائبریری کا شکرگزار ہوں"

(دیباچہ ص ۲)

یہ ترجمہ کئی اعتبار سے گمراہ کن ہے کیونکہ اس میں اسٹیٹ لائبریری رامپور کا کتاب دار حافظ احمد علی خاں کے بجائے (مس) مرے براؤن کو بتلایا ہے جو اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کی ڈپٹی لائبریرین ہیں اور وہ بھی صیغۂ تذکیر میں علاوہ ازیں مسٹر سرجو پرساد کو حذف کر گئے ہیں اور علامات سکتہ (commas) بے محل لگائے ہیں جن کے سبب سے مفہوم بھی خبط ہو گیا ہے جبکہ مذکورہ انگریزی عبارت کا سیدھا سا ترجمہ ہو سکتا تھا۔

"آخر میں اس تعاون کا شکریہ ادا کروں (یا ادا کرنا واجب ہے) جو مجھے اپنے تلامذہ بھوانی پرساد اور سمبھو سرن لال سے حاصل ہوا (علاوہ ازیں) اسٹیٹ لائبریری رامپور کے کتابدار حافظ احمد علی خاں، اورینٹل اسٹڈیز اسکول لندن کی ڈپٹی لائبریرین مس مرے براؤن نیز الہ آباد یونیورسٹی لائبریری کے ڈپٹی لائبریرین مسٹر سرجو پرساد کا شکرگزار ہوں۔

مغل سلطان ہندوستانیوں کے تئیں جس قسم کے خیالات رکھتے تھے ان کے بارے میں سکسینہ صاحب نے بطور احتجاج اور تردیداً یہ فقرہ لکھا ہے؛

"Thees common epithet of barbarian to Indians is a clear proof of their narraw out look". P. XX

اس فقرہ کا ترجمہ یہ کیا ہے:

"ہندوستانیوں کے لئے وحشی کا عام لقب ان کی زبان زد تھا، یہی ایک بات ان کی زبان زد تھی، یہی ایک بات ان کی زبان زد تھی، یہی ایک بات ان کی تنگ خیالی کی واضح دلیل ہے۔" (ص ۳۰)

شہزادہ خرم کو شہنشاہ جہانگیر نے مختلف اعزازات سے سرفراز کرنے کے علاوہ مہر اُزک بھی اس کے سپرد کردی۔ مہر ازک، مدور یا بیضاوی شکل کی ایک چھوٹی مہر ہوتی تھی جس پر بادشاہ کا نام کندہ ہوتا تھا جو خاص فرامین پر لگائی جاتی تھی یہی وجہ تھی کہ اسے انتہائی معتمد شخصیت کے حوالہ کیا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر سکسینہ صاحب نے لکھا ہے کہ:

"To crown it all the 'Muhr uzak' was placed in his charge" (P. 9)

ترجمہ: "ان اعزاز (کذا) کو اور معزز بنانے کے لئے ایک مہر ازک کے سپر (؟ سپرد) کی گئی۔" (ص ۴۵)

مترجم موصوف نے یہاں ازک کو شخصیت ظاہر کیا ہے۔ اور اعزاز کو جمع کے صیغہ میں استعمال کیا ہے۔ شہزادہ خرم اپنی سیاسی پیش بینی کے طور پر شاہنواز خاں ابن عبدالرحیم خان خاناں کو اپنے ذاتی مصاحبوں میں شریک کرنا چاہتا تھا۔ اس سلسلہ میں ہسٹری آف شاہ جہاں آف دہلی میں یہ فقرہ ہے:-

"... and Khurram wanted to include him in the circle of his personal adherents, whose number he was now skilfully increasing" P. 14

ترجمہ: "خرم چاہتا تھا کہ اس کو اپنے ذاتی مصاحبوں کی تعداد سمجھ بوجھ کر وہ بڑھا رہا تھا۔" (ص۔ ۴۹) جبکہ ترجمہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ: اور خرم اسے اپنے ذاتی مصاحبوں کے زمرہ میں شریک کرنا چاہتا تھا جن کی تعداد میں وہ اب ہوشیاری کے ساتھ اضافہ کر رہا تھا۔

دکن میں ملک عنبر کا مقابلہ کرتی ہوئی مغل افواج کو بوجوہ پسپا ہونا پڑا۔ اس بارے میں انگریزی متن کا فقرہ یہ ہے:۔

"of this encouraged the Daccanis, and they pursued the Mughals to Balapur, which they sacked thoroughly."

اس فقرہ کا مضحکہ خیز ترجمہ دیکھئے:

"اس پسپائی نے دکنی فوجوں کو ہمت دلائی انہوں نے دشمن کو آگے بڑھنے سے روکتی رہی۔" (ص: ۵۸)

فارسی ضرب المثل من چہ می سرایم و طنبورۂ من چہ سراید شاید ایسے ہی موقع کے لئے کہی گئی ہوگی یعنی کہ میں کیا گا رہا ہوں اور میرا طنبورہ کیا گا رہا ہے۔ جبکہ فقرہ کا مفہوم یوں بھی ادا کیا جا سکتا تھا کہ، (اس پسپائی سے) دکنی افواج کی حوصلا افزائی ہوئی اور انہوں نے بالا پور تک مغلوں کا تعاقب کیا جسے وہ مکمّل طور پر تاراج کر چکے تھے۔

خانخاناں دکن کی مہم سر کرنے میں ناکام رہا تو اس نے برائے کمک کئی عرضداشت دربار میں بھیجیں، اس ذیل میں متنی فقرہ یہ ہے:

"... and he sent appeal after appeal to the court for help": P. 26.

اس سادہ فقرہ کا ترجمہ دیکھئے:۔ "وہ بادشاہ کو درخواست پر مدد کے لئے بھیج رہا تھا۔" (ص ۵۸)۔ اس ترجمہ سے متبادر ہوتا ہے کہ کمک کے لئے درخواست کسی اور کا ندارنے کی جس کی مدد کے لئے خانِ خاناں بادشاہ کو بھیج رہا ہے۔

نورجہاں، شاہجہاں اور مہابت خاں کے ضمن میں ایک فقرہ ہے:۔

"The former had been her life-long enemy an

she tolerated him because there was no other leader competent to deal with Shah Jahan" P.52

متذکرہ فقرہ کا ترجمہ جس ایجاز بیانی کے ساتھ کیا گیا ہے وہ یہ ہے:۔ "اول الذکر اس سے بہتر کوئی اور شخص نہ تھا"۔ (ص ۷۶)

شاہجہانی عہد کی بغاوتوں کے اسباب کے بارے میں ایک طویل فقرہ ہے:

"In the following instances it will be noticed that either the grant of 'jagirs' in their own native land, or undue favouritism, or a combination of both, was responsible for the outbreaks" P.66 -

ترجمہ: "حسب ذیل مثالوں میں یہ نظر آئے گا کہ جاگیریں خواہ کسی کو خواہ اس کے وطن میں دی گئیں یا غیر مناسب مراعات یا دونوں کے امتزاج کے مرکب کا نمونہ تھیں سلطنت کی شکست و ریخت کی ذمہ دار ثابت ہوئیں۔" (ص ۸۶)

بغاوتوں کے سلسلہ میں ہی ڈاکٹر سکینہ صاحب کا ایک طویل فقرہ ہے:

"The three important rebellions which occured in the reign of Shah Jahan furnish an indication of the revival of a tendency so commonly to be met with in the history of Muslim rule in India". P.66

ترجمہ: "تین اہم بغاوتیں جو شاہجہاں کے عہد حکومت میں ہوئیں" (ص ۸۶) مترجم موصوف نے یہاں جس اختصار اور ایجاز سے کام لیا ہے اسے ان کے قلم کی اعجاز بیانی کا کرشمہ ہی کہا جائے گا۔ اسے کوزہ میں دریا کو بند کرنا بھی کہہ سکتے ہیں:۔

ضبطِ گریہ نے تماشا طرفہ تر دکھلا دیا
چشم کے کوزے میں دریا بند کر دکھلا دیا

پرتگالیوں کے ادائگی تاوان کے ذیل میں ہسٹری آف شاہجہان آف دہلی میں یہ جملہ ہے:

"After some descussion the Purtugues paid 10,000 tank's the first instalment of the indemnity and promised to pay soon the other instalment of 200,000 'tankas'" P. 111 -

ترجمہ: "کچھ بات چیت کے بعد پرتگالیوں نے دس ہزار ٹن کا تاوان جنگ کی پہلی قسط ادا کی اور وعدہ کیا کہ دولاکھ ٹن کی دوسری قسط جلد ادا کردیں گے۔" (ص ۱۱۶)

اس فقرہ میں محترم مترجم نے "تنکہ" نام کے سکہ کو، جو اڑتالیس یا چونسٹھ "جیتل" کا ہوتا تھا، وزن کے پیمانے "ٹن" (جو ۲۸ من کے مساوی ہوتا ہے) میں تبدیل کرتے ہوئے جدت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔

مترجم موصوف عنوان "چند باتیں" کے تحت فرماتے ہیں "کہ اردو کی لفظیات کا ذخیرہ بھی اتنا وافر نہیں جتنا انگریزی کا۔ (اس لیے) ہر موقع کے تاثرات کی تصویر کشی کے لئے الفاظ کی کمی نے کبھی کبھی حسن بیان کو ابھرنے نہیں دیا۔" (ص ۵،۶)

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ اردو جس کا خمیر ہندوستان کی تمام زبانوں کے علاوہ فارسی اور عربی جیسی الہامی و عالمگیر زبان کے خونِ جگر سے گوندھا گیا ہو، مترجم موصوف اس کے ذخیرۂ الفاظ (vocabulary) کی کم مائگی کا شکوہ فرما رہے ہیں، جس نے ان کے حسنِ بیان کو ابھرنے نہیں دیا۔

اس غریبی نے میرے فن کو ابھرنے نہ دیا

بقول اُن کے اگر اردو غریب کا دامن اتنا تنگ نہ ہوتا تو معلوم نہیں وہ ترجمہ میں کیا گل کھلاتے؟ ترجمہ کا یہ مضحکہ خیز سلسلہ کتاب کے آخری صفحہ تک چلا گیا ہے جس کے احاطہ کے لئے علیحدہ کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ لیکن ہم متذکرہ صدر مثالوں پر اکتفا کرتے ہوئے اب چند ایسے فقرات پیش کرتے ہیں جن کی حسن آفرینی قابل توجہ ہے۔

(۱) "جہانگیر نے خرم کو اجین کی جاگیر اور حصار، فیروزہ (حصار فیروزہ) کی سرکار عطا کی ص ۴۵
(۲) لیکن اُس وقت بیدار ہوا پانی سر سے اونچا ہو گیا تھا ص ۶۳ (۳) اس علاقہ میں مرہٹہ

کی مستقبل حکومت کے بیج بوئے جارہے تھے۔ ص ۱۴۰ (۴) لیکن ان کا بھائی نظر محمد (نذر محمد) بیقرارا منگوں کا آدمی تھا۔ ص ۱۶۹ (۵) وہ عبداللہ خاں سے ملنے آیا صرف کمر پر ایک کپڑا باندھے تھا۔ اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑے تھا۔ ص ۱۲۱۔ ترجمہ میں "حسن واثر" میں ڈوبے ہوئے اس قسم کے فقرات کا سلسلہ بھی لامتناہی ہے مگر تطویل کے سبب یہاں صرف فقروں پر اکتفا کیا گیا ہے۔

اب بطور نمونہ چند الفاظ کے املا اور اغلاط کتابت کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا جنہیں ہم نے خطوط وحدانیہ میں درست املا کے ساتھ لکھ دیا ہے۔

تعلیم قور ص ۱۳ (تسلیم قور) طومان تغ ص ۱۵ (تومان توغ یا تمن طوغ) قمرمہ ص ۲۰ (قمرغہ) اولاد اکبر ص ۵۴ (اولادِ کبیر تاکہ شہنشاہ اکبر کی اولاد کی طرف قاری کا ذہن منتقل نہ ہو)۔ ثور تی ص ۶۶ (دشادرتی) سراول ص ۶۷ (سزاول بمعنی داروغہ یا سپرنٹنڈنٹ، محصّل) دل آزادی ص ۶۹ (دل آزاری) دربدی ص ۸۷ (دربدری غالباً دربدر کے حاصل مصدر کے طور پر استعمال کیا ہے) دعوادار ص ۹۹ (دعویدار) کھٹک ص ۱۲۶ (خٹک یا خٹک) کمانوں کا راجا ص ۱۲۶ (کماؤں ...) یوسف قمری ص ۱۲۹ (... زئی) نوشیرہ ص ۱۲۹ (نوشہرہ) جنگلی جہاز (جنگی جہاز) حکمت عل ص ۱۳۲ (حکمتِ عملی) تحفے ص ۱۳۷ (تحفے) اطاعت ص ۱۳۷ (اطاعت) آزدہ ص ۱۳۷ (آزردہ) سارا املاک ص ۱۴۰ (ساری ...) پیانی گھاٹ ص ۱۴۰، ۱۴۱ (پائین گھاٹ) ابی سینائی ص ۱۴۶ (حبشی یا ابی سینیائی) دکھنی جتھاؤں ص ۱۴۶ (دکنی جتھوں) گمنانی ص ۱۶۸ (گمنامی) رجان ص ۲، اور دیگر صفحات (رجحان) کھکھروں ص ۱۷۸ (گھکڑوں) اجدیوں ص ۱۷۸ (احدیوں) فوجوں افسروں ص ۲۰۴ (فوجی افسروں) قطاص ۲۰۲ (قطار) بست کی سرنگ ص ۲۰۶ (بست کی سڑک) نماز بوسی ص ۲۱۶ (زمین بوسی) نیطل ص ۲۰۴ (قیطل) وضع محل ص ۲۶۳ (وضع حمل) گوالیلر ص ۲۶۳ (گوالیار) راتنھور ص ۲۶۳ (رنتھنبور) بازنطان کے حکمراں ص ۲۵۴ (بازنطینی حکمراں) فرمابرداری ص ۲۰۸ (فرماں برداری) ولی عبد ص ۱۶۷ (ولیعہد) چکرورتین (چکرورتی) بیربار ص ۲۳۷ (بیربر) دیوانِ تان یا ٹان کئی صفحات پر (دیوانِ تن) مصطوفی ص ۲۳۸ (مستوفی) ہیرازاک ص ۲۳۷، ۲۹۸ (ہیرازک یا ہیرک) چار لاکھ دین مہر مقرر ہوا ص ۲۶۶ (چار لاکھ روپیہ بطور کابین مقرر ہوا) ایک سلطان السلاطین بھی ہے ص ۲۹۸ (ایک عالم الغیب طاقت احکم الحاکمین بھی ہے) ——— (باقی آئندہ)

عہد مغلیہ یورپی سیاحوں کی نظر میں

(سنہ ۱۶۱۶ء - سنہ ۱۶۱۹ء)

قسط ۱۲

پروفیسر محمد عمر، شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ایڈورڈ ٹیری : سوانح عمری

ٹیری کی ولادت سنہ ۱۵۹۰ء میں ہوئی تھی اور اسکی تعلیم و تربیت روچسٹر اسکول اور اکسفورڈ یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ سنہ ۱۶۱۶ء میں اس نے اس فوجی بحری بیڑے کے پادری کا عہد قبول کر لیا جس کی قیادت کیپٹن بنجامن جوسف کر رہا تھا۔

سر تھومس رو کے خاندانی پادری کا انتقال ہوگیا تو اس نے سورت میں مقیم اعلیٰ عہدہ داروں سے کسی دوسرے پادری کے بھیجنے کی درخواست کی۔ ٹیری نے اس عہدہ کو قبول کر لیا اور فروری سنہ ۱۶۱۷ء میں وہ اجمیر میں رو کے پاس پہونچ گیا۔ وہ اس سفیر کے ہمراہ منڈو گیا۔ اور وہاں سے احمد آباد گیا۔ ٹیری کو صرف گجرات اور مالوہ کے صوبوں کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔

سنہ ۱۶۱۸ء میں وہ ہندوستان سے واپسی کے لئے روانہ ہوگیا اور ۱۷ فروری سنہ ۱۶۱۹ء میں وہ انگلستان پہونچا۔ لندن کے قریب اپنے وطن میں اس نے گریٹ گرین فورڈ میں ریکٹر کا عہدہ سنبھال لیا اور سنہ ۱۶۲۹ء میں اپنی وفات تک وہ اسی عہدہ پر برقرار رہا۔

سنہ ۱۶۲۲ء میں ٹیری نے ہندوستان کے بارے میں اپنا روزنامچہ پرنس آف ویلس (چارلس) کی خدمت میں پیش کیا۔ بعد میں اضافے کے ساتھ اس نے اس روزنامچہ کو دوسری بار شائع کیا۔

پرچاز نے PILGRIMAGE نامی اپنی تصنیف میں اس کو شامل کر لیا ہے اور رسٹر نے EARLY TRAVELS IN DIA نامی اپنی کتاب میں بھی اس روزنامچہ کو

شامل کر دیا ہے۔ یہ کتاب سنہ ۱۹۲۱ء میں اکسفورڈ پریس سے شائع ہوئی تھی۔

شہروں، سرائیوں اور تالابوں وغیرہ کا بیان

ملتان

ملتان کی صنعتوں کا ذکر کرتے ہوئے ٹیری نے لکھا ہے کہ وہاں اعلیٰ قسم کے تیر و کمان بنائے جاتے تھے۔ کمانیں "سینگوں کے بنائے جاتے تھے اور سریش لگا کر انہیں آپس میں اچھی طرح جوڑ دیا جاتا تھا" چھوٹے سرکنڈوں کے ٹکڑوں اور بیتوں سے تیر بنائے جاتے تھے۔ تیر و کمان دونوں پر نقش و نگار بنائے جاتے تھے۔ ان پر پالش کی جاتی تھی۔ وے بہت اچھے اور صاف ستھرے دکھائی دیتے تھے۔ ہندوستان میں کسی دوسرے اور مقام پر اتنے خوبصورت تیر و کمان نہیں بنائے جاتے تھے۔

منڈو

ٹیری نے لکھا ہے کہ "منڈو شہر بہت اونچے ایک پہاڑ پر واقع ہے جس کی چوٹی وسیع ہموار اور مسطح ہے۔ سوائے ایک سمت کے، اس کے آس پاس واقع تمام حصوں سے، چڑھائی بہت اونچی اور ڈھلوان سیدھا ہے۔ جس پر منڈو واقع ہے اس پہاڑ کے چاروں طرف اچھے درخت لگے ہوئے تھے۔ یہ درخت آگے پیچھے ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر لگے ہوئے تھے کہ انھیں دیکھنے میں بڑی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ چاہے انھیں نیچے یا پہاڑی کی چوٹی سے دیکھا جائے۔"

"بڑے اور دور تک پھیلے ان جنگلات میں شیر، ببر شیر اور دوسرے شکاری درندے اور بہت سے جنگلی ہاتھی رہتے ہیں۔"

"حالانکہ ہم لوگ وہاں گئے تھے لیکن منڈو، جو اس وقت مغل حکمراں کا صدر مقام تھا بہت زیادہ آباد نہ تھا۔ بنے ہوئے مکانات کی بہ نسبت وہاں دور دور تک کھنڈرات میں باقی رہ گئی تھیں، ان میں سے بیشتر ویران مسجدیں تھیں۔"

"ان ویران مسجدوں میں سے ایک مسجد ایسی تھی کہ اس کے قریب ایک مقبرہ واقع تھا۔ ان دونوں کی چھتیں محرابی تھیں۔

میرے آقا رو اور اس کے ساتھیوں کے ٹھہرنے کے لئے وہ عمدہ جگہ تھی۔ ہم لوگ اپنے ساتھ اپنے بستر، اس سے متعلق دوسری چیزیں، باورچی خانہ کی ضروری چیزیں اور ان کے علاوہ پہننے کی دوسری چیزیں بھی لے گئے تھے۔"

تالابوں اور سرائیوں کے بارے میں بعض عام تبصرے!

اینٹوں اور پتھروں سے سرائیں بہت مضبوط بنی ہوئی تھیں۔ بلا کرایہ ان میں مسافروں کو رہنے کے لئے کمرے مل سکتے تھے۔ اپنی ضرورت کی دوسری چیزیں انھیں بذاتِ خود فراہم یا خریدنی پڑتی تھیں۔

کنوئیں گول کھودے جاتے تھے۔ وہ "بڑے اور وسیع ہوتے تھے۔ سخت پتھروں کو کاٹ کر کنوئیں بنائے جاتے تھے اور اندر کی طرف عمدہ پلاسٹر کیا جاتا تھا۔ عام طور پر اس کے اوپر ایک ڈھانچہ بنا کر اسے ڈھک دیا جاتا تھا۔ بیل پانی کھینچ کر نکالتے تھے۔" بہت سے چھوٹے ڈولوں سے پانی باہر نکالا جاتا تھا۔ ان میں سے بعض ہمیشہ نیچے کی طرف جاتے تھے۔ اور دوسرے مسلسل اوپر کی طرف آتے تھے اور ناندوں یا نالیوں میں پانی اونڈیل دیتے تھے۔ ان ناندوں میں پانی جمع کر لیا جاتا تھا اور حسب الضرورت نالیوں سے پانی دوسری جگہ لے جایا جاتا تھا۔

نشیبی جگہوں میں تالاب بنائے جاتے تھے۔ وہ "گہرے اور بہت بڑے ہوتے تھے۔ ان کا گھیر ایک میل سے چار میل تک ہوتا تھا۔ ان کے چاروں طرف کنوئیں بنے ہوئے تھے اور نیچے جانے کے لئے سیڑھیاں بھی۔ موسم گرما میں بھی ان میں پانی باقی رہتا تھا۔

(۲) بادشاہ

جہانگیر کا کردار!

وہ بہت زیادہ "خوبصورت اور شریف النفس تھا" در زندگی

کی حد تک ظالم اور ہر معاملے میں انتہا پسند تھا۔ بعض مرتبہ شراب کے نشے میں وہ دوسروں کو بلا قصور سزا دیا کرتا تھا۔ وہ لوگوں کو سختی سے کوڑے لگوانے کی سزا دیا کرتا تھا۔ ظلم [illegible] کی وجہ سے وہ لوگوں کو مطیع بنا تا تھا۔ اس میں بعض اچھی خوبیاں بھی پائی جاتی [illegible] سے غریبوں کو وہ "متواتر" افلاس سے نجات دلاتا رہتا تھا۔ وہ اپنی ماں کا بڑا احترام کرتا تھا اور اس کی خدمت کرکے اپنے فرائض کو ادا کرتا تھا۔ جب وہ پالکی پر سوار ہوکر کہیں جاتی تو وہ اسے اپنے کندھے پر اٹھا کرلے جاتا۔ اپنے منظور نظر لوگوں کے ساتھ وہ بڑی شرافت اور بے تکلفی سے پیش آتا تھا اور ان سے بہت محبت کرتا تھا۔ بڑے احترام کے ساتھ وہ عیسیٰ مسیح کا ذکر کرتا تھا لیکن ان کے وصف، سلسلۂ نسب اور انہیں سولی پر چڑھائے جانے کے بارے میں وہ کچھ نہیں سمجھتا تھا اور نہ ہی ان کے خدا کے بیٹے ہونے کے تصوّر کو اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔

لباس :

شہنشاہ اپنے جسم پر بالکل سفید اور عمدہ چھینٹ کے کپڑے کا لباس پہنا کرتا تھا۔ ایسا ہی لباس اس کے امیر پہنا کرتے تھے۔ ایک دن پہننے کے بعد دوسرے دن اس لباس کو دھو دیا جاتا تھا۔ الماس، موتی یا یاقوت جو وہ پہنا کرتا تھا، وہ غیر معمولی بڑے اور بیحد بیش بہا ہوتے تھے۔ جواہرات کی لمبی لمبی زنجیروں سے بھی وہ خود کو آراستہ کیا کرتا تھا جو اس کی گردن سے لٹکی ہوتی تھیں۔ اپنی کلائیوں اور انگلیوں میں بھی وہ زیورات پہنا کرتا تھا۔ وہ اپنی تلواروں اور خنجروں میں بھی جواہرات جڑوایا کرتا تھا۔ ٹیری نے لکھا ہے کہ " چاہے ایک مغل بادشاہ کا لباس زیادہ خوبصورت اور قیمتی نہ ہو، تاہم مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ ساری دنیا میں کوئی دوسرا ایسا بادشاہ نہیں ہے جسے روزانہ اتنے زیادہ جواہرات سے آراستہ کیا جاتا ہے جیسا کہ وہ بذاتِ خود ہے "

مکانات :

منڈو اور احمد آباد ان دونوں مقامات میں بادشاہ کے قیام کے لیے " عمدہ اور

مربع نما خوبصورت پتھروں کی عمارتیں بنی ہوئی ہیں" وہ عمارتیں بڑے بڑے احاطوں میں لگی ہوئی تھیں۔ ٹیری ان محلات کے اندرونی حصوں کو نہ دیکھ سکا تھا کیونکہ وہاں بادشا

شہنشاہ کے لئے گنگا ندی کا پانی!

جہاں کہیں بھی وہ ہوتا بادشاہ کے لئے گنگا ندی کا پانی مہیا کیا جاتا تھا۔ اس کام کے لئے علیحدہ لوگ مقرر تھے جو" پانی لے کر آتے اور پانی لینے جایا کرتے تھے۔ یہ پانی تانبے کے عمدہ مرتبانوں میں لایا جاتا تھا جن کے اندرونی حصے میں عمدہ قلعی ہوتی تھی" پانی بردار کو یہ پانی حوالے کرتے وقت اسے مہر بند کر دیا جاتا تھا اپنے کندھے پر لٹکا کر ایک آدمی جھولوں میں دو مرتبان لے جایا کرتا تھا۔

شہنشاہ کی سواری گاڑی!

تھومس رو نے جو بگھی بادشاہ کو پیش کی تھی اسے توڑ دیا گیا تھا۔ اس شکل و نقشے کی دوسری ایک گاڑی بنائی گئی تھی۔ اس کے بعد انگریزی سواری گاڑی کو دوبارہ بنایا گیا تھا جس کی سطح نقرئی تھی اور اس پر ریشمی پھول بنے ہوئے تھے بیتل کی کیلوں کی جگہ چاندی کی کیلیں لگائی گئی تھیں۔ دیسی بنی ہوئی سواری گاڑی کو خوبصورت طلائی کپڑے سے سجایا گیا تھا جس پر مخلوط ریشمی پھول بنے ہوئے تھے۔

نجومیوں پر عقیدہ!

جہانگیر نجومیوں پر بہت زیادہ اعتماد کرتا تھا نہ تو وہ کسی سفر پر جاتا، نہ کوئی عزم کرتا اور نہ کسی کام کو شروع ہی کرتا جب تک وہ کسی نہ کسی نجومی سے مشورہ نہ کر لیتا۔

(۳) دربار کے ضوابط

عوام میں شہنشاہ کی آمد!

سورج کے نمودار ہونے کے وقت بادشاہ اپنے

محل کے جھروکے پر آتا جس کا رخ مشرق کی سمت تھا۔ وہ جھروکہ زمین سے سات یا آٹھ فٹ کی اونچائی پر تھا۔ ناظرین بڑی ایک تعداد میں وہاں جمع ہوتے " بالخصوص اعلیٰ طبقہ لوگ "، حاضرین " بادشاہ سلامت " کا نعرہ بلند کرتے۔ پہلے کے مقام کی طرح دوپہر کو وہ کسی دوسری جگہ ظاہر ہوتا لیکن وہ جگہ جنوب کی سمت واقع تھی۔ سورج غروب ہونے سے پہلے اسی طرح کے ایک مقام پر، جو اس کے محل یا خیمے کے مغرب میں واقع تھا وہ پھر ظاہر ہوتا۔ اس کے بعد وہ محل کے اندر چلا جاتا۔

ٹیری رقمطراز ہے کہ " ان دونوں موقعوں پر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے بہت بڑی تعداد میں لوگ جمع ہوا کرتے تھے۔ ان تینوں موقعوں میں سے کسی ایک موقع پر وہ شخص جسے بادشاہ کی خدمت میں کوئی عرضی پیش کرنی ہوتی تھی یا اس سے انصاف کا طالب ہے، چاہے وہ غریب ہو یا امیر۔ اگر وہ اپنی عرضی اتنی اونچائی سے دکھاتا کہ اسے دیکھ لیا جاتا تو اس کی سماعت کی جائے گی اور اس کا جواب دے دیا جائے گا "

رات کو ۷ اور ۹ بجے کے درمیان شہنشاہ محل میں آتا تھا۔

شہنشاہ کی زبان سے جو الفاظ نکلتے انہیں قلم بند کر لیا جاتا :

جب وہ عوام میں بولتا تھا تو ایسا کوئی لفظ نہیں تھا جو وہ کہتا تھا، اسے اس کے ارد گرد کھڑے لوگ قلم بند نہ کر لیتے ہوں۔

نوروز کا جشن :

انگریزی تقویم کے مطابق یہ جشن ۱۰ مارچ کو منایا جاتا تھا اور یہ جشن متواتر ۹ دنوں تک منایا جاتا تھا۔ تمام امراء، بڑی شان وشوکت سے دربار میں حاضر ہوتے۔ بادشاہ کی خدمت میں تحفے پیش کرتے اور اس کے بدلے میں کچھ پاتے ٹیری نے لکھا ہے : " اس کی خدمت میں حاضر ہونے کی وجہ سے مجھے سونے، موتیوں، بیش بہا پتھروں، جواہرات اور دوسری بہت سی چمکیلی چیزوں کی شکل میں بے حد اور نا قابل یقین صورت میں بہت بڑی دولت کے دیکھنے

کا موقع ملا جو میرے لئے باعث حیرت تھی۔ اگر بادشاہ سفر پر بھی ہوتا تو بھی یہ جشن پڑاؤ میں منایا جاتا۔

بادشاہ کو وزن کرنے کی رسم:

شاہی محل یا خیمے" میں یہ رسم ادا کی جاتی تھی جس میں مخصوص لوگوں کو ہی شرکت کی اجازت ہوئی تھی۔ اس کے وزن کرنے کے ترازو کے پلڑوں پر طلائی پتر چڑھے ہوتے تھے اور جس لٹھے پر وہ ترازو سدھا ہوتا تھا وہ بھی طلائی ہوتا تھا اور طلا زنجیروں سے وہ پلڑے بندھے ہوتے تھے۔ ایک پلڑے میں بادشاہ کو بٹھا دیا جاتا اور اسے پہلے چاندی سے تولا جاتا تھا۔ اس کے فوراً بعد اس چاندی کو غربا میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ وہاں کے لوگوں کے بیان کے مطابق بادشاہ کو سونے اور جواہرات سے بھی تولا جاتا تھا۔ لیکن میں نے یہ دیکھا کہ متعدد چیزوں سے بھرے ہوئے چاندی کے تین بوروں کو دوسرے پلڑے میں رکھ کر اسے تولا گیا" حکام اس کے وزن کا بالکل صحیح حساب رکھتے تھے۔

اس طرح تولے جانے کے بعد وہ حاضرین میں چاندی اور کچھ سونے کے پتلے ٹکڑے جو اس ملک کے پھولوں کی طرح ان میں سے بعض لونگوں کی شکل کے، بعض جائفلوں کی شکل کے بنے ہوئے تھے لیکن بہت پتلے اور اندر سے کھوکھلے ہوتے تھے، لٹایا کرتا تھا اس کے بعد اپنے امیروں کے ساتھ وہ شراب نوشی کیا کرتا تھا۔

آئین ضبطی:

مغلیہ سلطنت میں کسی منصبدار کا بیٹا نہ تو اس کے خطاب کو حاصل کر سکتا تھا اور نہ ہی اس کی دولت سے لطف اندوز ہو سکتا تھا۔ ایک منصبدار کی وفات پر بادشاہ اس کی ساری جائداد کو اپنے قبضے میں لے لیتا تھا اور اس کے بچوں کی گذر بسر کے لئے وظیفے مقرر کر دیتا تھا۔

عدل و انصاف :

اس کے قریب ہونے والے اہم معاملات کے تصفیے کے لئے بادشاہ بذاتِ خود ایک منصف کے فرائض انجام دیتا تھا۔ ٹیری نے لکھا ہے!

" وہاں ایسے مجرم نہیں تھے جنہیں ایک رات سے زیادہ جیل میں رکھنا پڑتا تھا اور بہت سے موقعوں پر انہیں چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اگر فریق ثانی اس موقع پر موجود ہوتا تو مجرم کے بارے میں فیصلہ فوراً سنا دیا جاتا، یا تو سزا ہو جاتی یا رہا کر دیا جاتا۔

اگر کسی مجرم کو کوڑے لگوانے کی سزا دی جاتی تو اسے زیادہ زور سے کوڑے لگوائے جاتے۔ اگر اسے موت کی سزا دی جاتی تو اسے بازار میں لے جاکر پھانسی دی جاتی۔ چوری اور قتل کی سزا موت تھی۔ بادشاہ چاہے جس شکل میں یہ سزا دے۔ بعض کو پھانسی دی جاتی۔ چوری اور قتل کی سزا موت تھی، بادشاہ چاہے جس شکل میں یہ سزا دے۔ بعض کو پھانسی دیدی جاتی، بعض کی گردن اڑا دی جاتی یا اس کے جسم پر میخیں ٹھونک کر اسے ہلاک کر دیا جاتا، بعض کو بہت نوکیلی کھونٹیوں پر بٹھا دیا جاتا۔ شدید جسمانی اذیت اور تعذیب دینے والا یہ ایک آلہ تھا یا درندے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا۔ مجرموں کو ہاتھیوں کے پیروں سے کچلوا کر یا سانپوں سے کٹوا کر ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ اس کام کے لئے ہاتھیوں کی خصوصی طور پر تربیت کی جاتی تھی۔ جب مہاوت اسے مجرم کو مار ڈالنے کا حکم دیتا تو وہ مجرم جو اس کے سامنے پٹ لیٹا ہوتا، اسے وہ پیروں سے کچل کر مار ڈالتا۔ اگر اذیتوں سے مجرم کو مار ڈالنے کا اسے حکم دیا جاتا تو وہ ایک ایک کرکے اس کی ہڈیاں توڑ ڈالتا۔ سب سے پہلے اس کے پیر، پھر ٹانگیں اور آخر میں اس کے ہاتھ مجرم کو سسک سسک کر مرنے کے لئے اسی حالت میں چھوڑ دیا جاتا۔

ٹیری نے دو مجرموں کو سزائے موت دیئے جانے کی دو مثالیں نقل کی ہیں ایک نے اپنے باپ اور دوسرے نے اپنی ماں کو مار ڈالا تھا۔ باپ کے قاتل مجرم کی ایڑیاں کس کر زنجیروں سے باندھ دی گئی تھیں۔ اسے ایک ہاتھی کے پچھلے پیروں سے باندھ دیا گیا تھا۔ اسے گھسیٹنے کے لئے اس جانور کو اشارہ کیا گیا۔ اور وہ اس مجرم کو دس میل تک

گھسیٹ کرلے گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا گوشت کٹ کٹ کے ہو گیا۔ جب ٹیپو نے بقیہ حصہ دیکھا تو محض ہڈیوں کا ڈھانچہ باقی رہ گیا تھا۔ ماں کے مارنے والے کے سزا
ایک بازی گر کو بلوایا گیا جو زہریلے سانپ پالتا تھا۔ کپڑے اتروا کر مجرم کو ننگا کر دیا گیا
اور اس سانپیرے نے دو سانپوں کو ان کی جانگھوں کو کاٹنے کے لئے چھوڑ دیا۔ ۱۵ منٹ میں
تمام قصہ ختم ہو گیا۔ اس مجرم نے اس بات کی شکایت کی کہ بہت سی آگ کی وجہ سے اس کے پیر جل
رہے ہیں،" اس کا سارا جسم سوج گیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ مردہ پڑا تھا۔

صوبہ داروں کا جلدی تبادلہ!

بہت دنوں تک کسی ایک صوبہ دار کو ایک جگہ پر کام نہیں کرنے دیا جاتا تھا۔" ان کی شہرت کو کم کرنے کی غرض سے پہلی جگہ سے کہیں دور دوسری جگہ تبادلہ کر دیا جاتا تھا۔"

شاہی فرمان کا احترام!

صوبہ دار لوگ اس کے فرمانوں کا اس طرح احترام کیا کرتے تھے۔ جیسے کہ بادشاہ بذاتِ خود وہاں موجود ہو۔ اس بات کی خبر پاتے ہی کہ کوئی فرمان آرہا تھا تو ایک صوبہ دار پیغامبر کا خیر مقدم کرنے کے لئے دوسرے ادنیٰ عہدہ داروں کو ساتھ لے کر گھوڑے پر سوار ہو کر آگے جاتا تھا۔ جوں ہی وہ اسے دیکھتا تینوں ہی وہ گھوڑے سے نیچے اتر آتا۔ " زمین پر دراز ہو جاتا" اور اس فرمان کو ہاتھ میں لے کر اپنے سر پر رکھ لیتا " اس کے بعد وہ اپنے دفتر واپس آتا اور اسے پڑھتا۔ اس خط کا جواب " بڑی احتیاط اور سوچ سمجھ کر دیا جاتا۔"

دربار میں موت کا ذکر نہ کیا جاتا!

نہ تو کوئی شخص دربار میں نیلا لباس پہن کر آتا اور نہ ہی کوئی نیلا کپڑا پہن سکتا، اور نہ کسی وقت بادشاہ کے روبرو موت کا ذکر کیا جاتا۔ اگر کسی شخص کی موت واقع ہو جاتی تو

وہ لوگ یہ کہتے کہ "اس یا فلاں شخص نے اعلیٰ حضرت کے قدموں پر خود کو قربان کر دیا۔"

چاندی کو برآمد کرنے پر سزا دی جاتی تھی:

چاندی کی کانیں سلطنت میں پائی جاتی تھیں لیکن اس کی کھدائی نہیں کرائی جاتی تھی۔ ٹیری نے لکھا ہے: "جس طرح ساری ندیاں جاکر ایک سمندر میں گر جاتی ہیں۔ اسی طرح چاندی کے بہت سے نالے بہہ کر اس کی سلطنت میں آتے ہیں۔ اور یہیں رک جاتے ہیں" تمام اقوام کے ان لوگوں کا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ جو سونے کی سلاخیں لے کر یہاں آتے تھے اور یہاں سے تجارتی سامان لے جاتے تھے۔ لیکن یہاں سے کسی مقدار میں بھی چاندی کو کسی دوسرے ملک لے جانے کو ایک جرم سمجھا جاتا تھا۔ جس کا جواب دینا آسان نہیں ہے" تمام اقوام کے مسافروں کی تجارت کرنے کے لئے بہت ہمت افزائی کی جاتی تھی لیکن انھیں اس ملک سے تھوڑی سی بھی چاندی باہر لے جانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔

ملک میں مروّجہ سکّے:

سونے چاندی کی جو سلاخیں اس ملک میں لائی جاتی تھیں، انھیں پگھلایا جاتا، صاف کیا جاتا اور مغلوں کی ان پر مہر ثبت کر دی جاتی۔ ٹیری نے لکھا ہے کہ! دنیا کے کسی دوسرے خطّے کے مقابلے میں۔ یہاں کے سکّے بہت زیادہ خالص ہوتے ہیں" سکّوں کو روپیہ کہا جاتا تھا۔ ان میں قسم قسم کے سکّے ہوتے تھے" سب سے چھوٹا" سکہ ۲ شلنگ ۳ پینس کے برابر تھا اور سب سے بڑا سکّہ دو شلنگ ۹ پینس کے برابر۔ اس ملک کے لوگ اپنی ملکیت کی قیمت انہی کی بنیاد پر لگایا کرتے تھے اور انہیں سے لین دین کرتے تھے۔ گجرات میں کم قیمت ایک سکّہ مروّج تھا جو "محمودی" کہلاتا تھا جو ۱۲ پونڈ کے برابر ہوتا تھا۔ تانبے اور پیتل کے چھوٹے سکّے بھی چلتے تھے۔ چاندی کے گول یا مربع ہوتے تھے لیکن" بہت موٹے" نہ انھیں توڑا جا سکتا تھا اور نہ وہ گھستے تھے۔ سونے کے "بڑی قیمت" کے سکّے بھی چلتے تھے لیکن عام طور پر عوام میں دکھائی نہیں دیتے تھے۔"　(باقی آئندہ)

وفیات

خطاطی کی دنیا کے ممتاز و عظیم فنکار جناب خلیق ٹونکی جون ۱۹۹۴ء میں طویل علالت کے بعد رحلت فرماگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم خلیق ٹونکی فن خطاطی میں اعلیٰ شہرت کے مالک تھے اس کے علاوہ مرحوم میں بڑی خوبیاں تھیں، صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے منکسر المزاج تھے اخلاق کریمانہ کے مالک تھے۔ اور مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے شیدائی اور معتقد تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے ان کے فن کو نکھارنے میں بڑا تعاون کیا۔ ادارہ ندوۃ المصنفین اور اس کے رسالے "برہان" ہی سے انہوں نے فن کتابت کی ابتداء کی۔ قبلہ مفتی صاحبؒ نے ادارہ ندوۃ المصنفین اور اس کے رسالے "برہان" کے لئے کتابت وطباعت میں ہمیشہ ہی اعلیٰ معیار کو برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔ اسی لئے انہوں نے ہندوستان کے اعلیٰ فنکاروں کو کھوج کھوج کر چن چن کر ادارہ میں جمع کیا۔ جناب آل حسنؒ، جناب محمد یوسفؒ، جناب عبدالقیومؒ اور خلیق ٹونکی کو بحیثیت کاتب کے ادارہ ندوۃ المصنفین میں رکھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے خلیق ٹونکی کتابت کی دنیا میں شہرت کی بلندی پر پہنچے سرکاری ایوارڈ بھی انہیں حاصل ہوئے ملک اور بیرون ملک میں انکے ہزاروں شاگرد موجود ہیں۔ ادارہ ندوۃ المصنفین کی کئی کتابیں ان ہی کی کتابت کی ہوئی ہیں۔ ادارہ کی مشہور کتابیں مصباح اللغات اور قصص القرآن جناب خلیق ٹونکی ہی کی کتابت کی ہوئی ہیں۔

انہیں ہمیشہ ہی اس بات کا اعتراف رہا کہ ان کی کامیابی وشہرت میں بفضل خدا حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ اور ان کے ادارہ ندوۃ المصنفین کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اسی لئے وہ ہمیشہ ہی ادارہ ندوۃ المصنفین اور اسکے ڈائرکٹر راقم الحروف عمید الرحمٰن عثمانی سے زندگی کے آخری لمحے تک والہانہ لگاؤ وعقیدت رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ "آمین ثم آمین" اور ادارہ ندوۃ المصنفین اور رسالہ برہان ان کی رحلت پر اظہار تعزیت کرتا ہے۔ (ادارہ)

برہان

جلد ۱۱۴ | اگست ۱۹۹۴ء مطابق ربیع الاول ۱۴۱۵ھ | شمارہ ۳

عمید الرحمن عثمانی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

نظرات

اس خبر کو پڑھ کر ہر مسلمان کو مسرت و خوشی ہوگی کہ گذشتہ دنوں رابطہ عالم اسلامی کے مرکزی دفتر مکہ معظمہ میں عالمی کونسل برائے فلاحی امور کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں سعودی وزیر اوقاف واسلامی امور ڈاکٹر عبداللہ ترکی، رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر احمد محمد علی ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر مانع حماد کے علاوہ مصر وکویت اور لندن کی بعض اسلامی تنظیموں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اور اس میں طے پایا کہ مغربی ملکوں میں رہنے والی مسلم اقلیت کے مسائل، حالات اور مشکلات کو جاننے اور سمجھنے کے لئے آئندہ موسم خریف میں ایک عالمی کانفرنس کسی مغربی ملک میں منعقد کی جائے۔ فی الحال اس کانفرنس کی تیاری کا کام رابطہ عالم اسلامی مرکز لندن ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ ریاض، مصری وزارت اوقاف، عالمی اسلامی کونسل برائے فلاحی امور کویت اسلامی کانفرنس کراچی، جمعیۃ العلماء لندن اور کویت میں قائم افریقی ممالک سے متعلق ایک کمیٹی کے سپرد کیا گیا ہے۔

یہ بڑی اہم ضرورت کو محسوس کیا گیا ہے۔ مغربی ممالک میں مسلمانوں کی اقتصادی ومعاشرتی حالت کے جائزہ کے لئے اس طرح کے اقدامات قابل ستائش ہیں۔ بلکہ ہم یہ کہیں گے کہ اس ضرورت کی طرف اس سے پہلے توجہ کیوں نہیں دی گئی۔ مغربی ممالک میں تعلیم یافتہ اور قابل مسلمانوں کی بڑی تعداد کاروباری مقصد اور روزگار کی ضرورت کے لئے معہ اہل وعیال مقیم ہے۔ اب ان کی مذہبی حالت ایسے ماحول میں جہاں نہ مسلم کلچر موجود ہے اور نہ ہی کوئی مسجد و مکتب، ایسی صورتحال کی موجودگی میں ان کے بچے اپنی تعلیم ودینی ماحول سے ناواقف ہی رہیں گے۔ ماں باپ جو اپنے مسلم ممالک کے ماحول میں پیدا ہوئے تھے اور جنھیں اپنے مذہبی خاندان و ماحول سے ماں باپ سے جو کچھ حاصل ہوا تھا وہ مغربی ممالک کی تیز رفتار زندگی میں اتنا وقت ہی نہیں نکال پائیں گے۔ جس سے وہ اپنے بچوں کی مذہبی زندگی بنا و سنوار سکیں۔ اس صورتحال کی موجودگی میں یہ خبر

تمام دینی حلقوں میں مسرت وانبساط کے ساتھ باعث خیر مقدم ہی ہے۔
اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی بڑی ہی اطمینان بخش سنائی گئی ہے کہ بوسنیائی اور صومالی عوام کی مدد کے لئے سعودی عرب میں قائم اعلیٰ طاقتی کمیٹی نے جس کا صدر دفتر ریاض میں ہے اسکے ترجمان کے مطابق بوسنیائی عوام کی مدد کے لئے صرف اس کمیٹی نے اب تک ۶۲ کروڑ ۵۰ لاکھ ریال بوسنیائی عوام کو بھیجے ہیں۔ کمیٹی نے صومالی عوام کو بھی ۵۰ کروڑ ریال کی امداد روانہ کی ہے کمیٹی کے ترجمان نے اس سلسلے میں بتایا کہ یہ نقد امداد اس امدادی سامان کے علاوہ ہے جس میں خوراک دوائیں اور کپڑے شامل ہیں۔

اب تک عیسائی تنظیموں کی طرف سے تو ہم نے انسانی فلاح وبہبود اور امداد کے واقعات سنے اور پڑھے تھے۔ اور مسلمانوں سے متعلق اس قسم کے واقعات سننے کے لئے ترستے تھے تڑپتے تھے اب خدا کا شکر ہے کہ مسلمانوں کو اس ضمن میں اقدامات کرنے کا ہوش آیا ہے اور وہ اپنے مال ودولت سے عالم انسانیت کی خدمت کی طرف بھی مائل ومستعد عمل ہیں۔

دنیائے اسلام سے متعلق جناب پروفیسر محمد یونس نگرامی نے اپنے معلوماتی مضمون میں یہ مژدہ بھی سنایا ہے کہ امریکہ میں وہ مسلمان جو امریکی افواج سے منسلک ہیں ان کو اب رمضان شریف کے مہینے میں خصوصی رعائتیں حاصل ہوں گی تاکہ وہ افطار، تراویح اطمینان وآرام کے ساتھ ادا کرسکیں اور فوجی مشقوں میں بھی ان کے ساتھ آسانی برتی جائے گی تاکہ روزہ ان پر گراں نہ بن سکے ان مسلمان فوجیوں کو عید کی خصوصی رخصت بھی دی جایا کرے گی۔ کاش! یہ خبر ہندوستان کی سیکولر حکومت کے کان کھولنے کا بھی باعث بن جائے تاکہ وہ مسلمان فوجیوں کی جمعہ کی نماز کے لئے خصوصی رعایت بحال کرنے کی طرف ملتفت ہو جائے۔ اور پھر اس کے بعد انشاء اللہ امریکہ کی طرح ہندوستان کے مسلمان فوجیوں کو بھی رمضان المبارک اور عید کے لئے سہولتیں مہیا ہو جائیں گی۔

مسلمانوں کو اس طرف خود ہی توجہ مرکوز کرنی چاہیئے تھی جس کی طرف قاہرہ میں متعین برطانی سفیر نے توجہ دلانے کی کوشش کی ہے کہ اسلام سے متعلق مغربی دنیا میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں ان کو دور کیا جانا چاہیئے برطانی سفیر کا کہنا تھا کہ خود برطانیہ کے عوام اسلامی تعلیمات

وعقائد اور اسلام کی کشادہ ذہنی اور روشن ضمیری سے بالکل ناواقف ہیں۔ اسلامی اسپین کے قرض کی ادائیگی سے یورپ قاصر ہے اور سائنس فلکیات، ریاضیات، قانون، تاریخ طب دواسازی، فن تعمیر و زراعت کے میدان میں اسلامی اسپین کے احسانوں سے یورپ گراں بار ہے اور صحیح بات تو یہ ہے کہ یوروپ کا ماضی اور حال اسلامی تہذیب و ثقافت کا ہی ایک اہم حصہ ہے۔ برطانی سفیر نے انکشاف کیا کہ وہ جلد ہی قاہرہ میں ایک ایسی نمائش کا اہتمام کریں گے جس میں برطانیہ میں اسلامی وجود کی پوری پوری عکاسی ہوگی۔

واقعی یہ خوشی کی بات ہے کہ رابطہ عالم اسلامی کی کوششوں سے مغربی ممالک کے دانشوروں کو اسلامی تہذیب و ثقافت کی خوبیوں کو سمجھنے اور اس کا برملا اعتراف کرنے کا موقع ملا۔

آج اسپین میں اسلامی اسپین کو یاد کیا جانے لگا ہے اور اس کی آواز یورپ میں بھی گونجنے لگی ہے اور بعید نہیں اللہ تعالیٰ ایک وقت ایسا بھی لے آئے جب اسپین ہی نہیں یورپ کے تمام ممالک نہ صرف اسلام کی خوبیوں ہی کے معترف ہو جائیں بلکہ حلقہ بگوش اسلام بھی ہو جائیں۔ عالم اسلام کی عرصہ سے چلی آرہی اس تشویش میں بھی کمی آ جائے گی یہ خبر پڑھ کر کہ جدہ کے اسلامی بندرگاہ سے گزشتہ ہفتہ ایک بحری جہاز قربانی کے ۱۲۰۱۵ جانوروں کا گوشت لے کر سوڈان روانہ ہو گیا ہے جہاں یہ سوڈانی عوام میں مفت تقسیم کر دیا جائے گا اس سے پہلے ۵۵ ہزار جانوروں کا گوشت بنگلہ دیش ۵ ہزار سوڈان، ۵ ہزار چاڈ ۲۰، ہزار پشاور اور کوئٹہ، ایک ہزار دو سو شام اور ۳۰ ہزار قربانیوں کا گوشت اردن بھیجا جا چکا ہے اور اس طرح سے ابتک حج کے موقع پر کی گئی قربانیوں کا گوشت ۲۳ ملکوں کو بھیجا جا چکا ہے حج کے دوران کی جانے والی قربانیوں کا گوشت منصوبہ بند طریقے سے ۱۹۸۲ء سے ضرورت مند افراد کو بھیجا جا رہا ہے اس منصوبہ کی تیاری میں سعودی عرب وزارت مالیات، دارالافتاء اسلامی ترقیاتی بینک کے علاوہ مکہ معظمہ کے کارپوریشن نے حصہ لیا تھا ۱۴۰۲ء میں بیس ہزار قربانیوں

کا گوشت سوڈان پاکستان وغیرہ بھیجا گیا ۱۴۰۴ھ میں ایک لاکھ ۸۶ ہزار ۱۴۰۵ھ میں تین لاکھ سات ہزار ۱۴۰۶ھ میں ۳ لاکھ پچاس ہزار ۱۴۰۷ھ میں چار لاکھ ۸۷ ہزار ۱۴۰۸ھ میں چار لاکھ ۲۳ ہزار ۱۴۰۹ھ میں پانچ لاکھ قربانیوں کا گوشت ضرورت مند ملکوں کو بھیجا گیا۔ اور اب تک یہ تعداد دس لاکھ جانوروں کے گوشت تک پہنچ گئی ہے جس سے ایشیا اور افریقہ کے ۲۴ ملکوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔

دیر آید درست آید شاید اسی موقع پر کہنے کے لئے مناسب ہوگا۔ رابطہ عالم اسلامی نے جو بھی اس سلسلے میں اقدامات کرنے شروع کئے ہیں وہ تمام عالم اسلامی کی طرف سے ستائش کے قابل ہیں۔ مسلم ممالک کو اس طرف متوجہ کرنے کے لئے سعودی عرب کی شاہی حکومت کی مساعی جمیلہ واقعی قابل داد ہیں اور تمام اہل اسلام کی طرف سے بجا طور پر لائق شکریہ ہیں۔

جولائی ۱۹۹۴ء کے آخری عشرہ میں شہر دہلی اور اس کے مضافات میں زلزلے کے زبردست جھٹکے محسوس ہوئے، پرانی دہلی کے اکثر علاقوں کے مکانات کی دیواروں میں شگاف پڑے اور ایک آدھ مکان شاید گر بھی گیا مگر اس کے باوجود کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ اور سب سے اہم واقعہ تو جامع مسجد شاہجہانی کے ایک برجی نما کنگرہ کا ہے جامع مسجد کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ رونما ہوا ہے۔ نماز مغرب ختم ہو رہی تھی کہ یہ زلزلہ چند ہی سکنڈوں میں قیامت برپا کر گیا۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ملاحظہ کیجئے کہ جس جگہ یہ برجی نما کنگرہ جسکا وزن ڈیڑھ سو کیلو بتایا جاتا ہے گرا ہے وہاں اکثر لوگ ذکر و اشغال میں مشغول رہتے ہیں لیکن اس وقت کوئی نہ تھا، ورنہ جانی نقصان کا اندازہ لگانا ہی مشکل ہوتا۔

زلزلہ غافل انسانوں کی بیداری کے لئے ہوتا ہے رب العالمین بندوں کو بُرے کاموں سے بچانے اور نیک کاموں کی طرف ملتفت کرنے کے لئے زلزلہ کے ذریعہ الارم دیتا ہے اس پر بھی اگر بندۂ خدا گناہوں میں غرق یاد الٰہی سے غفلت میں مبتلا رہے تو یہ بندوں کی اپنی لائی ہوئی بدقسمتی ہے۔ اللہ تعالیٰ بندہ پر کرم کرتا ہے لیکن بندہ اس کے کرم کے حصول کی طرف راغب ہی نہیں تو اس سے زیادہ اور بدبختی بندہ کی کیا ہو سکتی ہے؟

مولانا ذوالفقار علی، حیات اور علمی کارنامے

محمد نجم خاں، ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تصنیفات و تالیفات، شروحات و حواشی:

سرزمین دیوبند اپنے علمی ادبی اور دینی کارناموں کی وجہ سے ہمیشہ ممتاز رہی ہے لہذا علماء دیوبند نے عربی ادب کے فروغ میں مختلف زبانوں کے مشہور و معروف شعراء کے شعری مجموعے اور دواوین پر حاشیے اور شروحات لکھنے میں خاصہ دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ مشہور ادبی کتابوں کے سلسلے میں جو دار العلوم میں نصاب تعلیم کا ایک جزء شمار ہوتی ہے جن میں سبعہ معلقہ، دیوان متنبی، حماسہ لابی تمام، اور مقامات حریری وغیرہ قابل ذکر کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس پیش قدمی کا مختصر سا جائزہ حوالۂ مطالعہ ہے۔

شرح قصیدہ "بانت سعاد":

تعارف شرح سے قبل بہتر یہ کہ قصیدۂ بانت سعاد کی قدرے وضاحت ہو جائے۔
شعراء مخضرمین میں سے مشہور شاعر کعب بن زہیر کی بدزبانی و گستاخی کی بناپر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مباح الدم قرار دیدیا تھا۔ ابن زہیر کو خبر ملنے پر طلب معافی کی غرض "قصیدہ بانت سعاد" تحریر کرکے خدمت اقدس میں حاضر ہو گیا۔ آپ کے روبرو قصیدہ پڑھتے ہوئے جب اس شعر پر پہنچا۔ ؎

ان الرسول لنور یستضاء بہ مُھنّد من سیوف اللہ مسلول

ترجمہ: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) منارۂ نور ہیں۔ جس سے روشنی مستعار لی جاتی ہے۔

خدا تعالیٰ کی سنتی ہوئی، ہندوستانی تلوار ہیں۔"

تو نبی پاکؐ نے سن کر اپنے جسد اطہر و منور سے چادر مبارک اتار کر اسے عنایت کردی
اس قصیدہ کی عظمت و رفعت کی بنا پر متعدد شروحات لکھی گئیں۔ قابل ذکر
شیخ ابراہیم الباجوری اور امام ابن الہمام کی شروحات ہیں؛

بنا بریں علماء ہند کے لئے مرکز توجہ رہی چنانچہ یہاں بھی اس پر حواشی و شرحیں لکھی گئیں؛ چنانچہ مولانا ذوالفقار علی دیوبندی رحمہ اللہ نے علامہ ابراہیم الباجوری کی تالیف کردہ شرح کی بغرض تلخیص عربی زبان میں تلخیص کی۔ اور اسی محقق ابن الہمام کی شرح سے استفادہ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔

- اضافی طور پر عربی مجموعہ کا اردو میں ترجمہ کیا۔
- ہر شعر کے ممکنہ مطالب و معانی کا تذکرہ کیا۔

بسا اوقات بعینہ مضمون یا مضمون سے ملتے جلتے اردو اور فارسی اشعار کا اضافہ کیا۔

- کہیں تو ایک عربی شعر کی تشریح و تعبیر میں ۵، ۵، ۶، ۷ اشعار اردو و فارسی کے دیئے گئے ہیں۔ جس سے تفہیم معانی میں آسانی اور شارح کے عبور اور متعدد زبانوں پہ دسترس کا پتہ چلتا ہے۔ قاری کے لئے بھی سامانِ دلچسپی فراہم ہوتا ہے۔ آپ رحمہ اللہ کے اندازِ بیان کی وضاحت کے لئے ایک مثال پیش ہے۔

وعدہ و انتظار کے ذیل میں:

ولا تمسک بالوعد الذی زعمت ۔۔۔ الا کما تمسک الماء الغرابیل

"(محبوبہ) قول و قرار سے پختہ شدہ وعدے کا پاس (لحاظ) نہیں رکھتی۔ مگر اتنا ہی جتنا کہ چھلنی پانی کا خیال رکھتی ہے۔ (یعنی بالکل خیال نہیں رکھتی)"

فلا یغرنک ما منت وما وعدت ۔۔۔ ان الامانی والاحلام تضلیل

تمہیں اس کے وعدے اور اس کی لجاجت دھوکے میں نہ ڈال دے
تمہاری تمام آرزوئیں اور خواب شیریں محض ریت کا تودہ ہیں۔

کانت مواعید عرقوب[۱] لہا مثلا ۔۔۔ وما مواعیدہا الا الا باطیل

[۱] ارشاد شرح قصیدہ بانت سعاد ص ۱۷، ۲۱۰۔
عرقوب، قوم عمالقہ کا ایک شخص جو فریب و دغا میں ضرب المثل تھا۔

عرقوب کے قول و قرار اس (محبوبہ) کے وعدہ کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ اس کے وعدے (وصال) کیا ہیں، کہ جھوٹ کا پلندہ ہیں۔

شارح رحمہ اللہ نے شرحِ اشعار کی ذیل میں وضاحت معانی و مطالب کی غرض سے دو زبان اردو و فارسی کے اشعار درج کئے ہیں۔ عربی ترجمہ بایں طور کیا ہے:

یا من لہ قلب کالحجر فی القساوۃ ما جئت و قد مرضت عیناہ و تحجرت

۱۔ ہائے وہ صنم جس کا دل پتھر کی طرح سخت ہے، تو آئی نہیں اور (انتظار کرتے کرتے) میری آنکھیں بیمار ہوگئیں اور پتھرا گئیں۔

۲۔ ہائے[2] بے رحم جسے اپنے وعدہ کا ایفا ریاد نہیں رہتا، اس شدت سے تمہارا انتظار کرتا رہا کہ پوری رات دروازہ بھی بند نہ کیا۔

۳۔ محبوبہ[3] کے انتظار میں مجھے ایسی لذت محسوس ہوئی ہے جو کبھی بھی ملاقات میں نہیں ملی۔

۴۔ تم برابر در و دیوار کو تکتے جارہے ہو اس لئے کہ تمہیں محبوبہ کے انتظار میں لذت ملتی ہے۔

"انک وعدت بالسماح لی بتقبیلک مرتین"

تم نے آغاز محبت کے موقعہ پر مجھ سے دو مرتبہ بوس و کنار کا وعدہ کیا تھا، لیکن تمہارے وعدے کو اب تک ایک عرصۂ دراز بیت گیا، اور میں دونوں بوسوں سے محظوظ نہ ہو سکا۔ بلکہ ایک سے بھی لطف اندوز نہ ہو سکا۔

عربی اشعار کے ہم مثل و ہم معنیٰ اردو و فارسی کے اشعار بھی تحریر کئے گئے ہیں جو ذیل میں پیش ہیں ؎

تو نہ آیا آگئیں آنکھیں مری سنگدل پتھرا گئیں آنکھیں مری

---

[2] یا من لا یفی بوعدہ کان انتظارک انتظارا لا اقفل فیہ الباب طول اللیل۔

[3] ان اللذات التی شعرت بہا فی انتظار الحبیب ما لمستہا ابداً فی اللقاء معہ

[4] انک دائماً تنتظر الی الباب والجدار اذ انک تشعر باللذۃ فی انتظار الحبیب۔

جو مزا انتظار میں دیکھا نہ کبھی وصل یار میں دیکھا
رکھتا ہے ہر گھڑی در و دیوار پر نظر تجھ کو مزہ پڑا ہے اگر انتظار کا
گفتہ بودی کہ شوم مست و دو بوست بدہم
وعدہ از حد بشد و ماند و دیدیم و نہ یک

عطر الوردہ شرح قصیدہ بُردہ

مولانا ذو الفقار علی دیو بندی نے عطر الوردہ کے نام سے علامہ ابو عبداللہ شرف الدین البوصیری کی فالج کے زمانہ میں لکھی گئی منقبت و مدح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں قصیدۂ بردہ کی شرح لکھی ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ علامہ موصوف نے ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے جسم پر دست مبارک پھیر دیا۔ اچانک آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ان کا پورا بدن بیماریوں سے نجات پا چکا ہے۔

اس قصیدے علماء ادب و مسلمانوں کے مابین ادبی و معنوی اہمیت و مرتبت کی بنا پر علماء متقدمین و متأخرین نے متعدد شروحات تحریر کیں۔

زیر نظر شرح کے بارے میں خود شارح کی زبانی مقدمہ کے حوالے سے۔

اما بعد! زمانۂ جاہلیت کے اشعار بیکار، ولا یعنی و فرسودہ جذبات کے عکاس اشعار کی شرح و بسط میں میری عمر کا ایک طویل عرصہ ضائع ہو گیا مجھے اپنی عمر کا ان غیر مفید مشغلوں میں ضائع کر دینے کا بے انتہا افسوس و قلق تھا کہ اچانک فرمان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم "آدمی کے اسلام کی خوبیوں میں سے یہ بات بھی ہے کہ وہ لا یعنی چیزوں سے اجتناب کرے" چنانچہ میں نے اس قصیدۂ بردہ کی شرح کے لئے ہمت باندھی جس کی حیثیت علماء و صلحاء کے نزدیک بہ مثال روشن میمون و مبارک "بردہ" کی سی ہے نیز میں نے اس کا نام "عطر الوردہ فی شرح بردہ" رکھا۔

"اسلوب بیان عمدہ ودلکش ۔
شعر میں مستعمل کلمہ کی ابتداءً لغوی تحقیق ۔ موضوعہ مقام پہ لفظ کے استعمال کی حکمت
(بزبان عربی) ۔
ترجمہ ۔ اشعار کی اردو میں مکمل و تشفی بخش شرح ۔ بسا اوقات بعینہٖ شعر کا مضمون یا اس
سے ہم آہنگ اردو اور فارسی کے کئی کئی شعر درج کیے گئے ہیں ۔
ان اشعار پر توجہ خاص دی گئی ہے جن سے غزواتِ نبی کریمؐ کی طرف اشارہ کیا گیا
ہے ، بایں طور کہ تاریخی حیثیت سے ان غزوات کی تفصیل کردی ہے ۔
درحقیقت عطر الوردہ دو شرحوں کی حیثیت رکھتی ہے ایک بزبانِ عربی اور دوسری
بزبان اردو ، مولانا ذوالفقار علیؒ نے اس شرح کے لکھنے میں ملا عبد الغنی القرا باغی کی شرح
سے استفادہ کیا ہے ۔

دورانِ شرح ملحوظ اسلوب وطرز اور خصوصیات کی ایک جھلک ۔

یا لائمی فی الھوی العذری معذرۃ   منی الیک و لو انصفت لم تلم

العذریٰ ! بنو عذرہ کی جانب منسوب ہے ۔ بنو عذرہ یمن کا ایک قبیلہ ہے جس کے افراد
شدتِ عشق میں مشہور ہیں ۔ ان کی عمریں عموماً دیوانگیٔ عشق کی وجہ سے تیس سال سے تجاوز
نہیں ہوتی تھیں ۔ قبیلہ عذری سے اس کا سبب دریافت کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ ہمارے
دل گداز اور نرم ہوتے ہیں ۔ اور ہماری مستورات میں حسن و عصمت کی کثرت ، بقول بعض ہویٰ
سے عذریٰ مراد ہے ۔
"الھویٰ" جس میں انسان مجبور محض ہوجائے ، اور اختیارات کھو بیٹھے ۔
"معذرۃً" فعل مکررہ کی وجہ سے منصوب ہے ۔ یعنی میری معذرت قبول فرمائیے جو
آپ سے کررہا ہوں ۔ پورا جملہ جواب ندا ہے ، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جواب ندا ، شاعر کا قول
"محضتنی النصح" جو اگلے تیسرے شعر میں ہے ۔ جب کہ دونوں کے درمیان بہت زیادہ فصل ہے ۔
ایسے ہی آپ 'الیک' کو اسم فعل مان کر "العد" کے معنی میں لے لیں یعنی مجھ سے دور ہو اور میری ملامت

کرنے سے باز آ۔
اے میرے ملامت گر کہ درباب اسے عشق کے جو شل محبت بنی عذرہ کے ثابت و مستحکم و غیر زوال پذیر ہے۔ یا دوبارہ ایسے عشق کے جس کا عذر ظاہر اور قابل قبول ہے۔
مجھکو ملامت کرتا ہے میری بے اختیاری پر لحاظ کرکے وہ عذر جو تیرے روبرو عرض کرتا ہوں، قبول فرما، یا مجھ سے دور ہو اور ایسے امر کی مجھکو تکلیف مالا یطاق نہ دے جس کے ترک کی مجھکو قدرت نہیں ہے۔ اور اگر تو انصاف کیش ہوتا تو سرے سے مجھکو ملامت نہ کرتا۔ مگر کیا کیجیے کہ مجھکو ظالم سے پالا پڑا ہے۔

التعلیقات علی السبع المعلقات (شرح سبعہ معلقہ)

علماء متقدمین و متاخرین کی ہمیشہ اس کتاب سے دلچسپی رہی ہے بنابریں متقدمین میں ابو عبداللہ الحسین ابن احمد الزوزنی، عبدالرحیم الصفی پوری، شیخ عبدالاول الجونپوری، اور شیخ ابو الحسن نے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔
لیکن ان شروحات کا انداز بیان مخصوص اور مطالب محدود ہونے کی وجہ سے علماء دارالعلوم دیوبند کے لئے ہمیشہ باعث تشویش رہی۔ چنانچہ علماء متقدمین کی شروحات سے استفادہ کرتے ہوئے حالات حاضرہ کے لحاظ سے اضافی صورت کے ساتھ کوئی شرح لکھے جانے کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ مولانا ذوالفقار علی صاحب نے "التعلیقات علی السبع المعلقات" کے نام سے شرح لکھی۔ خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔
• حل لغات • محاورات کی اپنے مخصوص انداز بیان کے ذریعہ تحقیق • ترجمہ بزبان اردو تشریح • ایجاز و اطناب کے مابین انداز • اردو اور عربی دو زبانوں میں شرح گردانی جاسکتی ہے • حل لغات و تشریح محاورات میں علامہ ابو عبداللہ الحسینی الزوزنی پر تکیہ کیا ہے۔ اسباب تالیف کے ذیل میں شارح رقمطراز ہیں کہ:
جس چیز نے مجھے زمانہ جاہلیت کے اشعار کی شرح کرنے پر آمادہ کیا۔ وہ صاحب کشاف اور بیضاوی کے سورۂ نحل کے ذیل میں درج وہ روایت ہے جو امیر المؤمنین سیدنا عمر بن الخطاب رض

سے مروی ہے کہ آپ نے منبر پر کھڑے ہوکر مجمع عام میں تقریر کے دوران باری تعالیٰ کا ارشاد " اذ یأخذہم علیٰ تخوف " کی تلاوت فرماکر مجمع سے دریافت فرمایا کہ آیت کریمہ میں " تخوف " کا مطلب کیا ہے ؟ تمام حضرات خاموش رہے ۔ پھر قبیلۂ ہذیل کے ایک بوڑھے کھڑے ہوئے اور کہا کہ ہماری لغت کا لفظ ہے ۔ تخوف بمعنی " تنقص " (کم کرنا) پھر آپؓ نے فرمایا کہ کیا عرب اپنے اشعار میں اسے استعمال کرتے ہیں ؟ تو بوڑھے نے کہا جی ہاں ہمارا ایک شاعر ابو کبیر اپنی اونٹنی کی تعریف اس طرح کرتا ہے !

تخوف الرحل منها تامکا قردا

کما تخوف عود النبعة السفن

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ علیکم بدیوانکم لا تضلوا قالوا وما دیواننا ؟ قال رضی اللہ عنہ شعر الجاهلیة، فان فیه تفسیر کتابکم و معانی کلامکم[1] کہ اگر آپ سبھی حضرات دیوان کو اپنے اوپر لازم کرلیں تو گمراہ نہیں ہوسکتے ۔ مجمع نے دریافت کیا کہ ہمارا دیوان کیا ہے ؟ آپ نے فرمایا زمانۂ جاہلیت کے اشعار اس لئے کہ اس میں تمہاری کتاب (قرآن) کی تفسیر اور تمہارے کلام (قرآن) کے مفہوم ہیں ۔"

مولانا ذوالفقار علی[2] نے معلقہ میں جو اسلوب بیان و طرز نگارش اپنایا ہے

هل غادر الشعراء من متردم

أم هل عرفت الدار بعد توهم

ترجمہ :- کیا شعراء سابقین نے پیوند کاری کے لئے کوئی جگہ چھوڑی ہے ۔ یا تو نے محبوب کے گھر کو بہت شک و شبہ کے بعد پہچانا ہے ۔

المتردم (ترجمہ شارح) کیا شعراء سابقین نے کوئی جگہ قابل اصلاح مرمت و پیوند کاری چھوڑی ہے ۔ بلکہ نہیں چھوڑی ہے ۔

---

(۱) مقدمة التعلیقات علی السبع المعلقات ص ۲

(۲) التعلیقات علی السبع المعلقات ص ۹۶ ۔

خلاصہ یہ کہ پہلے شاعر سب کچھ کہہ گئے۔ شعر گوئی میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی، کہ میں اس کو پورا کروں جیساکہ روایات میں ہے۔ تو یہ ترجمہ ہوگا کہ :

" شعرائے سابقین ہر قسم کا راگ گا گئے ہیں۔ اور میرے لئے کچھ نہیں چھوڑا۔ پھر اس کلام سے عراض کرکے دوسری قسم کا کلام کرتا ہے کہ! بلکہ تو نے محبوبہ کے گھر کو بعد شک وشبہ کے پہچانا ہے۔

اس صورت میں یہ شعر دو لخت ہوگا جس کو عربی میں اقتضاب کہا جاتا ہے یعنی ایسے مضمون کی طرف انتقال کرنا جو اول کلام کے مناسب نہ ہو۔ اور شعرائے جاہلیہ میں یہ طریقہ مروج تھا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ شعر یک لخت ہو!

یہ بایں طور کہ جب شعرائے سابقین نے کوئی قسم مضمون کی متاخرین کے لئے نہیں چھوڑی تو اشتیاقِ شعر گوئی مجھ کو کیوں ہوا۔ پھر تأمل کرکے کہتا ہے کہ واقعی عذر مذکور مصرعۂ اوّل تو شعر گوئی کا باعث نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کا سببِ حقیقی یہ ہے کہ تو نے بعد غور کامل خانۂ محبوب کو اس کے نشاناتِ قدم دیکھ کر پہچانا ہے۔ اور اس سے آتشِ عشق بھڑکی ہے اور فرطِ اشتیاق کے باعث بے اختیار تیری طبیعت اپنی بھڑاس نکالنے کو شعر گوئی پر آمادہ ہوگئی ہے۔

مزید وضاحت کے لئے امرالقیس کے ایک شعر کے ذیل میں مولانا رحمہ اللہ کا اسلوب وانداز ملاحظہ ہو :

وبيضة خدر لا يرام خباءها
تمتعت من لهوبها غير معجل[1]

یعنی "بہت سی عورتیں جنہوں نے پردوں کا اہتمام کیا!

عورتوں کو بیض سے تشبیہ دی ہے، عورتوں کو تین وجوہات سے بیض سے تشبیہ دیتے ہیں: پہلی وجہ تو یہ ہے کہ عورت ابکارت زائل ہونے سے پہلے صحیح وسالم ہوتی ہے۔

---

(۱) التعليقات على السبع المعلقات ص ۹ -

دوسری توجیہ حفاظت اور پردہ ہے۔ اس لئے کہ پرندہ بھی اپنے انڈے کی حفاظت کرتا ہے۔

تیسری توجیہ یہ کہ عورت انڈے کے مانند صاف وشفاف ہوتی ہے، اس لئے کہ انڈا جب تک پرندے کے پیٹ کے نیچے ہوتا ہے نہایت پاکیزہ رنگ ہوتا ہے۔ کبھی عورت کو شتر مرغ کے انڈے سے تشبیہ دی جاتی ہے، اس لئے کہ عربوں اور رومیوں کے معاشرے میں عورتوں کے متعلق تمام رنگوں میں یہ رنگ سب سے عمدہ مانا گیا ہے۔

نیز شاعر کا قول "غیر" کو بحالت نصب پڑھا گیا ہے 'تمتعت' کی ضمیر "تا" حال مان کر اور بحالتِ جر پڑھا گیا ہے اللھویٰ کی صفت شارح کا ترجمہ!

اور بہت سی محبوبائیں، ملازم پردہ نشینی مثل بیضہ کے محفوظ اور صاف اور خون اقتصاص سے پاک ایسی ہیں کہ یہ سبب ان کی رفعتِ شان اور عزت کے ان کے خیمے کے پاس کوئی نہیں جا سکا مگر میں ان سے دیر تک ہنسی اور دلگی کرتا رہا۔

(باقی آئندہ)

تاریخ شاہجہاں ۔ ایک مطالعہ

قسط ۲

عبدالرؤف خاں ایم اے تاریخ ۔ اودئی کلاں (راجستھان)

انہیں سے کچھ الفاظ کو کاتب کی " اصلاح " کے زمرہ میں ڈالا جا سکتا ہے لیکن وہ تمام الفاظ پر اپنا دستِ تصرف دراز نہیں کر سکتا ۔ بہر حال یہ عالم تب ہے جبکہ ایک صاحب نے مسودہ پر نظر ثانی بھی فرمالی ہے یعنی:

ہر ورق پر ہے میر کی اصلاح — لوگ کہتے ہیں سہو کاتب ہے (سودا)

ص ۱۵۷ پر بحیرۂ عرب کو بحرِ عرب لکھا ہے جبکہ بحیرہ لکھنا چاہیئے جو بحر کا اسم تصغیر ہے اور بحیرۂ عرب چونکہ بحرِ ہند کا ایک حصہ ہے اس لئے اُسے بحرِ عرب نہیں کہہ سکتے ۔ کئی الفاظ کی جمع بھی خلافِ قاعدہ بنائی گئی ہے مثلاً دیباچہ ص ۲ اور ص ۶۹ پر تجویز کی جمع تجویزات ص ۷۹ پر تکلیف کی جمع تکلیفات ، ص ۱۶۰ پر پسماندہ کی جمع پسماندگوں اور ص ۱۵۸ پر تحفہ کی جمع تحفہ جات بنائی ہے جنہیں ہم تعریف کاتب نہیں کہہ سکتے ۔ ظاہر ہے کہ ان الفاظ کی جمع علی الترتیب تجاویز ، تکالیف ، پسماندگان اور تحائف ہونا چاہیئے ۔ افغان قبیلہ خطک یا خٹک کو چونکہ " کھٹک " لکھا ہے اس لئے اس کی جمع بھی " بے کھٹکے " کھٹکوں لکھی ہے جسے پڑھ کر صحیح صورت حال سے واقف قاری زیر لب مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ لیکن اس سے زیادہ حیرت افزا بات یہ ہے کہ کچھ الفاظ کی جمع انگریزی زبان کے قاعدہ کی رو سے بنائی ہیں شاید اس لئے کہ اردو کا دامن وسیع ہو ۔ مثلاً " land of sisodias " کا ترجمہ کرتے ہوئے راجپوت قبیلہ سسودیا کی جمع " سسودیاس " (ص ۱۵۱) لکھی ہے نیز ص ۱۹۷ پر Shahjahan's کا ترجمہ

"شاہجہاس" ہی کیا ہے یعنی انگریزی کی اضافت اردو میں رائج کردی گئی ہے۔

اکبر نے عام فوجیوں کے علاوہ کچھ مخصوص فوجی بھی بھرتی کرنا شروع کیا تھا۔ انہیں "احدی" کہتے تھے۔ بادشاہ خود ان کا تقرر کرتا تھا۔ ان کے داروغہ کو "بخشی الاحدی" کہتے تھے۔ شاہجہانی عہد میں زین العابدین داروغۂ احدی تھا۔ ڈاکٹر سکینہ صاحب نے ص ص ۶ - ۳۵ پر "Bakhshi of ahadis" لکھا ہے جس کا ترجمہ "بخشی الحدیث" (ص ۶۶) کیا ہے۔ معلوم نہیں مترجم موصوف کیا کہنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے زین العابدین کو محدث خیال کیا ہو۔ جبکہ سرجدو ناتھ سرکار نے احدی کا ترجمہ "Gentleman Troopers" کیا ہے (مغل ایڈمنسٹریشن) آجکل سست کاہل اور دھیما کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔

تاریخی کتب میں صحتِ سنین کا بطور خاص خیال رکھا جاتا ہے مگر زیر نظر ترجمہ میں اس طرف بھی توجہ مرکوز نہیں کی گئی بلکہ بے اعتنائی سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً شہزادہ سلیم و راجکماری مان متی کی شادی کا سنہ ۱۵۵۶ء بتلایا ہے (ص ۱۴) جبکہ شہزادہ کی ولادت ہی اگست ۱۵۶۹ء میں ہوئی تھی اور شادی ۱۵۸۶ء میں۔ اس کے علاوہ ص ۱۳۸ پر ۱۶۳۲ء کے بجائے ۱۶۲۳ء، ص ۱۱۰ پر ۱۶۴۲ھ کے بجائے ۱۶۴۲ء، ص ۱۷۸ پر ۱۱ فروری ۱۶۴۶ کے بجائے ۶ فروری ۱۶۴۶ء، ص ۱۶۷ پر ۱۰ مارچ کے بجائے ۳۰ مارچ اور ص ۲۷۰ پر ۱۳ اپریل کے بجائے ۳ اپریل ہونا چاہیئے۔

تاریخی کتب کے مترجم کے لئے صرف ادیب ہونا کافی نہیں بلکہ اس کی نظر متعلقہ عہد کے اقوام و ملل و قبائل اور متعلقہ حکمران کے حدود سلطنت کے جغرافیہ پر بھی ہونا ضروری ہے ورنہ قبائل و اعلام اور مقامات کو کچھ سے کچھ بنا دے گا۔ قبائل کے سلسلہ میں خطک، مسودیا وغیرہ کا املا ہم دیکھ چکے ہیں اب ذرا اسماء و اعلام پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ جنہیں راقم نے ہلالین میں درست کرتے ہوئے لکھا ہے؛

راجہ سلیوان ص ۳۴ (راجہ سالبواہن) حکیم گیلانی ص ۴۲ (حکیم علی گیلانی) محمد صالح کنبوح ص ۶۵ (کنبوہ) سعید حسن کمبوہ ص ۱۱۷ (کمونا) مراد بدخشانی ص ۲، (... بدخشی) راؤ رتن مادا ص ۳۷، نیز ہادا ص ۷۷، (راؤ رتن ہاڈا) بالسفر ص ۸۰، بائسنگر ص ۱۱۳، باسنقر ص ۱۲۷ اور ایک صفحہ پر بائسقر (بالسنغر) تیمورث ص ۸۶ (طہمورث) نہر خاں ص ۸۱ (ناہر خاں) خانِ زبال ص ۹۰ (خانِ زماں)

بہلول میانی ص ۹۱ (بہلول میانہ) خانِ اعظم ص ۹۲ (اعظم خاں) شائستہ خاں ص ۳۸ (شائستہ خاں) کوئی شاعر رائے ص ۹۸، کوئی رائے ص ۱۰۶، ۱۰۷ (کوی شاعر رائے) اسے بعض صفحات پر "کولی رائے" بھی رقم فرمایا ہے: جھجار سنگھ کا نام مختلف صفحات پر مختلف املا سے لکھا ہے مثلاً جھجار سنگھ جج ہار سنگھ اور جھجھار سنگھ۔ بیر دیو سنگھ ص ۱۰۴ (بیر سنگھ دیو) پریم جیت ص ۱۱۱ (وکرم جیت) خواص حاں بیجاپور کے آمر خاں ص ۱۳۳ (خواص خاں بیجاپوری "آمر") جادیو راؤ ص ۱۳۲ (جادو راؤ) ملا نفسیلئے شیرازی ص ۱۶۲ (ملا تقیائے شیرازی) شافیہ ص ۱۶۲ (شفیعائے یزدی) نذر محمد والی بدخشاں کا املا تقریباً اسی دفعہ "نظر محمد" لکھا ہے یہ سلسلہ ص ۶۹ سے شروع ہوتا ہے۔ اے خانم ص ۱۰۲ (آئے خانم، آئے ترکی زبان میں ایک مہینہ کا نام ہے) تروی خاں ص ۱۰۵ (تروی علی قطغان) نیز اصالت علی (اصالت خاں) علی مزد خاں ص ص ۱۷۷ و ۱۹۱ نیز علی مردان خاں ص ص ۱۸۵، ۱۹۴، ۲۰۵ (علی مردان) تولیبج خاں ص ص ۱۷۸ و ۲۰۶ (قلیچ خاں) اسے ایک دیگر صفحہ پر تولنج خاں بھی لکھا ہے، تولنج ایک مرض کا نام ہے۔ نوذا د (مرزا نوذر) عبدالغازی ص ۱۹۸ (ابوالغازی) فرمان قلی ص ۲۰۶ (قربان قلی) اجر وپ ص ۲۰۷ (راجہ راجروپ) عبدالرشید الطاطوی ص ۲۲۵ (عبدالرشید تھتوی یعنی صاحب فرہنگ رشیدی) کاوندر ص ۲۲۶ (کوبندر) ملا مراق ص ۲۶۴ (ملا میرک جس میں کاف تصغیر کا ہے) امر دسنگھ ص ۲۷۰ (امر سنگھ) ساقی النسار ص ۲۶۵ (ستی النسار) ناہر دل چلا ص ۲۸۱ (ناہر دل چیلا یعنی شاگرد) چنتر اخاں، سری مان ص ۲۸۶ (چتر خاں، سری من) بال منی ص ۲۹۱ (بال متی) کو یراج شیام لال داس ص ۲۹۱ ج ۲ (کوی راج شیال داس) حکیم دوانی ص ۲۹۲ (حکیم دوائی) بلوچ بین ص ۲۹۲ (بلوخ بین) مسرابندر ص ۲۳۰ (مسر بندھو) سیدلئے گیلانی ص ۳۴۳ (سیدائے گیلانی) رزق اللہ مقرب خاں ص ۳۴۸ (رزق اللہ ابن مقرب خاں) ظفر خاں ماموری ص ۸۲ (... معموری) راجہ راماں ص ۵۶ (رائے رایان) الفنٹسن ص ۵۶ (الفنسٹن) صفحہ ۲۳۱ حاشیہ نمبر ۹۹ پر جن اشخاص کی فہرست دی ہے وہ یہ ہے:-

"(۱) یاقوت صرفی (۲) ملا میر (۳) علی سلطان (۴) علی میر عمار (۵)...." اس فہرست کو یوں لکھنا چاہیے تھا:

"... (۱) یاقوت صرفی (۲) ملا میر علی (۳) سلطان علی (۴) میر عماد...." رجال کے سلسلہ میں

تفصیل طویل ضرور ہوگئی ہے مگر اسے مکمل نہیں کہہ سکتے کیوں کہ بخوف طوالت سیکڑوں اسمار ارادتاً حذف کرنے پڑے۔

اب مقامات کا حال بھی اختصاراً دیکھ لیا جائے۔

مقام دورا ہہ (نزد اجمیر) کو ایک صفحہ پر دیورائے اور ص ۳۸۳ پر دیورائی لکھا ہے یعنی تذکیر کے ساتھ تانیث بھی ضروری تھی۔ پائین گھاٹ کو ص ۸، پر بین گھاٹ ص ۹۳ پر پابن گھاٹ ص ۹۴ پر پاپن گھاٹ، ص ص ۱۴۰ / ۱۴۱ پر پیانی گھاٹ اور ص ۹۹ پر پیابن گھاٹ ارقام فرمایا ہے۔ ص ۵۹ پر کانگڑہ کو کنگڑہ، رنتھنبور کو رن تھمبنور نیز ص ۲۶۳ پر راتھنبور، کالنجر کو ص ۹۵ پر کالیسجار، گولکنڈہ کو کہیں کو لکنڈہ اور کئی صفحات پر گرلگنڈہ، چنبل ندی کو ص ۱۵ پر چمبتل، اراکان کو ص ۱۱۹ پر آرکان، بکسر کو ص ۱۲۱ پر بکسر، شولاپور ص ۱۴۶ پر شعلہ پور (آجکل ہمارے ملک میں کسی بھی شہر کو اچانک شعلہ پور میں تبدیل ہوتے دیر نہیں لگتی اب تو دیہات بھی شعلہ بننے لگے ہیں) بیدر کو دو صفحات پر "بدار" اور ص ۱۴۸ پر "بیدار"، ناندیر کو ص ۱۶۷ پر نانداز، پشاور کو ص ۱۷۸ پر پیشاور اور دوحد کو دوھات لکھا ہے۔

مترجم کا فرض ہے کہ اس کی نگاہ عصری تاریخی تصنیفات پر بھی ہونی چاہیئے یا کم از کم جس تاریخی تصنیف کا ترجمہ کیا جارہا ہے اس کے بنیادی مآخذ و مصادر کے مشمولات سے نہ سہی ان کتابوں کے ناموں سے تو واقفیت اوّل درجہ میں ضروری ہے۔ مگر زیر نظر تبصرہ اور علمی نقد میں یہ گوشہ بھی تشنۂ تکمیل ہے۔ ترجمہ میں تاریخی کتب کے ناموں کا جو مثلہ کیا گیا ہے انہیں دیکھ کر یہ یقین ہی نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ "اردو ادب کا سماجی پس منظر" اور مختصر تاریخ ادب اردو" کے فاضل مصنف کے قلم سے ہوگا۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ یہ کام ان کے شاگردوں کی ٹیم نے کیا ہے۔ بہرحال چند کتب تواریخ کا املا ملاحظہ ہو!

اختصاریہ ص ۷، کے تحت تاریخ بیجاپور "بساتین السلاطین" کا املا "بساطین السلاطین" اور اختصاریہ "بساطین" ارقام فرمایا ہے اور کسی ایک صفحہ پر بھی درست املا اختیار نہیں کیا گیا۔ ممکن ہے جن تلامذہ نے یہ کام کیا ہے ان نے اس لفظ کو "بساط" پر قیاس کیا ہو جبکہ "بُستان" کی جمع بساتین ہے۔ اسی صفحہ ۷، پر حدیقۃ السلاطین کا مخفف "حدیقات"

لکھا ہے۔ قصص الخاقانی کو "قصاص الخاقانی" اور اس کا اختصار یہ "قصاص" ثبت فرمایا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ ترجمہ کے نام پر اس تصنیف میں اردو داں طبقے کی تمناؤں کا خون جس بے دردی سے کیا گیا ہے اس کا قصاص کس سے مانگا جائے؟ ــــ ترقی اردو بورڈ اور انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ نئی دہلی سے یا مترجم سے، کوئی بتلائے کہ اس کا خون بہا کیا ہے؟!۔

قصاص خونِ تمنا کا مانگیے کس سے
گنہگار ہے کون اور خوں بہا کیا ہے

ص ۸ کالم ۱۲ پر صادق خاں کی "طبقاتِ شاہجہانی" کو طبقات شاہجہان، ص ۱۲ پر مخزنِ افاغنہ کو مخزن افغانیہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ ص ۱۳ سے ۲۸ تک ۱۶ صفحات جز بندی سے محروم ہیں یعنی اس کارِ خیر میں حسب توفیق ہر شخص نے حصہ لیا ہے۔ اس لئے اب ہم ص ۲۹ پر آتے ہیں جہاں دارا شکوہ کے منشی چندربھان برہمن کی معروف تصنیف "چہار چمن" کو "چار چمن" بنا دیا ہے۔ ص ۲۹ سے ص ۳۱۸ تک "مآثر جہانگیری" اور "مآثرالامرا" میں لفظ مآثر کو کم از کم ستر دفعہ "معاصر" رقم فرمایا ہے یعنی مآثر اور معاصر کے فرق کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا۔ ص ۴۶ پر لطائف الاخبار کو "لطیف الاخبار"، ص ۳۰۲ پر مراۃ الاحمدی یا مراۃ احمدی کو "مرۃ الاحمدی" ص ۴۲ پر شہرۂ آفاق تصنیف معجم البلدان کو "مجموعہ البلدان" ص ۲۲۵ پر منتخب اللغات شاہجہانی کو صرف "لغاتِ شاہجہانی" اور فرہنگ رشیدی کا نام اس صفحہ سے حذف کر دیا ہے۔ ص ۴۲۲ پر ملا طغرائی کی تالیف تاج المدائح کو "تاج لمدیح" لکھا ہے ممکن ہے "ال" کے الف کو کاتب نے صاف کر دیا ہو اور اس کارِ خیر سے کچھ ثواب حاصل کرنا چاہا ہو۔ مگر "مدیح" کے بارے میں کیا تاویل کی جائے جو "مدائح" کا صیغۂ واحد ہے؛ ع

یک چند اگر مدیح کنی کامراں شوی

اور دنیا میں جلب زر کا یہ کارگر نسخہ ہے۔ ص ۴۲۴ پر "شش فتح کانگڑہ" نامی تصنیف کو "شاہ فتح کانگڑہ" لکھتے ہوئے جدت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ الفاظ کے املا کی کتر بیونت کا یہ عالم اس وقت ہے جب کہ ڈاکٹر بنارسی پرساد سکسینہ نے اپنے پایاں نامہ میں جا بجا صوتی علامات (Diacritical Marks) کا خصوصی اہتمام کیا ہے تاکہ قاری عربی، فارسی اور اردو کے الفاظ

کو صحیح قرأت سے پڑھ سکے مثلاً لطائف الاخبار کو ہی لیجئے جسے سکینہ صاحب نے اس التزام کے ساتھ لکھا ہے: "laTaif ul-AAbar" (ص ۳۲۲)۔

انگریزی اور ہندی تصانیف کے ناموں میں بھی غلط املا اختیار کیا گیا ہے یا انگریزی کتابوں کے نام کا بھی ترجمہ کر دیا گیا ہے جبکہ وہ اسم معرفہ ہیں مثال کے طور پر ص ۳۲۶ ح ۱ پر سر جدو ناتھ سرکار کی تصنیف "اسٹڈیز ان مغل انڈیا" کا ترجمہ حیرت انگیز طور پر "ہندوستان کے مغلیہ کا مطالعہ" کیا ہے جو صریحاً مغالطہ آمیز ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کے ترجمہ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ص ۳۲۰ پر مسٹر فرگیوسن کی مشہور کتاب "ہسٹری آف انڈین اینڈ ایسٹرن آرکی ٹیکچر" کا ترجمہ بھی مضحک ہے یعنی "ہندوستانی اور ایشائی تعمیر کی تاریخ" "Eastern" کا ترجمہ "ایشیائی" کیسے ہو سکتا ہے؟ ص ۲۲۷ پر "برج بھاشا" کے معروف شاعر "کوی چنتامنی کی تمام کتابوں کو غلط و محرف املا سے لکھا ہے مثلاً "چھند وچار" کو "چند وچار" (چند خیال) لکھتے ہوئے ایک عجیب آمیزہ پیش کیا ہے جو اردو، ہندی کے لسانی جھگڑے کے خاتمہ کی جانب بہترین سیکولر پیش رفت ہے اور ہم آہنگی کی عمدہ مثال۔ اسی صفحہ ۲۲۷ پر "کاویہ پرکاش (.....)" کو "کوی پرکاش" اور اس کی رامائن کے کرت (कवित्त) کو "کویتا" یعنی شاعری کا، ویک (काव्यविवेक) کو "کاوے ویوک" نیز کوی کل کلپ ترو کو "کوی کل کلپت" روپ کی شکل میں تحریف و مسخ کر دیا ہے۔ ص ص ۳۰۲، ۳۰۳ پر پنڈت گوری شنکر ہیرا چند اوجھا کی تاریخی تصنیف "راجپوتانہ کا اتہاس" کو "راجستھان کا اتہاس" لکھتے ہوئے "اپ ٹو ڈیٹ" معلومات کا ثبوت دیا ہے۔ حالانکہ اوجھا صاحب نے جب تصنیف لکھی اور شائع ہوئی اس وقت تک "راجستھان" معرض وجود ہی میں نہیں آیا تھا۔

بیان کردہ تمام امور کو مدِنظر رکھتے ہوئے عنوان "چند باتیں" ص ص ۵، ۶ کی اس عبارت پر بھی غور کر لیا جائے جس میں مترجم موصوف فرماتے ہیں کہ:

"یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے اگر مصنف (یعنی سکینہ صاحب) میری مدد نہ کرتے حسنِ اتفاق سے وہ میرے کرم فرما استاد بھی ہیں"

لیکن ہم ترجمہ کی اغلاط کے پیشِ نظر یہ بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ ڈاکٹر سکسینہ صاحب

نے اس کارِ خیر میں معاونت فرماتے ہوئے کتنا (۱۱۱ تا ۱۲۰) کیا ہے۔

نظر ثانی کے ذیل میں ص ۶ پر ڈاکٹر سید حسن احمد صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے "شکر گزاری کے سلسلے میں ڈاکٹر سید حسن احمد صاحب (لکچرر پولیٹکل سائنس مسلم یونیورسٹی) کا احسان نہ ماننا میرا اخلاقی جرم ہوگا۔ موصوف نے جس محنت و نظر سے مسودہ پر نظر ثانی کی ہے وہ میرے لئے بڑی گراں بہا ہے۔ اگر ان کی توجہ شامل نہ ہوتی تو ترجمہ میں بعض ایسی فرد گزاشتیں (... فرد گزاشتیں) رہ جاتیں جو کتاب چھپنے پر خود میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوتیں"!

عرض ہے کہ نظر ثانی کے باوجود جو فرد گزاشتیں رہ گئی ہیں کیا وہ سب قابلِ برداشت ہیں؟ اور کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا کوئی یہ باور کرنے کے لئے تیار ہوگا کہ مسودہ پر نظر ثانی کی گئی ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ مسودہ نظر ثانی تو کیا اِک نگاہِ غلط انداز کا بھی محتاج رہا ہے۔

... نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ اس علمی شخصیت کے قلم سے ہے جن کا اسمِ گرامی ڈاکٹر گیان ... جیسے عظیم محقق اردو ادب نے اپنی گراں مایہ تصنیف "تحقیق کا فن" کے مختلف صفحات ... ستاد احترام سے لیا ہے۔ گمان ہوتا ہے، حالانکہ بعض گمان گناہ کے زمرہ میں آتے ہیں ... مترجم موصوف کے شاگردوں کی ٹیم نے بیکار سمجھ کر کیا ہو جن کے پیشِ نظر "نہ نام نہ ... سے کیا کام" والی بات رہی ہو۔ خیال ہے کہ اس مترجم تصنیف کو شاید کسی غلط ... بین الاقوامی مقابلہ میں اول لانے کے تمام متعلقہ افراد نے جی توڑ کوشش کی ہے ... بھی ہے اتنا ضرور ہے کہ یہ ترجمہ گھٹیا مال سے بڑھیا مال مفت حاصل کرنے کی ... مولانا محمد حسین آزاد نے کسی ایسی ہی "محنتِ شاقہ" کے بارے میں فرمایا ہے!

... خیال کہ ملائے نکتہ داں   بیٹھا ہے سر جھکائے بپائے چراغ داں
نظر ہے متن پہ بھی "ترجمہ" پہ بھی   مضموں ہیں ہمدگر جو الجھتے کبھی کبھی

ترقی اردو بیورو ——— کی اردو خدمات سے ہمیں انکار نہیں کہ اس سلسلہ ... کا کوئی بھی محنتی طالب علم پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر سکتا ... ان ترقی اردو بیورو اپنے تراجم کی طرف ضرور توجہ مبذول فرمائیں تاکہ وہ ... بہتر نہ بھی تو کم از کم معیاری ضرور ہوں۔ ۱۲

عہد مغلیہ یورپی سیاحوں کی نظر میں

(سنہ ۱۶۱۶ء - سنہ ۱۶۱۹ء) قسط ۱۳

پروفیسر محمد عمر، شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

صوبہ داروں اور قاضیوں کے فرائض:

صوبہ دار فوجداری، موت اور زندگی سے معاملات کی دیکھ بھال کرتا تھا جب کہ قاضی لوگ آدمیوں میں معاہدوں، قرضوں اور لین دین کے معاملوں کو دیکھتے تھے۔ قرض داروں کو عہدہ داران قید کر لیتے تھے اور انھیں قاضی کی عدالت میں پیش کرتے تھے۔ ان کی ضمانتیں لی جاتی تھیں۔ اگر وہ مدعی کو مطمئن نہیں کر سکتے تھے تو انھیں قید میں ڈال دیا جاتا تھا۔ بارہا ایسا ہوتا تھا کہ قرض دہندہ کی رقم کو ادا کرنے کے لیے قرض داروں کو اپنی بیبیوں اور بچوں کو غلام کی حیثیت سے فروخت کرنا پڑتا تھا۔

بادشاہ کی نظر سے دور رہنے کے دوران داڑھی رکھنے کا ضابطہ:

روزانہ داڑھی منڈواکر مغل لوگ بہت صاف رہتے تھے لیکن اگر بادشاہ کے حکم سے انھیں "کسی دوسری جگہ کی حکومت پر" یا "کام پر" بھیجا جاتا تھا تو وہ لوگ اس وقت اپنی داڑھی نہیں بنواتے تھے جبتک کہ وہ دربار میں حاضر ہوں۔ جیسے ہی بادشاہ کی نظر ایسے لوگوں پر پڑتی تو وہ انھیں "بال بنوانے" کا حکم دیتا۔

وقت کے تعین کا طریقہ:

رات دن کو چار چار حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اور ہر حصے کو "پہر" کہتے تھے۔

مزید برآں ہر پہر کو آٹھ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا جن کو "گھڑی" کہتے تھے۔ ایک برتن سے دوسرے برتن میں پانی ٹپکا کر گھڑیوں کا اندازہ لگایا جاتا تھا۔ اس کام کی نگرانی کے لیے ایک آدمی تعینات کیا جاتا تھا۔" جب ایک گھڑا بالکل خالی ہو جاتا تو اسے دوبارہ بھر دیا جاتا۔" ہتھوڑے سے وہ گھڑیال کو بجاتا تھا۔ اس سے جو آواز نکلتی تھی وہ بہت دور تک سُنی جا سکتی تھی۔ گھڑیال عام نہیں تھے۔ نہ تو دھوپ گھڑیوں کا اور نہ ہی گھڑیوں کا کہیں نام و نشان مل سکتا تھا۔

(۴) فوجی پڑاؤ اور چھاؤنی

مغل فوجی چھاؤنی کا بیان:

"چھاؤنی" میں نصب کئے جانے والے خیموں کا عام طور پر لوگوں کے ملبوس کی طرح سفید رنگ ہوتا تھا۔ لیکن شہنشاہ کے خیمے کا رنگ سُرخ ہوتا تھا۔ دوسرے خیموں کے مقابلے میں اس خیمہ کو لمبی بلیوں میں لگایا جاتا تھا۔ یہ خیمہ چھاؤنی کے وسط میں لگایا جاتا تھا۔ اسے قنات سے چاروں طرف سے گھیر دیا جاتا تھا جس کی تقریباً دس فٹ اونچائی ہوتی تھی۔ یہ قنات مضبوط باریک چھینٹ کی بنی ہوتی تھی۔ اور اس کی کناریاں اسی کپڑے کی ہوتی تھیں۔ بینت کے ڈورے سے انھیں سختی سے آپس میں باندھ دیا جاتا تھا۔ سپاہیوں کا بڑا ایک فوجی دستہ رات دن سختی سے وہاں پہرہ دیتا تھا۔

ساری چھاؤنی کا بندوبست "اچھا" تھا۔ ہر ایک کے لیے جگہ "متعین" تھی۔ فاصلے اور مقام کا تعین بادشاہ کے خیمے سے کیا جاتا تھا۔ بادشاہ کے امراء اور ان کے فوجیوں کی بیبیاں اور بچے ان کے ہمراہ ہوتے تھے۔

پڑاؤ کے موقع پر شکار کھیلنا:

جس مقام پر پانی وافر دستیاب ہوتا تھا وہاں بادشاہ تین چار دنوں تک قیام کرتا تھا۔ دورانِ قیام میں بیشتر وہ کتوں، بازوں اور چیتے وغیرہ کو ساتھ لے کر شکار کھیلنے جایا

تھا۔ منڈو میں قیام کے دوران جہانگیر ہاتھیوں کے شکار کے لیے گیا تھا۔

شہنشاہ کا سفر؛

بادشاہ عام طور پر دس میل سے زیادہ سفر نہیں کرتا تھا بلکہ اس سے کم۔ مغل حرم کی ستورات یا تو سواری گاڑیوں، پالکیوں یا ہاتھیوں پر سفر کرتی تھیں۔ ان کے ساتھ خواجہ سرا اور سپاہی ہوتے تھے۔ وہ ان کے آگے کا راستہ صاف کرتے جاتے تھے۔

فوجیوں کا حلیہ؛

عام طور پر فوجی لوگ بڑی بڑی مونچھیں رکھتے تھے اور ان کے ٹھوڑی کے بال منڈے ہوتے تھے۔ وہ گھوڑوں پر چلتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اسلاح خانے سے گھرے ہوں۔ ٹیری نے ان الفاظ میں ان کے اسلاح کا ذکر کیا ہے " ان کے بائیں طرف کمر کی بیٹی سے تلواریں لٹکی ہوتی تھیں۔ ان کے نیچے تیروں کے بہت سے گچھے ان کے بائیں کندھے پر چوڑی ایک ڈھال کسی ہوتی تھی اور ان کی بیٹھ میں چھوٹی بندوقیں اس طرح جمی ہوتی تھیں جیسے کہ قرابین ان کے دائیں طرف مغلف کمانیں اور نیزے (تقریباً ۲½ گز لمبے) ان کی رکاب کے قریب حلقوں میں لٹکے ہوتے تھے کیونکہ وہ انھیں اپنے ہاتھوں میں نہ لے جا سکتے تھے۔

فوجی گھوڑے؛

یہاں کے سپاہی اور بہت سے شرفا اور اعلیٰ طبقے کے لوگ جو دربار میں رہتے تھے۔ گھوڑسواری اور ان کے پالنے میں عمدہ ترین مہارت رکھتے تھے۔ مغل لوگ گھوڑ سواری اور ان کے جست اور خیز میں بہت اچھے تھے۔ وہ ان گھوڑوں کو پوری رفتار سے دوڑاتے تھے اور " ایک قدم چوڑی جگہ پر" انھیں روک لیتے تھے۔

ان کے گھوڑے عمدہ ہوتے تھے۔ بعض سیاہ فام، جبکہ بیشتر سفید۔ اور بڑی تعداد میں چتکبرے ہوتے تھے۔ جبکہ دوسروں کا رنگ بھڑکیلا ہوتا تھا۔ یہ دستور عام تھا کہ فوجی اپنے

گھوڑوں کے پیٹوں اور پیروں کو زعفرانی رنگ سے رنگ دیتے تھے۔ جنگی گھوڑوں کے بال "کاٹ" دیئے جاتے تھے۔ ان گھوڑوں کو راتب دینے اور دیکھ بھال کرنے کے لیے ایک آدمی ملازم رکھا جاتا تھا جو سائیس کہلاتا تھا۔ جب سوار گھوڑے پر چلتا تھا تو سائیس اس کے ساتھ دوڑ دوڑ کر چلتا تھا۔ انگلستان کی طرح ان کے گھوڑوں کے گلے میں "رسّی" نہیں باندھی جاتی تھی۔ ان کے پچھلے دونوں پیروں میں بڑی دو رسّیاں باندھ دی جاتی تھیں اور انھیں خیموں یا جہاں انھیں رکھا جاتا تھا، باندھ دیا جاتا تھا۔

وہ لوگ ان گھوڑوں کو کچا غلّہ (دانہ) کھلاتے تھے راتب خشک نہیں دیا جاتا تھا بلکہ اسے اُبال کر اور اس میں "گڑ" ملا کر کھلاتے تھے۔ راتب کے گولے بنا کر ان کے منہ میں ٹھونس دیتے تھے۔

ان کی کاٹھیاں عمدہ ہوتی تھیں، بعض بیش قیمت۔ انھیں بہت خوبصورتی سے سجایا جاتا تھا ان کی جھولیں بھی عمدہ ہوتی تھیں۔ وہ گھوڑے اور گھوڑ سوار دونوں کے لیے آرام دہ ہوتی تھیں۔ لگاموں اور ٹوپوں کا رنگ بھی کاٹھیوں اور جھولوں کے رنگ کے مشابہ ہوتا تھا۔

ہاتھی:

تمام جانوروں میں ہاتھی ہی ایک ایسا جانور تھا جو سب سے زیادہ "سدھا ہوا" قدم رکھتا تھا۔ انھیں نہ تو کبھی گرتے یا لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا گیا وہ اپنے سواروں کو کبھی بھی خطرے میں نہیں ڈالتے تھے۔ وہ ہاتھی اپنے مہاوتوں کے حکم کی تعمیل کرتے تھے۔ اگر کسی شخص پر انھیں ... کا حکم دیا جاتا تو وہ اس آدمی پر دوڑ پڑتے لیکن جب اس کے نزدیک پہونچتے تو رک جاتے۔ اگر کسی شخص کی تذلیل کرنے کا اسے حکم دیا جاتا تو وہ اس کے چہرے پر کیچڑ اور گندگی ... پھینکا کرنے لگتے۔ تیرنے اور نہانے میں انھیں بہت خوشی ہوتی۔ بدمستی کے وقت انھیں اپنے سے دور رکھا جاتا اور زنجیروں سے درخت سے باندھ دیا جاتا۔ اگر وہ کھل جاتے ... کے پٹاخوں کو چلا کر انھیں قابو میں کیا جاتا۔

جنگی مقاصد کے لیے ان میں سے بہتوں کی تربیت کی جاتی۔

تقریباً چھ فٹ لوہے کی بندوق وہ اپنے ساتھ لے جاتے جو لکڑی کے مربع نما خول کے اوپر

رکھی ہوتی تھی۔ وہ بندوقیں ان کے جسم سے مضبوط پٹیوں سے بندھی ہوتی تھیں۔ ان کو "اوپر نیچے" دونوں طرف چلایا جا سکتا تھا۔ اور مربع نما خول کے کناروں پر ریشمی چھوٹے جھنڈے پھہرا دیئے جاتے تھے۔ ان کے اگلے حصّے میں مہاوت بیٹھتا تھا اور اس کے خول کے اندر بندوقچی ٹینس کی ایک گیند کے برابر بندوق کی گولیاں ہوتی تھیں۔
ہر ایک ہاتھی کے ساتھ چار ہتھنیاں ہوتی تھیں

جنگی اسلحات:

کمان، تیر، تلوار، ڈھال اور چھوٹے نیزے جنگی اسلحات میں استعمال کئے جاتے تھے بعض پیدل فوجی تیروں کمانوں، تلواروں اور ڈھالوں کے ساتھ ساتھ "چھوٹی بندوقیں" بھی ساتھ لے کر چلتے تھے۔ اور اچھے نشانہ باز تھے۔ توڑے دار اپنی بندوقوں کو وہ یا تو ماچسوں یا لکڑی کے سوختوں سے جلا کر چلاتے تھے۔ خم دار ان کی تلواریں بہت تیز ہوتی تھیں جو ٹوٹ تو جاتیں لیکن ٹیڑھی نہیں ہوتی تھیں۔ ان کے پاس اچھا بارود ہوتا تھا۔ (جنگی نغمہ کے لئے) وہ گھوڑوں پر رکھ کر نقارے بجاتے تھے۔ مزید براں ایک ہوائی بڑا باجہ ہوتا تھا جس سے ناخوشگوار آواز نکلتی تھی۔

(۵) امرار

جس طرح کا لباس "شرفار" پہنتے تھے اسی طرح کا امیروں کا لباس ہوتا تھا۔ ان کے جسم کے زیادہ تر حصے پر خالص سفید اور عمدہ چھینٹ کا لباس ہوتا تھا۔ موسم سرما میں ان کا لبادہ چھینٹ یا انگریزی نارنجی رنگ کے بڑے عرض کی نفیس سیاہ بانات کے کپڑے کا ہوتا تھا جس میں روئی بھری ہوتی تھی۔ نارنجی رنگ ایک ایسا رنگ تھا جس سے انھیں بڑی دلچسپی تھی۔ نارنجی رنگ انھیں بہت پسند تھا۔ کبھی کبھی ان کے لبادوں اور آستینوں دونوں میں رنگ برنگے تافتے یا طلائی یا نقرئی کپڑوں کے حاشیہ لگے ہوتے تھے۔ ان کے کالروں اور لبادوں کے بعض اوپری حصوں کو "کاریگری کی سلائی سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ سر پر امرار پٹکا باندھتے تھے۔" وہ آدھا گز

لمبا چوڑا سفید یا رنگین کپڑا ہوتا تھا۔ بعض مرتبہ اس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رنگین ریشمی طلائی یا نقرئی ڈورے بُنے ہوتے تھے۔

داشتائیں:

وارث کے پیدا کرنے کے لیے ان میں سے بعض کے صرف ایک بیوی ہوتی تھی لیکن وہ داشتائیں رکھتے تھے۔ اس بیوی سے اس کا برائے نام تعلق ہوتا تھا لیکن وہ اس داشتہ یا طوائف سے محبت کرتا تھا۔ ٹیری رقم طراز ہے کہ "بعض مرتبہ ایک رنڈی باز کو یہ کہتے سنا گیا کہ وہ اپنی بیوی سے محبت نہیں کرسکتا چاہے وہ کتنی ہی دلکش اور قابل محبت ہو اور محض اس وجہ سے نہیں کیونکہ وہ اس کی بیوی ہے۔ اگر وہ ایسی نہ ہوتی تو وہ ہر قیمت پر اس کی صحبت حاصل کرسکتا تھا۔ عیاشی ایک انسان کو بدکاری کی کس بلندی تک پہونچا سکتی تھی۔ حالانکہ اسے اپنی بیوی سے محبت کرنا چاہیئے اور یہ رشتہ بہت مضبوط ہونا چاہیئے"

نکاحی بیوی کے سب سے بڑے بیٹے کو "بقیہ بیٹوں پر فضیلت حاصل ہوتی تھی" دوسرے اُسے "بابا بھائی" کے نام سے مخاطب کرتے تھے۔

شہنشاہ کی تقلید!

شہنشاہ کے امرا شان وشوکت میں اس کی پیروی کرتے تھے۔ انگلستان سے لائے گئے ایک موتی کو ان میں سے کسی نے بارہ سو پونڈ "اسٹرلنگ" میں خریدا تھا۔ وہ موتی ناشپاتی کی شکل کا بڑا اور بہت خوبصورت تھا۔

وظائف!

مغل ایک امیر کا وظیفہ "بہت زیادہ ہوتا تھا" بادشاہ اسے دس لاکھ گھوڑوں کے رکھنے کے برابر سالانہ تنخواہ دیتا تھا۔ پیدل ایک سپاہی یا گھوڑ سوار کو تقریباً ۱۸ پونڈ اسٹرلنگ سالانہ

کی شرح سے تنخواہ دی جاتی تھی۔ "فی الحقیقت" یہ ہر سال ادا کی جاتی تھی بے حد" منظورِ نظر" امراء کو چھ ہزار گھوڑوں کی قیمت کے برابر تنخواہ دی جاتی تھی دوسرے بیشتر امیر ایسے تھے جن کو پانچ ہزار گھوڑوں کے مطابق تنخواہ دی جاتی تھی۔ ان کے علاوہ بعض ایسے امیر تھے جن کی تنخواہ ۴ ہزار، ۳ ہزار اور دو ہزار گھوڑوں کے برابر تھی۔ ان سے یہ امید کی جاتی کہ وہ اپنے "گھوڑے ہمیشہ" تیار رکھیں۔ وہ امیر جس کا منصب شش ہزاری یا پنج ہزاری تھا اسے ایک ہزار یا اس سے زیادہ بادشاہ کی ضرورت کے مطابق گھوڑے رکھنے پڑتے تھے۔ اور دوسروں کو بھی اسی مناسبت سے گھوڑے تیار رکھنے پڑتے تھے۔ ٹیری نے لکھا ہے کہ "وہ لوگ اس قابل تھے کہ بیک وقت وہ گھوڑوں کی مقررہ تعداد فراہم کر لیتے تھے۔ جہاں کہیں بھی ہوں ان کے پاس ایک لاکھ گھوڑے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے موجود رہتے تھے۔

گھریلو ساز و سامان:

سب سے بڑے لوگوں کے گھروں میں لکڑی کا بہت کم سامان ہوتا تھا۔ ان کے گھروں کو نہ تو "پردوں" نہ ہی دیواروں پر خطوط بنانے کے علاوہ کسی دوسری چیز سے" آراستہ پیراستہ" کیا جاتا تھا۔ عمدہ ترین آراستہ پیراستہ مکانوں میں بہت سفید قلعی ہوتی تھی اور " ان پر بہت خوبصورت نقش و نگار بنائے جاتے تھے اور ان کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا تھا" کمروں میں کوئی ایسا کمرہ نہیں ہوتا تھا جس میں کرسیاں، اسٹول، صوفے، میزیں اور چارپائیاں ہوں جن پر غلاف لگے ہوں یا پردے پڑے ہوں۔ فرشوں پر عام طور پر عمدہ پلاسٹر ہوتا تھا۔ ان پر عمدہ ترین قالین بچھے ہوتے تھے۔ جن کی حفاظت کے لئے ان کے نیچے بعض بوریاں بچھا دی جاتی تھیں۔ ان کے خیموں کے فرش عمدہ مٹی کے بنے ہوتے تھے۔ جوتے اتار کر وہ قالین پر چلتے تھے۔

سونے کا طریقہ:

رات میں وہ لوگ قالینوں یا" روئی کے چوڑے گدّوں یا چھوٹی چارپائی پر سوتے

تھے : جو سوت کی رسیوں سے بنی ہوتی تھیں۔ (نواڑ سے بنی ہوتی تھیں) : ٹیری نے لکھا ہے کہ "جب کبھی وہ لیٹتے ہیں تو وہ لوگ پوری طرح سے دراز ہو کر لیٹتے ہیں اور سر کے نیچے کوئی تکیہ رکھتے ہیں۔ وہ چت لیٹتے ہیں"۔ ان میں سے بعض لوگ جھولے پر چارپائی رکھ کر سوتے ہیں۔ جھولے کی یہ رسیاں چارپائی کے چاروں پایوں سے باندھ دی جاتی تھیں" انھیں نیند آنے کے لئے ان کے نوکر اس جھولے کو آہستہ آہستہ ہلایا کرتے تھے"۔

تفریح خانے :

اپنے باغوں یا کنجوں کو وہ لوگ اس کام کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس میں چھوٹا سا ایک انگور کا باغ ہوتا تھا، انار کے بہت سے درخت اور ہر قسم کے پھول اور پھلوں کے درخت ہوتے تھے۔ ان باغوں کے وسط میں ایک کنواں بنوایا جاتا تھا جسکی چوٹی درخت لگے ہوئے زمین کے مقابلے میں بہت زیادہ اونچی ہوتی تھی۔ وہاں تک تنگ نالیوں کے ذریعہ پانی لے جایا جاتا تھا۔ نہانے کے لئے انہوں نے "گول چھوٹے تالاب" بنوائے تھے۔ کنوؤں کے پانی سے ہودیوں کو بھرا جاتا تھا۔ ضرورت کے مطابق انہیں خالی کیا اور بھرا جاسکتا تھا۔ ان تک پانی پہونچانے کے لیے "چوڑی مینڈیں بنی ہوئی تھیں جن میں بہت سی نالیاں تھیں"۔ جب پانی بہتا تھا تو اس سے خوشگوار آواز پیدا ہوتی تھی۔ باغ میں واقع مکان کے قریب نہانے کے ان تالابوں کو بنایا گیا تھا۔ موسم گرما میں لوگ ان کے قریب چارپائیاں بچھا کر لیٹتے تھے۔

جسم کی مالش :

گرمیوں کے زمانے میں جب وہ لوگ قالینوں پر بیٹھتے یا لیٹتے تو "ہوا سے بھرے ہوئے چمڑے سے" مکھیوں کو اڑانے کے لئے نوکر رکھے جاتے تھے اس طرح وہ ٹھنڈک محسوس کرتے تھے۔ وہ لوگ حجاموں کو بھی بلاتے "جو ان کے بازوؤں، کندھوں اور جسم کے دوسرے حصوں کی جہاں تک ان کے ہاتھ پہونچ سکتے، آہستہ آہستہ مالش کرتے تھے۔ اور اسی طرح بڑی آہستگی سے ان حصوں کو اپنے ہاتھوں سے کوٹتے تھے"۔ (جاری)

وفیات

شمع اردو کا ایک اور چراغ بجھ گیا، اردو کے ممتاز اہل قلم اور ادیب ونقاد علامہ سید اخلاق حسین دہلوی اپنی رہائش گاہ لال محل بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں تقریباً چھ ماہ کی علالت سے گذرتے ہوئے اٹھاسی سال کی طبعی عمر میں انتقال فرما کر اپنے مولیٰ کے حضور میں حاضر ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ؏

مرحوم انتہائی دیندار اور بلند پایہ کتابوں کے مصنف تھے ان کی سوانح عمری میں یہ مرقوم ہے کہ انہوں نے ۱۶ سال کی عمر میں ایک تحقیقی کتابچہ "عشق" مرتب کرکے شائع کیا تھا۔ اس کے بعد تو ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آکر علمی دینی اور ادبی حلقوں میں داد تحسین حاصل کر گئیں ویدک دھرم اور اسلام ان کی کتاب علمی اور تاریخی دنیا میں بڑی شہرت وسراہت کا باعث بنی۔

حضرت علامہ سید اخلاق حسین دہلوی کو علماء کرام سے بڑی ہی عقیدت تھی مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ سے انہیں والہانہ لگاؤ وانسیت اور محبت تھی اکثر ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی کے دفتر میں مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کی غرض سے آتے اور بڑی دلجمعی کے ساتھ انکے خیالات سے استفادہ کرتے مجاہد ملت حضرت مولانا حفیظ الرحمٰنؒ اور سحبان الہند مولانا احمد سعیدؒ سے بھی انکا خصوصی تعلق ور بط تھا۔

دہلی کی تہذیب وتمدن کی نمائندگی کے جیتے جاگتے نمونے تھے۔ آہ! ایسی زندہ دل متین ومخلص شخصیت بھی اب ہمارے درمیان سے اٹھ گئی۔ اب اسے ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر"

مرحوم علامہ سید اخلاق حسین دہلوی ملی کاموں میں بھی پیش پیش رہتے تھے ان کے برادر خورد حکیم سید حسین دہلوی جنکا انتقال تقریباً ڈیڑھ دو سال پیشتر اپنے برادرِ کلاں کی حیات میں ہی ہو گیا تھا۔ دہلی کی معاشرتی اور ادبی زندگی کی جان تھے خلوص وایثار کے پیکر مجسم!

اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین۔

ادارہ ندوۃ المصنفین حضرت علامہ سید اخلاق حسین دہلوی کے سانحہ رحلت پر خصوصی طور پر اظہار تعزیت کرتا ہے۔ اور بارگاہِ عالی میں مغفرت کے لئے دعا گو ہے!۔

ایک مخلص خادم ملت کا مکتوب گرامی

"برہان" ماہ جون ۹۴ء کے نظرات میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا ذکر کرتے ہوئے ان حضرات کی سراہنا و ستائش کی گئی تھی جو صدق دلی، لگن اور جذبۂ صادق کے ساتھ قوم کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے میں مستعد عمل ہیں۔ ایسے ہمدرد مخلص لوگ کام سے پیار کرتے ہیں نام و نمود سے ہمیشہ ہی بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا نمونہ ہیں۔ دہلی کے ایک مخلص خادم ملت جناب پروفیسر ڈاکٹر ریاض عمر صاحب سلمہٗ تعالیٰ۔

انھیں اس بات پر اعتراض ہے کہ "کریسنٹ اسکول کو قائم کرنے، بنانے، سنوارنے اور سجانے میں صرف ریاض عمر ہی کا نام کیوں لیا گیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کریسنٹ اسکول کو قائم کرنے، بنانے، سنوارنے اور سجانے میں سینکڑوں ہمدردوں، سرپرستوں، کارکنوں، معطی صاحبان اور نہ جانے کس کس کا ہاتھ ہے۔ میں تو ان کے خادموں میں سے ایک ادنیٰ خادم ہوں۔"

جناب پروفیسر ڈاکٹر ریاض عمر کا ہم یہ مکتوب صرف اس نقطۂ نظر سے من وعن شائع کر رہے ہیں کہ ملت کے بہی خواہ اسے پڑھ کر ملی کاموں کے میدانِ عمل میں اپنے لئے طریقۂ کار کے تعین کرنے سے واقفیت و آگاہی اور سبق حاصل کریں۔

Phone : 3311896

ZAKIR HUSAIN POST GRADUATE EVENING COLLEGE
(UNIVERSITY OF DELHI)
JAWAHARLAL NEHRU MARG, NEW DELHI - 110002

RIAZ UMAR
ADDITIONAL PRINCIPAL

۱۴- جولائی ۱۹۹۲ء

محترم جناب مدیر اعلیٰ صاحب

ماہنامہ برہان - دہلی

السلام علیکم - مزاج شریف -

آج ماہ جون ۱۹۹۲ء کا برہان کا شمارہ ملا - بہت بہت شکریہ
آپ کے تحریر کردہ "نظرات" پر نظر دوڑائی، دفعتاً کہ اپنا نام نظر آیا - میں نے سوچا
کہ میں نے تو ایسا کوئی کام پیش کیا جو "نظرات" میں آپ کی توجہ کا مستحق ہو -
جو پرلیمنٹ اسکول کے تعلق سے تفصیل پڑھی - عرض خدمت ہے کہ میں نے تو اس
بارے میں کسی سے کچھ عرض نہیں کیا - علاوہ ازیں اس میں مبالغہ آرائی بھی
ہے - پرلیمنٹ اسکول کو قائم کرنے، بنانے، سنوارنے اور سجانے میں سینکڑوں
ہمدردوں - ممبر لوگوں، کارکنوں، مخلص صاحبان اور نہ جانے کس کس کا
ہاتھ ہے - میں تو اس کے خادموں میں سے ایک ادنیٰ خادم ہوں -
اگر آپ نے میرے بارے میں اتنا لکھا تو اور لوگوں کی دل شکنی اور اپنے بارے
میں خوش فہمی کا احتمال ہے - اللہ تعالیٰ ہر دو سے بچائیں - میں تو صرف بارگاہِ ایزدی
میں شکرانہ سمجھتا ہوں کہ اس نے اس خدمت کے قابل سمجھا - ازراہِ کرم
مہربانی کرکے اگلی اشاعت میں اسے شائع کر دیں تاکہ کوئی غلط فہمی نہ رہے -
جملہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے آپ سے اور قارئین سے دعاؤں کی درخواست ہے کہ
محرکِ کوشش - والسلام

طالب دعا عمر
مخلص
ریاض عمر

جناب مدیر اعلیٰ - ماہنامہ برہان
اردو بازار - جامع مسجد
دہلی - ۱۱۰۰۰۶

Res: 1271, Haveli Hissamuddin Hyder, Ballimaran, Delhi-110006.
Ph. 239725 - 239513

برہان

جلد ۱۱۴ — ستمبر ۱۹۹۴ء مطابق ربیع الثانی ۱۴۱۵ھ — شمارہ ۳

عمید الرحمن عثمانی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

دور نہ جایئے صرف پچاس سال پہلے ہی کی مدت طے کر لیجئے، یعنی پچاس سال پہلے یہ تصور کرنا بھی محال تھا کہ پچاس سال بعد کے انسان کو اپنی ضروریات زندگی کے حصول کے لئے کیا کیا تگ و دو کرنی پڑے گی، کس قدر اس کے لئے دنیا چھوٹی ہو جائے گی۔ اور جو انسان سائنسی ایجادات کے چکر میں ایسا جا پھنسے گا کہ وہ اس میں سے پھر نکلنا بھی چاہے گا تو نہ نکل سکے گا۔ اور پھر وہ اس قدر پریشان و افسردہ حال ہو جائے گا کہ اسے سکون و راحت آرام و آسائش کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے پڑیں گے۔ اور اس کے باوجود بھی اسے یہ میسر نہ ہو سکے گا۔ آرام و آسائش سائنسی دور کے انسان کے لئے معدوم ہو کر رہ جائے گا۔ یہ کس قدر المیہ ہے جبکہ سائنس والوں کا یہ کہنا تھا کہ نت نئی ایجادات سے انسان کو آرام و راحت نصیب ہوگا اور ان سب ایجادات سے انسانوں ہی کو فائدہ پہنچے گا۔ اور ایجادات صحیح معنوں میں انسانوں ہی کے لئے ہوں گی۔

اللہ رب العالمین نے انسانوں کو پیدا کیا تو ان کی ضرورت کے لئے دنیا میں ہر چیز پیدا کی جیسے جیسے اللہ اپنے بندوں کو پیدا کرتا رہا ویسے ویسے ہی ان کے لئے دنیا میں ضرورت کی چیزیں مہیا کرتا رہا ویسے ویسے ہی ان کے لئے دنیا میں ضرورت کی چیزیں مہیا کر رہا۔ پانی اور ہوا جو انسانوں کی زندگی کے لئے ضروری اور لازمی بنائی اسے اللہ تعالیٰ نے وافر مقدار میں مہیا کیا لیکن یہ انسان کی بدبختی نہیں تو اور کیا ہے اسی پانی و ہوا کو اس نے اپنی ایجادات کے چکر میں پڑکر ایسا غلیظ و گندہ کر دیا ہے کہ اب ہوا و پانی کی غلاظت سے انسان کئی کئی معلوم و نامعلوم بیماریوں میں مبتلا ہو گیا اور جگہ جگہ اسپتال اور ڈاکٹروں کی بھرمار کے باوجود بھی انسان تڑپتا ہوا مر رہا ہے۔ شفایابی کے بجائے اسے طرح طرح کی دیگر بیماریاں لگ جاتی ہیں۔ اور پھر وہ افسوس اور ہائے ہائے کرتے ہوئے اپنی سائنسی ایجادات کو مضرت رساں قرار دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

آج پوری دنیا میں اخلاقی گراوٹ انتہا پر پہنچ چکی ہے جس کی وجہ سے انسان میں ہمدردی ایکدوسرے کے ساتھ اچھا اور بہترین سلوک مفقود ہو چکا ہے۔ ہر شخص خودغرض مفاد پرست بنا ہوا ہے۔ قدم قدم پر رشوت ستانی اور مہنگائی کا انسانوں کو سامنا ہے۔ حیا و شرم کا فقدان بے حیائی و فحاشی کا دور دورہ ہے بلکہ فحاشی و بے حیائی تو اپنی حدوں سے بھی تجاوز کر چکی ہے رشتوں و رتبوں اور درجوں کی بھی اب پرواہ نہیں رہی ہے چھوٹے بڑے کی تمیز ختم ہو چکی ہے اور اس ضمن میں بعض خبریں تو ایسی سنائی دیتی ہیں کہ انسان انھیں سن کر متحیر ہو جاتا ہے اور وہ آہیں بھرتا ہوا دل ہی دل میں کڑھتا ہے کہ کاش! ایسی خبریں سننے کے لئے کان نہ ہوتے اور ایسے ایسے فحاشی کے مناظر دیکھنے کے لئے آنکھیں بھی نہ ہوتیں۔ پاکیزہ رشتے بھی انسان کی اپنی ایجاد کردہ چیزوں کے بھنور میں آکر ملیا میٹ ہو چکے ہیں۔

اللہ پاک فرماتا ہے: "اے محمدؐ! ان سے کہو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں تم پر تمہارے رب نے کیا پابندیاں عائد کی ہیں ــــ یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں ان کو بھی دیں گے۔ بے شرمی کی باتوں کے قریب نہ جاؤ، خواہ وہ کھلی ہوئی ہوں یا چھپی ہوئی۔ اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو، مگر حق کے ساتھ۔"

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج کا سائنسی انسان ان تمام باتوں کے مغائر اپنی زندگی گذار رہا ہے۔ وہ نس بندی کے ذریعہ اولاد کے قتل کا مرتکب ہو رہا ہے وہ اپنی ایجادات کو خدائی درجہ دیکر شرک کا مجرم بنا ہوا ہے۔ وہ بے حیائی و بے شرمی کا چلن عام کئے ہوئے ہے۔ اور انسان کو انسان قتل کر رہا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر انسان کا قتل انسان کے ہاتھوں آج عام بات بن چکی ہے۔ ان سب باتوں کی موجودگی میں آج کا انسان اپنے لئے دنیا میں جنّت بنانے کے بجائے جہنّم بنا بیٹھا ہے۔ دنیا میں اس نے خود ہی اپنے لئے جہنّم بنا ڈالی اور آخرت میں اسے اللہ تعالیٰ اس کے اپنے اعمال کے صلہ میں کیا دیتا ہے واللہ اعلم!

ایک طرف دنیا میں ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ شروع ہے طرح طرح کے خطرناک تجربے ہو رہے ہیں۔ ان تجربوں کی بدولت جو اس میں سے گیس نکلتی ہے جس سے ہوائیں آلودہ ہو کر انسانوں کے

اندر سانسوں کے ذریعہ داخل و خارج ہوتی ہیں۔ اس سے ہر انسان دکھی ہے مگر مجبور ہے اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ آبادیوں میں کاروباری ادارے کھل چکے ہیں کارخانے بنائے جارہے ہیں اس سے یہ ہوا کہ انسان دو پل آرام بھی نہیں کر سکتا ہے سکھ کا سانس لینا ہی مشکل ہو گیا ہے۔ محلوں محلوں گلیوں گلیوں میں گندگی کے ڈھیر ہو گئے ہیں۔ طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں مگر ارباب حل و عقد اس طرف جو انسان کی زندگی و بقار کے لئے بہت ضروری ہیں اپنی توجہ ہی مبذول کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے ہیں۔ انسان کی بہتر زندگی ہو بہترین طریقہ سے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی تربیت و پرورش کرنے کے مواقع بہم ہوں لا لے اس کے پڑے ہوئے ہیں۔ سب کا موقع پہلے بہتر ہو گا انسان کے لئے کہ وہ اس طرف اوّل فرصت میں غور و خوض اور عملی کارروائی کرے کیونکہ یہ انسانیت کے لئے ضروری ہے نسل انسانی کی صحیح و بہتر افزائش کے لئے بہت ہی اہم ضروری ہے۔

اللہ پاک ہندوستان کی مسلم لیڈر شپ کو عقل سلیم عطا کرے اور اسے ایسی تمیز و سمجھ بھی عنایت فرمائے کہ وہ اپنے کردار و عمل کے نتیجہ میں اچھے یا برے انجام سے باخبر ہو سکے۔ اس میں خلوص اور قومی مفاد کو ہر حالت میں ترجیح دینے کی تڑپ و امنگ پیدا فرمائے اور اپنے ذاتی مفاد و اغراض سے انھیں نجات دلائے۔ اور ان کی طبیعت میں اس سلسلے میں انقباض پیدا فرمائے۔ تاکہ ہندوستانی مسلمان ہندوستان میں اپنے لئے مشکل حالات کے سامنے سے بچ جائیں اور وہ تمام تر خوش اسلوبی اور سکون و طمانیت کے ساتھ دین و مذہب پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنے بال بچوں کی بآسانی پرورش و تربیت کر سکیں۔ اور آنے والی نسلوں کے لئے کچھ ایسی بات پیدا کر جائیں کہ انھیں زمین ہند میں رہتے ہوئے فخر و نسلا اور سکون و راحت نصیب ہو سکے۔

سیاسی رہنماؤں اور حکمراں طبقوں میں آجکل ایک دوسرے پر الزامات لگانے کی جو ہوڑ لگی ہوئی ہے اسے دیکھتے ہوئے مستقبل کے ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کے بارے میں عجیب و غریب خدشات دل و دماغ میں پیدا ہونا قدرتی امر ہے۔ ابھی حال ہی میں مہاراشٹر کے سابق وزیر اعلیٰ عبدالرحمٰن انتولے نے اپنی پارٹی کے ہی وزیر اعلیٰ جو مہاراشٹر میں آجکل ہیں اور جن کا نام گرامی جناب شرد پوار ہیں پر بڑے

ہی سنگین الزامات لگائے ہیں۔

ٹاڈا قانون کے تحت اقلیتی فرقے کے افراد اور ان کی عورتوں تک پر ظلم وستم کے لئے جو انہوں نے کہا ہے اسے پڑھ کر بہت ہی افسوس ہوا۔ حقوق انسانی کمیشن نے بھی اس سلسلے میں جو کچھ کہا ہے اسکو دیکھتے ہوئے ہر محب الوطن انسان رنج وغم میں ڈوب گیا ہے۔ کاش! انھیں اس طرف توجہ دینے کا موقع میسر آجائے اور وہ ٹاڈا کے بیجا استعمال پر روک لگا سکیں تو یہ ملک کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ ملک میں کوئی ایک فرقہ پر غلط طریقہ سے ظلم وستم روا رکھا جائے تو یہ کسی بھی ملک کی بہتری کا کام نہیں ہوگا۔ بلکہ ملک دشمنی ہی پر اسے محمول کیا جائے گا۔ ہندوستان میں ہر انسان کو یکساں حقوق حاصل ہیں اور یہ ملک کے رہنماؤں کا خواب ہے کہ اس میں ہر شہری اطمینان وخوشی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرے۔ ملک کی آزادی کے لئے اسی خواب کو دیکھتے ہوئے تحریک چلائی گئی اور وہ کامیاب ہوکر رہی تو پھر آزاد ہندوستان میں کسی بھی شہری کو کوئی پریشانی یا تنگدستی ملے تو اس سے زیادہ ملک سے دشمنی اور کوئی ہو نہیں سکتی ہے!۔۔

****

مولانا ذوالفقار علی دیوبندی

حیات اور علمی کارنامے

تیسری اور آخری قسط

محمد نجم خاں، ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تسہیل الدراسۃ علی ترجمۃ الحماسۃ:

مذکورہ کتاب ابوتمام کے حماسہ کی شرح ہے:

شارح رحمہ اللہ نے دوران شرح ایجاز واطناب سے احتراز کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ زبان دانی کے سلسلے میں طلبہ کے معیار کو بلند کرنے کی غرض سے عربی محاورات و الفاظ اور حل لغات پر خصوصی توجہ مبذول کی ہے۔

بعد ازاں شعر کا معنی و مطلب بزبان اردو۔ مولانا کی یہ شرح دیگر شروحات کی طرح بزبان اردو و عربی ہے۔

انداز بیان و اسلوب خاص مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے۔ شارح نے مندرجہ ذیل عبارت میں ربیعہ بن عامر مسکین دارمی کے ایک شعر کی شرح فرمائی ہے۔ شاعر فرزدق کا ہم عصر ایک اسلامی شاعر ہے۔(۱)

وفتیان صدق لست مطلع بعضہم　علی سر بعض غیر انی جماعہا

الصدق، جب مضاف الیہ واقع ہو جیسا کہ بولا جائے "زید صدق" اس کا مطلب ہوگا کہ زید شرافت و کردار میں پختہ ہے۔

والمطلع: اطلاع دینے والا۔ الجماع بروزن زمام، جو اشیاء کو اکٹھا کرے اور فتیان بحالت جر

جماعت کے معنی میں۔

ترجمہ: اور بہت سے عمدہ اور بھلے مانس جوان ہیں کہ میں ان کے بھید پر دوسرے کو مطلع نہیں کرتا، ہاں میں ایک جگہ بیٹھنے کا باعث ہوں، اپنی رازداری کی تعریف کرتا ہے۔

مولانا دیوبندی اسلامی شاعر شمیذر حارثی کے ایک شعر کی شرح کرتے ہیں:

بنی عمنا لا تذکروا الشعر بعدما　　دفنتم بصحراء الغمیر القوافیا (۲)

مذکورہ بالا عبارت میں شعر سے مراد فخر و مباہات کے اشعار ہیں۔ یا علی الاطلاق شعر مراد ہے۔ اور قوافی (اشعار) کے دفن کرنے سے اپنے چچازاد بھائیوں کی شکست و ہزیمت کی طرف اشارہ کر رہا ہے یا چچازاد بھائیوں کے شعراء کی موت سے کنایہ ہے۔

الغمیر الاول الغین بمد ۂ المیم، علاقہ بنو کلاب میں ایک جگہ کا نام ہے۔ القوافی نسبۃ الکل باسم الجزء کے ضابطے سے۔

تسہیل البیان فی شرح دیوان المتنبی؛

یہ بھی مولانا ذوالفقار علی دیوبندی کی ایک تصنیف ہے جو کہ دیوان حماسہ کی شرح کے طرز پر ہے۔ مولانا رحمہ اللہ مقدمۂ کتاب میں تحریر کرتے ہیں:

- میں نے اس شرح میں یہ خیال رکھا ہے کہ نہ تو اتنی مختصر ہو کہ سمجھنے میں دشواری لاحق ہو اور نہ اتنی تفصیل کہ جس سے طبیعت اکتا جائے۔
- حل لغات، تحقیق محاورات، توضیح مفاہیم اور تشریح الفاظ میں "عبکری" کی بنیان کا سہارا لیا ہے۔ اس لئے کہ عبکری کی نگاہ دوررس کم و بیش تمام شروحات پر ہے۔
- ہر شعر کی لغت کا مفہوم واضح کیا گیا ہے۔ حسب ضرورت محاورات کی عربی میں تشریح الفاظ شعر کا بزبانِ اردو ترجمہ۔ (۳)

انداز بیان بطور نمونہ ملاحظہ ہو!

اسفی علی اسفی الذی دلھتنی　　عن علمہ فیہ علیّ خفاء

خفاء: مبتدا مؤخر۔ علیّ اس کی خبر پہلا [illegible] سے متعلق ہے اور اخیر کے

دونوں حروف جار (عن، فی) شفاء کے متعلق ہیں۔

الأسف: رنج والم، المولہ" جس کی عقل خراب ہو گئی ہو۔

ترجمہ: مجھ کو رنج اس غم کے جاتے رہنے کا ہے جس کے ادراک لذت سے تونے غافل و مدہوش کر دیا ہے، کہ اس غم کی کیفیت مجھ پر پوشیدہ ہو گئی ہے۔ یعنی مجھ کو بہ سبب شدت صعبات محبت و آلام فراق یہ معلوم نہیں رہا کہ غم عشق کیا چیز ہے؟ عاشق لوگ غم و درد عشق کو نہایت عزیز ولذیذ سمجھتے ہیں۔ اب چونکہ بہ سبب مصائب محبت وتکالیف فرقت اس کو اس کا ادراک نہیں رہا۔ لہٰذا اس کی یاد میں کف افسوس ملتا ہے۔ واقعی درد عشق بڑے مزے کی چیز ہے۔ جیسا کہ ذوق نے کہا ہے ؎

درد دل سے عجب اک لطف ہے حاصل ہوتا

سر سے پاؤں تلک اے کاش کہ میں دل ہوتا

کہیں کہیں مولانا ذوالفقار علی نے شارح عبکری کی رائے سے نا اتفاق کیا ہے اور مفہوم شعر اپنی الگ رائے و نظریہ پیش کیا ہے۔ بطور نمونہ ملاحظہ ہو!

وشکیتی فقد السقام لانہ   قد کان لما کان لی اعضاء

مولانا رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عبکری کے بقول، شاعر محبت سے دوچار ہونے کی وجہ سے اپنے اعضاء بدن کی توانائی کے سلب ہو جانے پر اظہار افسوس کر رہا ہے۔ اور شاعر کی تمنا ہے کہ کاش اس کے اعضاء درست ہو جائیں یا اے کاش اس کے اعضاء کی تمام تر قوتیں دوبارہ عود کر آئیں۔

لیکن درحقیقت اس قسم کی تمنا عاشق کی شان سے بعید ہے شاعر تو وہ ہے کہ جو زیادتی محبت کی تمنا کرتا جائے تا آں کہ وہ ہلاک ہو جائے جیسا کہ شعر مذکور سے ظاہر ہے۔

خاص طور سے آئندہ شعر میں ؎

فی خطہ من کل قلب شہوۃ   حتی کأن مدادہ الاھواء

ترجمہ ومطلب! ممدوح کے خط کی ہر دل میں خواہش اور رغبت ہے۔

یہاں تک کہ گویا اس کی روشنائی لوگوں کی محبت ہے یعنی گویا کہ ممدوح لوگوں کی

خواہشوں کی روشنائی بنا کر لکھتا ہے۔ اور اس لئے اس کے خط کو سب لوگ پسند کرتے ہیں۔

اس صورت میں اس کی خوش خطی کی تعریف ہوئی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کنایہ ہو اس کی بخشش سے یعنی اس کی سب تحریریں درباب عطا رسائین ہوتی ہیں اس لئے کہ اس کا لکھا ہوا ہر ایک کو مرغوب ہے۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ کنایہ لوگوں کی اطاعت سے ہو کہ تمام آدمی اس کے حکم کو برضا و رغبت قبول کرتے ہیں۔ اور اپنی خواہش کے موافق سمجھتے ہیں۔

ارق علی ارق و مثلی یارق　　　وجوی یزید وعبرۃ تترقرق (۴)

یہ شعر متنبی کے ایک قصیدے کا جزء ہے جو اس نے ابوالمنصر شجاع بن محمد بن اوس کی مدح میں لکھا تھا۔

مولانا ذوالفقار علی نے اس کی شرح میں لکھا ہے:

الارق: نیند کا اچاٹ ہو جانا۔ الجوی: وہ غم جو انسان کے اندر ہوتا ہے۔

العبرۃ: آنکھوں کا آنسوؤں سے ڈبڈبا جانا۔ رقرقۃ الماء: پانی بہانا۔

ترجمہ: میرے لئے بیداری پر بیداری ہے۔ یعنی بیداری کی تہیں چڑھی ہوئی ہیں۔ اور مجھ جیسا عاشق بیدار رہتا ہے بہ سبب شدت درد عشق کے۔ اور میری سوزش اندرونی دم بدم بڑھتی ہے۔ اور آنسو ڈبڈبائے رہتے ہیں۔

الهدية السنية:

حضرت مولانا ذوالفقار علی کا تصنیف کردہ ایک مختصر سا رسالہ ہے جس میں موصوف نے مدرسہ اسلامیہ دیوبند کے قیام کی تاریخ تحریر کی ہے۔ جو آگے چل کر دارالعلوم کے نام سے مشہور ہوا اس رسالہ میں بانیان مدرسہ جیسے محمد عابد حسین (الحاج) اور مولانا قاسم نانوتوی کا تذکرۂ خاص ہے۔

کتاب میں مؤلف کا نظم کردہ ایک قصیدہ ہے جس میں حضرت مولانا قاسم نانوتوی کی مدح سرائی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اشعار بھی ہیں جن میں حضرت نانوتوی اور سوامی دیانند کے درمیان

ہونے والے مناظرہ کی منظر کشی کی ہے (سوامی دیانند ہندو مذہب کا بہت اہم اور عظیم رہنما گذرا ہے)

ایک مرثیہ بھی اس رسالہ کی زینت ہے۔ جس کو مولانا نانوتوی کے وصال پر نظم کیا تھا۔ نیز اس میں دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دینے والے اساتذہ کا بھی تذکرہ ہے۔

اس رسالہ کا عربی نثر میں جو ادبی مقام ہے کسی کو جائے انکار نہیں۔ کیونکہ اس کا نثری اسلوب سلیس شیریں اور اس دور کے عرب ادبا ر و مصنفین کے ہم پلہ ہے۔ جیساکہ ذیل کے اقتباس سے واضح ہوتا ہے۔

هو رأس الكرام، وهامة الشرف، وعين الجود وانف الألف وقلب السيادة كبد السعادة، وسلم السودد والمجد وغارب الفضل والرفد، وصدر الصدارة، يمين المهارة، وراحة الأراحة ومراحة السماحة، ومعدة العلم والحكمة وعضد العضد، ومعصم العصمة، وانامل عقد العويصات، واسنان مفاتيح الرزبات وزند الامتنان والاحسان۔

قد أسند الى المعالي بلا تعريس وتدريج واوب الى المكارم بغير تعريف وتفريج، فريش ذاك الشيخ الماجد السيد محمد عابد واخذ بصنيعيه ووصل بجناحيه، فاخضرت رياض العلوم واترعت حياضها والتفت خمائلها وغياضها فصارت المدرسة بحيث يضرب اليها اكباد الابل من كل مرمى سحيق والطلاب يجيرونها من كل فج عميق، من اطراف الهند، وجزائرها بل من العرب ونظائرها

اساتذہ کا تذکرہ اس پیرایہ میں کرتے ہیں:

لله درهم رسيه فهم الملائكة فى صور البشر، مستنيرة الوجوه كالشمس والقمر، ومكتسبي الاخلاق كالعود والعنبر، نجوم الهداية والارشاد ابرار اتقاء اخيار، اركان الدين وعمد اليقين۔ اصحاب التحقيق، ارباب التلفيق، قوم لا يشقى بهم جليسهم ولا يتوحش انيسهم، هم لله تعالى، وفود وجنود سيماهم فى اثر السجود اولئك حزب الله الا ان حزب الله هم المفلحون۔

عربی شاعری

مولانا ذوالفقار علی کو عربی نظم و نثر میں مکمل قدرت تھی۔ بقول مولانا اصغر حسین دیوبندی مولانا کو علوم ادبیہ سے خاص مناسبت تھی، نظم و نثر آپ کی عرب العرباء کی یاد دلاتی ہے۔

بقول مفتی عزیز الرحمٰن "مولانا عربی ادب میں نہایت اونچے مقام کے مالک تھے۔ عربی زبان میں بہت سی نظمیں اور مراثی لکھی ہیں"

انہوں نے عربی میں جو شاعری کی ہے صرف چند کتابوں میں تقریباً تین سو اشعار دستیاب ہیں۔ کہیں آپ کا کلام یکجا صورت میں نہیں۔

ہندوستان کے مشہور پھل آم کی نسبت بطرز بدیع تحریر فرمایا ہے:

ان كنت تبغي الطيب اللذات — نعليك صاح بانبه الثمرات
في حسن مرءٍ في نباهة سيرةٍ — في لطف ذات في سمو صفات
من طعمها في كل قلب شهوة — فكانها مجموعة الشهوات
يا حسن حمرتها و خضرتها وصُف — رَنها على الاشجار في الروضات
فكانها الوان وجنات الحيا — ئب مسها العشاق في الخلوات
واذا عصارتها مَصَصْتَ وجدتها — احلى كمثل رضاب محبوبات (۵)

سلطان عبدالحمید کی مدح کے چند اشعار:

سفاكة وحياة العاشقين بها — فتاكة وهي مع مرهم العلل
هيفاء ضامرة لعساء غادرة — بيضاء ساحرة بالغنج والكحل
كالشمس تبدو وجهارا غير خافية — وتستر بالاستار والكلل
انت التي بعيني نعدا — قلبي جريحا بجرح غير مندمل
العادل البازل المرهوب سطوته — في الجود كالبحر بل كالعارض الهطل
لله جنتك ابطال النزال ومن — في الكر كالليث في التمكيل كالجبل
يا آل عثمان ويا فخر الكرام ويا — خير الانام لانتم منتهى امل

وقد دعانی الی الانشاد مجدکم قسرا فلست باهل الشعر والغزل
امد اد کم فی حضیض الذل من ذیل احبابکم من ذری العلیا فی قلل (۶)

مولانا قاسم نانوتوی کی وفات حسرت آیات پر بزبان عربی حسان الہند مولانا ذوالفقار علی کا اظہار درد:

یا قاسم الخیر من للعلم والدین اذا ارتحلت وارشاد وتلقین
یا قاسم الخیر من الطارقین ومن للضارعین ومکروب ومحزون
یا قاسم الخیر اسمع من لکربتنا یا قاسم الخیر قل من للمساکین
من للمدارس من للوعظ من لهدی من للنکات وتوضیح وتبیین
من للمدارس من للوعظ من لهدی من للحقیقة اذا رسبت فی الطین
رحلت عنا ولم یوجد علی یلک ذال علوم والفضل من عرب الی صین
یا امین جودی بدمع غیر منقطع علی الذی جل من مدح وتابین
بحر العلوم امام الکون اکرمه مبارک الاسم والزیتون والتین
لقد مضی صاحبی من فی مصیبته برئت من ذکر اسلاء وتسکین
منزلی بعد رین الاحزان منقطع من لی بقلب بصبر غیر مقرون (۷)

علمی وادبی مقام:

مولانا ذوالفقار علی دیوبندی کا علمی وادبی مقام بہت ہی بلند ہے۔ اس کا اندازہ آپکی گراں قدر تصانیف سے ہوتا ہے۔ مولانا عربی و فارسی کے ممتاز ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

مولانا سید محمد میاں صاحب آپ کی علمی وادبی منزلت کے بارے میں لکھتے ہیں: "ان (ذوالفقار علی) کی ادبی خدمات علوم شرعیہ کی یونیورسٹی میں بہت زیادہ قدر و منزلت رکھتی ہیں" (۸)

مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی کے خیال میں "وہ ادب میں نہایت اونچے مقام کے مالک تھے"۔ ڈاکٹر زبیر احمد فاروقی ان کی کتاب "الہدیۃ السنیہ" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس کتاب کی ادبی اہمیت سے انکار ممکن نہیں، اس میں جس قدر اسلوب کے عمدہ نمونے ہیں، اور

اس طرح کی دیگر تصانیف بھی ان کی ادبی و علمی عظمت پر شاہد عدل ہیں۔ مولانا ذوالفقار علی دیوبندی کے متعلق فرانس کا مشہور مصنف گارساں دتاسی، لکھتا ہے کہ آپ دہلی کالج کے طالب علم تھے، چند سال بریلی کالج میں پروفیسر ہوگئے، ۱۸۵۸ء میں میرٹھ میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔

مسٹر ٹیلر ان سے واقف تھے ان کا بیان ہے کہ ذوالفقار علی ذہین اور طباع ہونے کے علاوہ فارسی اور مغربی علوم سے واقف تھے۔ [9]

آپ مولانا نانوتوی اور مولانا احسن نانوتوی کے درمیان آرام فرما ہیں۔ مولانا فضل الرحمن عثمانی کے ایک شعر سے اس کی دلچسپ نشان دہی ہوتی ہے شعر یہ ہے۔

بحسب آسودہ تر ما بین دو یاران خویش
قاسم بزم مودت، احسن شائستہ خو

مراجع و مصادر

(۱) تسہیل الدراسۃ فی ترجمۃ الحماسہ ص ۳۳۰

(۲) ترجمہ: اے ہمارے چچا زاد بھائیو! اپنے فخریا مطلق اشعار، بعباس کے کہ تم صحرار غمیر میں اپنے اشعار یا اپنے شاعروں کو دفن کر دیا، کہنا چھوڑ دو، کیونکہ تم وہاں سے بھاگ گئے بس اب کیا موقع فخر کا رہا۔
(تسہیل الدراسۃ ص: ۲۶)

(۳) تسہیل البیان فی شرح دیوان للمتنبی۔

(۴) " " " " ص: ۳۶۶۔

(۵) الھدیۃ السنیۃ ص: ۱۱

(۶) قصائد قاسمی ص ۲۲-۲۶۔

(۷) نزھۃ الخواطر ص ۱۳۱، ج ۸۔

(۸) علماء ھند کا شاندار ماضی ص ۱۹۵ سید مولانا محمد میاں۔

(۹) گارساں دتاسی بحوالہ مولانا احسن نانوتوی ص ۲۷۔

شیخ عبدالسلام شاہ اعلیٰ چشتی پانی پتی

ڈاکٹر محمد اقبال، سینئر لکچرر شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ — نئی دہلی ۲۵

شیخ عبدالسلام شاہ اعلیٰ چشتی پانی پتی گازرونی مکی و مدنی قریشی جنھوں نے کہ اپنے والد بزرگوار حضرت شیخ نظام الدین اور شاہ نظام نارنولی سے خرقۂ خلافت پایا جیساکہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

را بہ بندگی او کہ ہست فخر تمام — مرید شاہ نظام است واین شیخ نظام[۱]
نظامش پیر و ہم پدرش نظام است — نظام دو جہاں بروی تمام است

چنانچہ مشہور ہے کہ حضرت الہدیہ چشتی بھی آپ سے ارادت و بندگی رکھتے تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ امیر المومنین حضرت عثمان کے سلسلۂ نسب سے ہیں۔ آپ کا یہ شجرہ تفصیل طلب ہے اور بسبب طوالت اس کا یہاں نقل کرنا مناسب بھی نہیں ہے اور نہ ہی موضوع کے اعتبار سے اس کی یہاں ضرورت ہے۔ بہر حال لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ خاندانی اور نسبی طور سے بہت بڑے بزرگ تھے۔ مصنف "سیر الاقطاب" نے لکھا ہے کہ آپ کے ملفوظات "جواہر اعلیٰ"[۲] کے نام سے مشہور ہیں۔ اور جس میں شاہ اعلیٰ کی محفلوں اور تعلیمات کو الہدیہ چشتی نے الگ سے درج کیا ہے۔ انہوں نے جواہر اعلیٰ سے چند واقعات اپنی کتاب سیر الاقطاب میں نقل کئے ہیں۔ جنھیں ہم ان کی بزرگی اور ان کے کشف و کرامات پر محمول کرتے ہیں۔ بابر اور ہمایوں کے زمانے کے کئی واقعات کو الہدیہ چشتی نے بیان کیا ہے۔ یہ وہ واقعات ہیں جن سے

۱۔ سیر الاقطاب ص ۲۳۲ مطبع نول کشور پریس ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء

۲۔ ایضاً ص: ۲۳۴۔

شاہان وقت نے فتح ونصرت حاصل کی اور شاہ اعلیٰ کے کشف و کرامات کا چرچا عام ہوا۔

الهدیہ چشتی نے شیخ عبد السلام شاہ اعلیٰ پانی پتی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ پہلے انھیں شیخ عبدالسلام کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ اپنے والد کے زیر تربیت ظاہری و باطنی علوم کی تعلیم پا رہے تھے کہ ان کا جی چاہا کہ وہ کعبہ کا طواف کریں اور وہ روانہ ہوئے، راستہ کی خرابی کیوجہ سے حج بیت اللہ نہ پہونچ سکے اور رسالوں پہنچ گئے وہاں پر آپ کی ملاقات قراخان سے ہوئی۔ قراخان بابر کے امراء میں سے تھا اور مالوہ کا حاکم تھا شاہ اعلیٰ اس کے یہاں سپہ گری کے شعبہ میں تیر اندازی پر معمور ہو گئے وہ آپ کا بہت معتقد تھا۔

شیخ عبد السلام پانی پتی نے شیخ حمزہ سے بھی ملاقات کی جو اپنے وقت کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ شاہ اعلیٰ نے اپنے سفر کے بہت سارے واقعات، قیام اور ملاقات کا ذکر جواہر اعلائیہ کیا ہے وہ بحیثیت ایک سپاہی کے ملتان، گجرات، لاہور اور جونپور میں سیر و سیاحت کرتے رہے بالآخر اپنے والد کے کہنے کے مطابق سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر عشق الٰہی کے کوچے میں داخل ہو گئے اور سارا مال و متاع لٹا کر عشق الٰہی میں قلندرانہ زندگی اختیار کر لی، جونپور میں بہت سے پائے کے بزرگوں سے جیسے شیخ بہاء الدین، شیخ شمس الدین اور میر سید علی اور بہار میں شیخ علی مقربی، مولانا حسام الدین بغدادی، شیخ صلح، مولانا علی احمد، شیخ عبدالصمد اور شیخ نظام اور گجرات میں قاضی محمود وغیرہ سے ملاقات کی۔ ان بزرگوں سے کسب فیض حاصل کیا اور پھر اپنے وطن لوٹ آئے اور اپنے پیران پیر شمس الاولیاء مخدوم شیخ شمس الدین ترک کے روضۂ مبارک اور خانقاہ کے گرد طواف کیا۔ جب زیادہ پریشانی لاحق ہوئی تو ان کے والد نے یہ بشارت دی انشاء اللہ تم بزرگی کا مرتبہ پاؤ گے اور خلق خدا کو تم سے فیض حاصل ہوگا۔ وہیں چلہ کیا اور شیخ نظام نارنولی کا دیدار حاصل ہوا جسے دیکھ کر یہ شعر پڑھا۔

مست و مدہوش آن جمال شدم   طالب جرعہ وصال شدم [1]

اس ملاقات نے انھیں قلندری کا راستہ دکھایا اور نارنول کا سفر کیا اور پیر کی خدمت میں

---

[1] سیر الاقطاب ص ۲۳۸

حاضری دی۔ انہوں نے عمامہ اور جوتیاں عنایت کیں اور ایک خط بھی مرحمت فرمایا۔ اس طرح شیخ اعلیٰ پانی پتی کا قلب پاکیزہ ہوا اور انہیں اپنے پیر و مرشد کی جوتیاں صاف کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اور انہوں نے یہ فرمایا " از ہمہ اعلیٰ شدی "[1] اسی دن سے اعلیٰ نام سے مشہور ہو گئے اور یہی نام شجرہ میں داخل کر لیا گیا۔ سالہا سال تک پیر و مرشد کے زیر سایہ ریاضت و مجاہدہ کرتے رہے۔ پھر حجرہ میں شیخ نے طلب کیا اور تمام باطنی نعمتوں سے مالا مال کر کے ان کو وطن جانے کی اجازت دی خلافت بخشی اور کہا کہ تمہارے دادا جلال الدین کبیر الاولیاء نے خواب میں آ کر تمہیں میرے پاس سے لے جانے کی اجازت چاہی ہے۔ کیونکہ وہاں کی خانقاہ خالی پڑی ہے۔ شیخ اعلیٰ پانی پتی جب اپنے پیر و مرشد سے رخصت ہو کر خرقہ و خلافت اور عصا و تسبیح لے کر پا پیادہ آگرہ کے نزدیک پہونچے تو معلوم ہوا کہ آپ کے والد محترم حضرت نظام الدین پانی پتی کا انتقال ہو گیا ہے۔ چنانچہ پانی پت تشریف لائے سجادگی کے مقام پر بیٹھے اور اپنے بزرگوں کی امانت اور خانقاہ کی خدمت میں مشغول ہو گئے۔ البتہ یہ چشتی نے آپ کے کشف و کرامات کے حالات کو جواہر اعلیٰ میں قلمبند کیا ہے اس میں آپ کے پانی پت پہونچنے اور سجادہ نشین ہونے کے فوراً بعد کا ایک واقعہ بہت ہی مشہور ہے کہتے ہیں کہ سجلوگی کے مقام پر بیٹھنے کے بعد ایک گڑھے میں پانچ روز تک بغیر کھائے پڑے رہے اور یہ عہد کر رکھا تھا کہ جب تک غیب سے کوئی چیز نہیں آئے گی افطار نہیں کروں گا۔ حد درجہ کمزوری کے بعد ایک نورانی صورت سے آواز لگائی اور کوئی سفید چیز ہاتھوں میں لے کر آئے جو کہ روٹی کی شکل کی تھی لیکن اس کی لذت عجیب تھی کھلا کر چلے گئے ہر چند کہ شاہ اعلیٰ نے ان کا پیچھا کیا لیکن پتہ نہیں چلا، خواب میں اس شخص کو دیکھا اور جو کچھ اس نے جواب دیا اس سے تسلی ہوئی۔ اس طرح کے بہت سے روایتی واقعات آپ کی ذات سے منسوب ہیں۔

ذوق سماع:۔ آپ کو سماع سے خاص دلچسپی تھی اپنے دادا جلال الدین کبیر الاولیا پانی پتی کے عرس کے موقع پر سماع سے رغبت فرمایا کرتے تھے۔ آپ کو حضرت شیخ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی سے بھی عقیدت تھی اور اکثر ان کے مزار پر حاضری دیا کرتے تھے۔

---

[1] سیر الاقطاب ص: ۲۳۸۔

الہدیہ چشتی نے شاہ اعلیٰ پانی پتی کے بہت سے آنکھوں دیکھے واقعات بیان کئے ہیں اور ان کا جستہ جستہ ذکر انہوں نے سیر الاقطاب میں کیا ہے جن کی تفصیل "جواہر اعلیٰ" میں نقل کی ہے ان میں کشف و کرامت کے بہت سے واقعات رواجی انداز میں بیان کئے گئے ہیں جن پر کچھ شبہ ہوتا ہے اور ذہن قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا لیکن الہدیہ چشتی یہ لکھتے ہیں کہ میں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس میں تمام واقعات حقیقت پر مبنی ہیں۔ اور یہ شعر لکھتے ہیں۔

بندۂ اویم بجان و دل بصدق اعتقاد	گر درین باشد خلاف اندر دل من کافرم [1]

الہدیہ چشتی ایک اور مقام پر یہ لکھتے ہیں کہ آپکی عمر ایک سو پچیس سال تھی اور آپ نے اپنی عمر کی ایک رسی بنا کر اس میں گرہیں لگا رکھی تھیں ایک دن منگوا کر گنیں اور یہ کہا کہ ۱۲۵ ہو گئیں جبکہ میں نے کئی سال سے گرہیں نہیں لگائی ہیں۔ ایک اور بات لکھتے ہیں کہ آپ کے دانت دوبارہ آگئے تھے داڑھی کے سفید بال سیاہ ہو گئے تھے اور پھر سفید ہو گئے تھے کسی شخص نے ان واقعات کو فارسی میں نظم کیا اور الہدیہ چشتی نے ان اشعار کو واقعات کی تصدیق کے طور پر نقل کیا ہے۔

بسان او درین عالم بگو کیست	کہ باشد عمرش افزوں از صد و بیست
پس از صد سال دندان تازہ روئید	چنیں پیری خدا بین ہیچ کس دید
دوبارہ شد سیہ موی سفیدش	سفیدی داد دوبارہ نویدش
بود واجب سپاس او بہر کس	ز دیگر ذکرہا ذکرش بود بس
علوی الشان و شاہ العالمین است	کہ فخر آسمان و ہم زمین است
سزاوار امامت ہم ولایت	بدو زیبد کرامت ہم ہدایت
امام و ہادی برنا و پیر است	کہ ہم پیر است و ہم روشن ضمیر است [2]

شیخ عبد السلام شاہ اعلیٰ چشتی پانی پتی نے ۲۵ ربیع الاول ۱۰۳۳ھ/۱۶۲۴ء کو بدھ کے دن رحلت فرمائی اور وہیں پانی پت میں سر سید علی متقی کے روضۂ مبارک کے پاس دفن ہوئے۔ الہدیہ چشتی نے

---

[1] سیر الاقطاب ص: ۲۴۵۔

[2] سیر الاقطاب ص: ۲۴۷، ۲۴۸۔

[3] ؍؍ ؍؍ ص: ۲۴۸۔

آپ کی وفات پر کچھ اشعار لکھے ہیں جن سے آپ کی بزرگی عظمت اور کشف و کرامت کے واقعات کی تصدیق ہوتی ہے۔

دریای کشف و کان کرامات و ملک جود — کز فیض او گرفت جہان عدم وجود

شیخ یگانہ پیر زمانہ کہ از نگاہ — چشم و چراغ اہل جہاں را ضیا فزود

حق گوی شاہ اعلی کور بود در جہانش — ہر دیدہ دید گفت کہ بر مصطفی درود

پیری کہ از عنایت او کس زبان نہ کرد — سر سود ہر کہ بر در او طرفہ برد سود

شاہی کہ از کمال ولایت جہان گرفت — خورشید را ہمیشہ بود بر درش سجود

از پیش دیدہا چو یکایک شدہ نہاں — از ماتمش نمود فلک جامہ را کبود

تا از دلت چو سال وصالش بخواستم — آمد مرا ز غیب ندا شیخ قطب بود[۱] ۱۰۳۲ھ

خزینۃ الاصفیا کے مصنف نے ان کی عظمت و بزرگی اور مقبولیت کے پیش نظر ان کی پیدائش اور ان کی وفات کا ذکر مندرجہ ذیل قطعہ میں کیا ہے۔

جناب شاہ اعلی پیر اسلام — نظام دین و دنیا شیخ والا

عجب تولید آں پیر صفا کیش — شدہ روشن ز مہتاب تجلّی

دو بارہ شاہ اعلی شمع دین خوان — پئے تولید آں پیر مزکی

بگو بالغ بخواں غالب بترحیل
ذکر سرور معلی شاہ اعلی[۲]

---

[۱] سیر الاقطاب ص: ۲۴۸۔
[۲] خزینۃ الاصفیا ص: ۴۶۱۔

عہد مغلیہ یورپی سیاحوں کی نظر میں

(۱۶۱۶ء تا ۱۶۱۹ء)

قسط نمبر ۱۴

پروفیسر محمد عمر، شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

تفریحی مشاغل اور کھیل کود!

۱۔ گھریلو مشغلے ؛ وہ لوگ تاش کھیلتے تھے جن کے پتوں کی تعداد "زیادہ" ہوتی تھی۔ شطرنج کھیلنے میں بھی انہیں اچھی خاصی دسترس حاصل تھی۔ ان کے علاوہ وہ لوگ بازی گروں اور شعبدہ بازوں سے اپنا دل بہلاتے تھے۔ جو اپنے کرتب دکھا کر انھیں محظوظ کیا کرتے تھے۔ ان کرتبوں میں ایک کرتب یہ تھا کہ وہ لوگ" سورچھل کی کھلی چوڑی ڈلیاں لاتے، اور سب تین چار خالی ڈلیاں تلے اوپر رکھ دیتے لیکن جب وہ انھیں اٹھاتے تو ان میں سے ہر ایک کی تہ سے چند جنگلی فاختے نکلتے۔ دوبارہ وہ انھیں ڈھک دیتے، اچھالتے اور الٹ دیتے اور فاختے غائب ہو جاتے۔

۲۔ کھلے میدانوں کے کھیل!

چھوٹے بازوں کی مدد سے وہ لوگ تیتر، بٹیر اور پرندوں کا شکار کرتے تھے۔ بارہ سنگھوں کا شکار وہ چیتے کی مدد سے کرتے۔ شکار کے تعاقب کرنے کے لئے وہ کتے ساتھ رکھتے تھے لیکن "شکار کئے ہوئے جانور کا تعاقب کرنے کے لئے انھیں نہیں کھولتے تھے"۔ عمدہ نشانہ بازی کے ساتھ ساتھ تیر اندازی ان کا دوسرا تفریحی مشغلہ تھا۔ بندوقوں سے

وہ شکار مارتے۔ وہ صرف ایک گولی استعمال کرتے تھے۔ نشانہ لگانے میں وہ کچھ زیادہ دیر کیا کرتے تھے لیکن "نشانہ خالی نہیں جاتا تھا" گھوڑ سواری کا بھی ان کے تفریحی مشاغل میں شمار ہوتا تھا۔

تسلیمات کا طریقہ؛

ایک دوسرے یا کسی اجنبی سے ملنے کے موقع پر وہ لوگ یا تو اپنے سروں کو جھکا کر یا اپنا دایاں ہاتھ اپنی چھاتی پر رکھ کر وہ آگے بڑھتے ہوئے اپنے جسم کو جھکا لیتے تھے۔ "ساتھ ساتھ بہت دعائیں دیتے تھے"، اپنے قریبی دوستوں کو سلام کرتے ہیں وہ لوگ دوسروں کی ٹھوڑیاں یا داڑھیاں پکڑ لیتے اور زور سے یہ کہتے کہ وا" بابا" جس کا مطلب باپ تھا یا بھائی۔ ان کے سلام کرنے کا طریقہ "سلام علیکم" اور جواب" والک الاسلام یا غریب نواز" پر مشتمل تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ غریبوں کے لئے دعائیں کریں۔ اس کا جواب یہ ہوتا تھا۔ "تیری گھڑی گھڑی کی بلا ٹلے"

مہمانوں کی خاطر تواضع؛

اپنے مہمانوں کی وہ لوگ "بڑے انکسار" کے ساتھ خاطر تواضع کرتے تھے۔ اٹھ کر پہلے جھک جاتے اور اپنے ساتھ قالین پر بیٹھنے کی مہمان سے درخواست کرتے۔ چاہے کسی معاملے کی بات چیت ہو رہی ہو وہ "بڑے اخلاق اور شائستگی" سے جواب دیتے۔ انھیں پان پیش کرتے۔

آصف خاں کے ہاں دعوت؛

آصف خاں نے تھومس رو کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔ اس کا خیمہ "خوشگوار خوشبوؤں" سے معطر تھا۔ اور بڑی عمدہ قالینیں زمین پر بچھی تھیں۔ جس جگہ پر کھانے چنے جانے والے تھے وہاں قالینوں کو خراب ہونے سے بچانے کے لئے چمڑے کی ایک چٹائی بچھا دی گئی

اس کے اوپر "عمدہ سفید چھینٹ کا دستر خوان بچھا دیا گیا" اس کے اوپر نقرئی تشتریاں رکھدی گئیں۔ وہ لوگ "مثلث نما" صورت میں بیٹھے۔ آصف خاں کی دائیں طرف تومس رو اور اس سے "اچھی خاصی دوری پر" اور ٹیری نیچے۔ ایک دوسرے کے آمنے سامنے وہ لوگ پالتی مار کر زمین پر بیٹھ گئے" ان سب کے کھانے الگ الگ تھے۔ تومس رو کے سامنے" کھانے کی مجھ سے دس تشتریاں زیادہ اور میرے سامنے کھانے کی دس تشتریاں کم تھیں"۔ اس کے بعد ہمارے میزبان کے سامنے کھانے چنے ہوئے تھے۔ لیکن میرے سامنے پچاس قسم کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ مہمانوں کے سامنے" یہ کھانے بیک وقت چن دئے گئے تھے"۔ ان کے درمیان میں چھوٹا سا ایک رستہ چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ نوکر کھانے والے کے پاس کھانا پہنچا سکیں۔

ان رکابیوں میں سفید، زعفرانی، ہرے اور زرد رنگ کے چاول رکھے تھے"۔ متعدد قسموں" کے دوسرے کھانوں کی تشتیں بھی دستر خوان پر رکھی گئی تھیں۔ مثلاً مرغ اور پرندوں کا بھنا ہوا گوشت وغیرہ۔ ان کے علاوہ یہ چیزیں بھی تھیں۔ کئی قسموں کی جلیبیاں، فرنی، اخروٹ ملے ہوئے چاول، مرغ کے گوشت کی فرنی، آٹے کی ٹکیاں، آلو، انوکھے پھلوں کے سلاد، بعض میٹھی اور بعض سادہ۔ اچھے گیہوں کی سفید اور ہلکی گول گول چپاتیاں تھیں۔ پینے کے لئے پانی۔

سواریاں :

اعلیٰ طبقے کے لوگ بعض مرتبہ گھوڑوں اور کبھی کبھی ہاتھیوں پر سوار ہو کر سفر کرتے تھے۔ وہ لوگ بیل گاڑیاں بھی استعمال کرتے تھے۔ جب وہ سفر پر روانہ ہوتے تو ان کے ساتھ زین کسے ہوئے گھوڑے بھی ہوتے تھے۔ بعض مرتبہ وہ لوگ پالکیوں پر سواری کرتے تھے جن پر پردے پڑے ہوتے تھے۔ ان میں وہ دراز ہو کر لیٹ جاتے تھے۔ زیادہ تر منصبدار ایسی ہی سواریاں پسند کرتے تھے۔

جنازے اور قبرستان :

کسی بڑے آدمی کے جنازے کے ساتھ" بڑی تعداد میں ماتمی لباس پہنے لوگ ہوتے تھے"۔

وہ آنکھ جس سے آنسو نہ بہ رہے ہوں، انہیں اچھی نہیں لگتی تھی۔ ان میں سے بیشتر لوگ اپنی زندگی ہی میں نہ صرف اپنے لئے بلکہ اپنے قریبی دوستوں اور رشتہ داروں کے لیے مقبرے تعمیر کروا لیتے تھے۔ ان کا قبرستان مضبوط ایک چار دیواری کے اندر ہوتا تھا۔ اگر ممکن ہوتا تو یہ قبرستان کسی تالاب یا جھرنے کے قریب بنائے جاتے تھے۔ ان میں خوشگوار فوارے، چھوٹی مسجدیں بنائی جاتی تھیں۔ پھلدار درخت لگائے جاتے تھے۔ اور ان کے امیروں کے "پسندیدہ" پھول لگائے جاتے تھے۔

اوقاف:

"بعض دولت مند لوگ بڑے شہروں اور قصبوں میں سرائیں تعمیر کرواتے" جن میں بلا کرایہ مسافر ٹھہرتے تھے۔ دوسرے لوگ کنوئے اور تالاب بنواتے۔ وہ ایسے نوکر رکھتے تھے جو" جانوروں اور مسافروں کو پانی پلانے کے لیے" ہر وقت سڑک پر موجود رہتے تھے۔ اس خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا تھا۔

(۶) عوام: سب لوگوں میں یکساں خصائص

عادات، اطوار و حلیہ: بالعموم ان کا قد "بہت سیدھا ہوتا تھا" ٹیری نے نہ تو کسی ایسے آدمی کو دیکھا تھا جسکی کمر جھکی ہو یا ایسے آدمیوں کے بارے میں سنا ہی تھا۔ نہ ہی ان میں اس نے کسی لولے لنگڑے، یا بیوقوف یا قدرتی طور پر احمق آدمی کو دیکھا تھا۔ لوگوں کے چہرے کا رنگ زیتونی ہوتا تھا۔ ان کے بال "پہاڑی کوے کی طرح کالے، بہت سخت لیکن گھنگرالو نہیں تھے"۔ وہ لوگ بہت زیادہ سفید فام عورتوں اور مردوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ وہ یہ کہا کرتے تھے کہ یہ رنگ برص میں مبتلا، لوگوں کا ہوتا تھا۔ وہ لوگ اپنی ٹھوڑیوں کو "ہمیشہ صاف" رکھتے تھے لیکن بڑی بڑی مونچھیں رکھتے تھے۔ جب ان کے بال سفید ہو جاتے تھے تو وہ لوگ "چھپلنے کے لیے جیسا کہ وہ پہلے کرتے تھے" ان پر استرا نہیں پھرواتے تھے۔ اس وجہ سے" ان میں بہت سے بوڑھے آدمی" دیکھے جا سکتے تھے۔

خوش اخلاقی: ٹیری نے لکھا ہے کہ: "یہاں کے لوگ بالعموم بڑے خوش اخلاق ہوتے تھے۔

عام طور پر وہ اپنے اعلیٰ افسروں کے احکامات کے پابند ہوتے تھے۔ جن کی وہ خلاف ورزی نہیں کرتے تھے۔ وہ لوگ ان احکامات کو بڑی احتیاط سے انجام دیتے تھے۔ وہ ملازمین جو اپنے حاکموں کی اطاعت کرتے تھے انھیں "عمدہ" سمجھا جاتا تھا۔

شراب نوشی اور والدین کا احترام:

بیشتر لوگوں (ہندو اور مسلمان) کی شراب نوشی ایسی تھی کہ ان منشیات کے کھانے اور پینے کے مقابلے میں مرنا پسند کرتے تھے جنہیں قانون نے ممنوع قرار دیدیا ہو۔

وہ لوگ اپنے والدین کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اپنی تھوڑی سی آمدنی کا نصف حصہ اپنے والدین کے آرام کے لئے دیدیتے تھے۔" ان کی ضروریات پوری نہ ہونے کی وجہ سے ان کے والدین کو تکلیف نہ ہو وہ اپنی ضروریات میں کمی کرنا پسند کرتے تھے۔" چونکہ وہ لوگ "اچھا لباس" پہنتے تھے اس لیے وہ نئی طرز کے لباسوں پر فخر نہیں کرتے تھے۔ اور اپنے آباء واجداد کے رسوم کی پیروی کرتے تھے۔

بزدلی:

جنگجو لوگوں۔ بلوچیوں، پٹھانوں اور راجپوتوں کے علاوہ۔ مغلیہ سلطنت کے بقیہ باشندے" جھگڑا کرنے کے مقابلے میں کھانا اور جھگڑا کرنے کے بجائے محاربہ کرنا پسند کرتے تھے۔ ٹیری نے جھگڑے کے ایسے بہت سے واقعات دیکھے تھے جن میں فریقین "اچھی طرح" سے مسلح تھے۔ بڑی بے شرمی سے وہ لوگ ایک دوسرے کو "گندی گالیاں" دے رہے تھے۔ لیکن کبھی اپنے ہتھیار نہیں نکالتے تھے۔ ان میں جب ایک آدمی کود کر دوسرے کی گردن پر سوار ہو جائے اور اسے زمین پر رگڑنے لگے تو مظلوم چلّانے لگتا تھا" رحم کرو رحم کرو" اور تماشہ بین حملہ آور کی ہمت کی تعریف یہ نعرہ لگا کر کرتے تھے: شاباش، شاباش عام طور پر یہاں کے لوگ بزدل ہوتے تھے۔ وہ لوگ" زبانی جھگڑوں میں بہت بہادر تھے" لیکن اپنے ہتھیاروں سے لڑنے میں شجاع نہیں تھے۔ وہ لوگ ایک دوسرے

کو برے اور گندے لفظوں سے" مخاطب کرتے تھے"۔ ٹیری نے لکھا ہے:"ان کی زبان اتنی دراز اور بڑا ہم تھی کہ وہ ایک لفظ میں ایک آدمی کو دو تین گالیاں دیدیتے تھے"۔

زبان یا بولی:

ان کی بازاری زبان" ہندوستانی" کے نام سے موسوم تھی۔ اس کا عربی اور فارسی سے گہرا رشتہ تھا۔ وہ بہت سلیس اور بآسانی بولی جاسکتی تھی۔ اس کے حروف ابجی بائیں طرف سے لکھے جاتے تھے اور یہ طریقہ تحریر فارسی اور عربی سے بہت مختلف تھا۔ درباری زبان فارسی تھی اور عالموں کی زبان عربی۔ فارسی زبان" حلقی تلفظ کے مطابق" بولی جاتی تھی۔ ہندوستانیوں میں " استدلالی ٹھوس قوت،" پائی جاتی تھی اور کسی مناظرہ کے موقع پر وہ بہت اچھی طرح بحث کر سکتے تھے"۔

وفاداری اور دیانتداری:

" عیسائیوں کے مقابلے میں ترکوں اور ہندوستانیوں کے زیادہ شریف لوگوں میں زیادہ صداقت، وفاداری، ٹھیک ٹھاک لین دین، اپنی بات کی زیادہ پاس داری، پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک اور تلطف، مخیری اور رحم دلی پائی جاتی تھی"۔

پجاریوں کا احترام: تمام مذاہب کے "پیشواؤں کا" لوگ عام طور پر احترام کرتے تھے۔ یہاں کے لوگ ٹیری کو" پادری" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اور اپنے طرز عمل میں اس کے لیے بڑا احترام کا مظاہرہ کرتے تھے۔

فرنگیوں کے بارے میں آراء: ٹیری کے بیان کے مطابق انگریزی فیکٹری کے قریب بسنے والے ہندوستانی" باشندوں" نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی زبان میں ان کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی کہ:" عیسائی مذہب شیطانی مذہب ہے، عیسائی لوگ زیادہ شراب پیتے ہیں،

زیادہ غلطیاں کرتے ہیں، دوسروں کو زیادہ مارتے اور گالیاں دیتے ہیں "

مکانات : متمول لوگوں کے مکانوں کی تعمیر میں عمدہ تعمیری سامان جیسے شہتیر، اینٹ انواع و اقسام کے پتھر اور مختلف رنگ اور قسم کے سنگ مرمر استعمال کئے جاتے تھے۔ ان کے مکانات زیادہ اونچے نہیں ہوتے تھے۔ اور" دومنزلہ" سے زیادہ نہ ہوتے تھے۔ ان کی چھتیں ہموار اور موٹی ہوتی تھیں جو مضبوط شہتیروں پر اچھی طرح سدھی ہوتی تھیں۔ ان چھتوں پر چوڑے چھجے ہوتے تھے جہاں بہت سے لوگوں کے لئے جگہ ہوتی تھی۔ صبح سویرے اور سورج غروب ہونے کے بعد تازہ ہوا کھانے کے لیے بہت سے لوگ جمع ہوتے تھے۔ ان کے دومنزلہ مکانوں میں عام طور پر اوپری کمرے بہت بڑے ہوتے تھے۔ ہوا کے آنے کے لئے ان کے کناروں میں دہرے دروازے ہوتے تھے۔ وہ "کمرے "کھلے اور صاف ستھرے ہوتے تھے۔" دوسرے ذرائعوں سے" ان میں روشنی پہونچائی جاتی تھی۔ شیشے کی کھڑکیوں اور دوسرے قسم کی چیزوں کے استعمال سے وہ لوگ نابلد تھے۔ چمنیاں کہیں نہیں دیکھی جاسکتی تھیں کیونکہ" کھانا پکانے کے علاوہ وہ کسی دوسرے کام میں آگ کا استعمال نہیں کرتے تھے" اس کام کے لیے (مکانوں میں) کسی دیوار کے سامنے اور باہر کسی زمین کے کنارے پر آگ جلائی جاتی تھی۔ تپش سے بچنے کے لئے، پڑاؤ میں آگ جہاں تک ممکن ہوتا بہت دور جلائی جاتی تھی۔ عمارتوں کے بیچ میں سایہ کے لئے اونچے اور پھیلنے والے درخت لگائے جاتے تھے۔

" غریب غرباء کے مکانات، بہت معمولی اور ایک دوسرے سے ملے ہوتے تھے۔ کوئی مکان دوسرے مکانوں سے الگ نہیں ہوتا تھا۔ ان کی دیواریں مٹی کی ہوتی تھیں۔ جس میں گھاس پھونس ملا ہوتا تھا۔ وہ دیواریں مضبوطی سے کھڑی رہتی تھیں۔ ایسے مکانوں کی چھتیں نچلی اور ہموار ہوتی تھیں۔ شہتیر کے بجائے ان کی چھتیں لکڑیوں سے بنائی جاتی تھیں تاکہ اگر ان میں آگ لگ جائے تو انھیں جلدی سے دوبارہ بنایا جاسکے۔

سواریاں : اعلیٰ طبقے کے لوگ " خچر، گھوڑے، اونٹ، سانڈنیوں یا دو پہیوں کی گاڑیاں

سواری کے لیے استعمال کرتے تھے۔ گاڑیوں کے اگلے اور پچھلے حصے کپڑے سے ڈھکے ہوتے تھے اور دونوں بغلیں کھلی ہوتی تھیں۔ گاڑی بان کے علاوہ ان میں چار آدمی بیک وقت بیٹھ سکتے تھے۔ ان میں بطور حاشیہ گدّے لگادیے جاتے تھے جو "پارچہ کی پٹیوں" سے بندھے ہوتے تھے۔ ان کے پچھلے حصے میں "گاؤ تکیئے رکھے ہوئے تھے"۔ ان کے غلاف مخمل اور ساٹن یا زرق برق ریشمی کپڑوں کے بنے ہوتے تھے۔ ان گاڑیوں کو ایک جوڑی بیل چلاتے تھے۔ ان بیلوں کے سینگوں کے اوپری سروں پر عام طور پر چاندی یا تانبے کے پتروں کو بڑی خوبصورتی سے منڈھ دیا جاتا تھا۔ قد و قامت میں وہ بیل گھوڑوں کے برابر ہوتے تھے۔ بعض مرتبہ چاندی کی گول گھنٹیاں ان کے گلوں میں باندھ دیتے تھے۔ چھوٹی رسیوں کے ذریعہ انہیں اشارے کئے جاتے تھے۔ جو ان کے نتھنوں اور سینگوں سے ہوکر گاڑی بان تک پہونچتی تھیں۔ انکو آگے بڑھانے کے لئے گاڑی بان انہیں ایک چھوٹی لکڑی سے ہانکتا تھا۔ "اچھی رفتار سے چل کر" ایک دن میں وہ بیس میل کی مسافت طے کرلیتے تھے۔

ایک جگہ سے دوسری جگہ غریب لوگ پیدل سفر کرتے تھے ان کے بچے گدھوں پر اور عورتیں "چھوٹے بیلوں" پر سوار ہوکر سفر کرتی تھیں۔ مردوں کی طرح ان کی عورتیں "پیر اِدھر اُدھر" کرکے سواری کرتی تھیں۔

تمباکو نوشی: تمباکو کی کاشت کثرت سے ہوتی تھی لیکن اسے سکھانے اور مرتب کرنے کے علم سے وہ نابلد تھے۔ تمباکو کو پینے کے لیے وہ لوگ حقّوں کا استعمال کرتے تھے جن کی گردنیں تنگ اور اوپری گول حصہ کھلا ہوتا تھا۔ اس کے اندر (پیٹ) سے دھواں نکلتا تھا، جس کے نچلے حصے میں پانی بھردیا جاتا تھا۔ وہ لوگ چلم میں تمباکو کے پتے رکھ کر اس پر انگارے رکھ دیتے تھے۔ حقہ زمین پر رکھا رہتا تھا۔ مٹی کے حصے پر وہ لوگ پتلے سرکنڈے یا بینت کس کر باندھ دیتے تھے۔

اشیائے نوش: عام طور پر پانی پیا جاتا تھا۔ بعض مرتبہ کچھ بیج ڈال کر پانی کو ابال لیتے تھے اور یہ ٹھنڈا ہوجاتا تھا۔ دوسرے موقعوں پر وہ لوگ پانی میں لیمو کا رس ملا لیتے تھے۔

جس کو وہ "شربت" کہتے تھے۔ عام قسم کی ایک شراب وہ لوگ شکر اور ایک قسم کے مسالے دار پودے سے بناتے تھے۔ اُسے "جگرا" کہا جاتا تھا وہ لوگ اسے "عرق" کہتے تھے۔

تجارتی کاروبار! وہ لوگ اپنے تجارتی کاروبار اور صنعتی چیزوں کو شہروں اور قصبوں تک محدود رکھتے تھے۔ خرید و فروخت کے لئے مقامات مقرر کر دیئے گئے تھے۔ جہاں وہ روٹی آٹا، بتاشہ، پھل اور دوسری چیزیں خرید و فروخت کیا کرتے تھے۔ وہ اپنا سب سامان بازار سے لاتے تھے جو دن میں دو مرتبہ۔ سورج کے طلوع ہونے کے ایک گھنٹہ پہلے اور بعد میں اور سورج غروب ہونے کے تھوڑی دیر پہلے اور بعد میں لگتے تھے۔

زمین اور کاشتکاری! وہ لوگ اپنی زمینوں کو بیلوں اور بھیر سے چلائے جانے والے ہلوں سے جوتتے تھے۔ ان کے کھیت بونے کا وقت "سئی کا مہینہ اور کاٹنے کا زمانہ نومبر اور دسمبر تھا۔ ان کے کھیت گھرے نہیں ہوتے تھے۔ وہ گھاس کو سوکھی گھاس بنانا نہیں جانتے تھے لہذا وہ اسے زمین سے بالکل ہرا یا سکھا کر کاٹتے تھے۔

سونے کا طریقہ! گرمی کے زمانے میں غریب غربا نیچے کوئی کپڑا بچھا کر زمین پر سوتے تھے۔

کھانے! وہ لوگ ہری ادرک ملا کر اُبلے ہوئے چاول کھاتے تھے جس میں تھوڑی سی کالی مرچ اور گھی ملا لیتے تھے۔ یہ ان کا "پسندیدہ" کھانا تھا لیکن "شاذ و نادر" ہی وہ لوگ یہ کھانا کھاتے تھے۔ ان کا "معمولی کھانا" گیہوں کی روٹیاں نہ تھیں بلکہ "موٹے اناجوں کی روٹیاں تھیں" جو تندور میں پکائی جاتی تھیں۔ ان کے خیال میں اس طرح بنائی گئی روٹی "صحت بخش اور خوش ذائقہ" ہوتی تھی۔ جب وہ لوگ سفر پر جاتے تھے تو وہ اپنے ساتھ گول چولہے (تندور) لے جاتے تھے۔

سلام کا طریقہ! غریب غربا لوگ یا تو پہلے اپنے دائیں ہاتھ کو زمین پر رکھ دیتے تھے یا گھٹنے

کے بل زمین پر گر پڑتے تھے اور اس کے بعد زمین پر سجدہ کرتے تھے۔ (ماتھا ٹیک دیتے تھے) ادنیٰ لوگ اپنے سے اعلیٰ لوگوں کو تحسین و آفریں ان الفاظ میں کرتے تھے کہ ہم لوگ آپ کی روٹی اور نمک کھاتے ہیں۔"

مزدوروں اور ملازمین کا طبقہ: اپنی حفاظت کے لئے بالعموم لوگ راجپوتوں بلوچیوں اور پٹھانوں کو ملازم رکھتے تھے۔ ٹیری نے لکھا ہے کہ: "جو کوئی بھی انھیں ملازم رکھتا، چاہے وہ انگریز ہو یا کوئی دوسرا یہ ہندوستانی اپنے آقا کے اس قدر وفادار ہوتے تھے کہ اگر کسی موقع پر کوئی اس پر حملہ آور ہوتا تو ضرورت کے بجائے انھیں چھوڑ دینے کے بجائے ان کے دفاع کرنے میں اپنی جان تک دیدیتے۔" اگر کسی نے اس کے آقا پر حملہ کیا اور اسے مارنے کی کوشش کی تو اس کام میں کامیابی حاصل کرنے سے پہلے اسے اس محافظ کا خون بہانا پڑتا تھا۔" وہ لوگ بہت محنتی اور جفاکش ہوتے تھے۔

ہمیشہ وہ لوگ اپنے آقا کے اتنے قریب رہتے تھے کہ انہیں بلایا جا سکے اور خاص طور پر اجازت لیے بنا نہیں جاتے تھے۔ اجرت پر وہ بازار میں مل سکتے تھے۔ فی کس ۵ شلنگ سے زیادہ ان کی اُجرت نہ ہوتی تھی۔ جب انھیں اُجرت پر رکھا جاتا تھا تو وہ ایک ماہ کی تنخواہ پیشگی لیتے تھے۔ وہ اس قدر دیانت دار ہوتے تھے کہ "جب انھیں برطرف کر دیا جاتا تھا تو رخصت ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے تک وہ اپنے آقا کی خدمت کرتے رہتے تھے۔" اس جفاکشی اور وفاشعاری کے عوض وہ اس بات کی امید رکھتے تھے کہ انھیں بوقت ضرورت تنخواہ ادا کر دی جائے۔ انگلستان میں نوکروں کے مالکوں اور ہندوستانی مالکوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ٹیری نے لکھا ہے کہ وہاں کے آقا انھیں اس طرح رخصت کرتے تھے کہ وہ دوبارہ اس سے بات نہ کرے گا۔

بے حد شرم ناک سزا: اگر کوئی اجنبی شخص انھیں کوڑے سے مارے تو وہ لوگ اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوڑے کی چوٹ بچھو کے ڈنک

مارنے سے بھی زیادہ بدتر تھی۔ لوگوں کی رائے میں سب سے زیادہ شرمناک سزائیں یہ تھیں۔ اوّل وہ کوڑا جس سے وہ اپنے جانوروں کو مارتے تھے یا ان کے سروں پر جوتے مارے جائیں۔

پرندوں کا شکار: "پانی استعمال کرکے حیرت انگیز ترکیب سے وہ لوگ پرندوں کو پکڑتے تھے: ایک پرند کا حلیہ بنا کر ایک آدمی پانی میں اتر جاتا تھا اور ان کی آواز کی نقل کرتا تھا۔ سر کے علاوہ اس کا بقیہ دھڑ پانی کے اندر ہوتا تھا جس پر نقلی چڑیا بندھی ہوتی تھی۔ اس طرح پرندوں کے قریب ہو کر جس طرح وہ چاہتا انھیں پانی کے اندر کھینچ لیتا۔

عام بیماریاں: عام طور پر پائی جانے والی بیماریاں یہ تھیں۔ جسمانی مادہ کا بہنا، گرم بخار گھٹیا، مہلک امراض، گندی بیماریاں، استسقائے زقّی، مرگی، سوجن اور جلن وغیرہ۔ ٹیری نے لکھا ہے کہ "مشرقی ہند کے باشندے سخت گرم بیماریوں میں اس وقت تک حکما کا بہت کم علاج کرواتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض مرتبہ کوئی نہ کوئی نس پھٹ جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ بہت روزہ رکھتے تھے۔ کیونکہ یہی ان کا امید افزا علاج تھا"۔

رنڈیاں اور طوائفیں: طوائفوں کو "پوری آزادی" حاصل تھی۔ چکلوں کے قائم کرنے کی اجازت دینے سے پہلے ان کے ناموں کا اندراج کر لیا جاتا تھا۔

ادنیٰ درجوں کی ان طوائفوں کو دوسروں کی "بہت کم تواضع کرنی پڑتی تھی"، کیونکہ لوگ کھلے عام ان کے چکلوں پر جاتے تھے۔ بعض اعلیٰ درجے کی طوائفیں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتی تھیں اور سنجیروں کو بجا کر گایا کرتی تھیں۔

حجام لوگ: لوگ برابر داڑھیاں بنوایا کرتے تھے۔ ان کی اس عادت کی وجہ سے "عمدہ حجام" وجود میں آئے۔ استروں کے علاوہ ان کے پاس چھوٹے اوزار بھی ہوتے تھے جن سے وہ ناخن صاف کرتے اور انھیں کاٹتے تھے۔ ان کے پاس اسٹیل کا بنا ہوا

ایک گول آئینہ بھی ہوتا تھا جو کھلا ہوتا تھا لیکن "وہ بےحد صاف" ہوتا تھا۔ جب وہ آگے پیچھے گھومتے تو وہ لوگوں کو بےکار بیٹھے دیکھ کر ان کے سامنے آئینہ کر دیتے، یہ عمل اس بات کی علامت تھی کہ ان کی خدمات موجود تھیں۔

(۷) مختلف فرقوں کی بعض خصوصیات

(الف) مسلمان: ایرانی اور تورانی: ایرانیوں میں بہت سے خوش اندام لوگ پائے جاتے تھے۔ تورانی شجاع، سڈول، جسمانی طور پر مضبوط، ان کے چہرے چپٹے، اور ناکیں چپٹی ہوتی تھیں۔

حلیہ اور لباس: " وہ لوگ شریفانہ لباس پہنتے ہیں کیونکہ وہ لوگ ننگے نہیں رہتے ہیں جس طرح کے مغربی ہندوستان کے بہت سے لوگ رہتے ہیں۔ ان کا لبادہ کمر تک چست کسا ہوتا ہے اور اس کے بعد گھٹنوں کے ذرا نیچے تک وہ ڈھیلا لٹکا ہوتا ہے۔ اس کا نچلا چست ہوتا ہے۔ اس چست لبادے کو دونوں کندھوں پر فیتوں سے باندھ دیتے ہیں۔ وہ لبادے گاڑھے یا عمدہ سفید چھینٹ کے بنے ہوتے ہیں۔ جو عوام پہنتے ہیں اور اسی طرح اس لباس کو کمر میں ایک ڈوری سے دونوں طرف سے باندھ دیتے ہیں۔ یہ لباس ان کی چھاتیوں تک ہوتا ہے۔ اور اسی طرح کی ڈوریوں سے باندھتے ہیں لیکن دوسری ڈوریوں سے یہ ڈوریاں کم لمبی ہوتی ہیں۔ بس اتنا ہی لباس وہ لوگ بالعموم اوپری حصے میں پہنتے ہیں کہ ان کے پیر کھلے رہتے ہیں۔"

ملاؤں کے علاوہ، اکثر لوگ داڑھی منڈواتے تھے۔ لیکن "مونچھیں لمبی" رکھتے تھے۔ سیسے سے بنے کالے کنگھوں سے کنگھی کر کے ان مونچھوں کو وہ قدرتی رنگ میں رکھتے تھے۔ مسلمان اپنے سر پر اُسترا پھروا دیتے تھے۔ لیکن سر کے چاند میں ایک (لٹ) چوٹی چھوڑ دیتے تھے۔ ان کا گنجا پن" دکھائی نہیں دیتا تھا" کیونکہ وہ لوگ چھینٹ کے کپڑے کی سر پر پگڑی باندھتے تھے۔ جس میں بہت سے گھیر ہوتے تھے۔"

ان کی بعض خصوصیات: بہت سے مسلمان کاہل ہوتے تھے جو" کام کرنے کے بجائے

کھانا جانتے تھے ؛ جب لوگ صبح حجامت بنوانے تھے ۔ ان میں سے متول لوگ داشتائیں رکھتے تھے جن میں سے بیشتر طوائفیں ہوتی تھیں ۔ منکوحہ ایک عورت سے مولود بڑے لڑکے کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہوتی تھی جسے وہ " بڑا بھائی" کہتے تھے ۔

مسلمانوں کے سال نو کا آغاز ۱۰ مارچ سے ہوتا تھا جب سورج حمل میں داخل ہوتا تھا۔ ایک سال میں ۱۲ مہینے ہوتے تھے۔

عورتیں : " اعلیٰ طبقے" کی عورتوں کو دیکھنے میں ٹیری کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی لیکن دوسرے طبقوں کی عورتوں کا لباس ان کے مردوں سے مختلف نہیں ہوتا تھا ۔ وہ لمبا کرتہ اور تنگ چوڑی دار پائجامہ پہنتی تھیں ۔ وہ اپنے بالوں کو پٹی یا فیتے سے باندھتی تھیں ۔ ان کی چوٹی پیٹھ کی طرف لٹکی ہوتی تھی وہ برقعہ بھی پہنتی تھیں جو عام طور پر سفید چھینٹ کے بنے ہوتے تھے ۔ اسے وہ اپنے لباس کے اوپر پہنتی تھیں ۔

جہاں تک ان کے زیورات کا سوال تھا تو وہ اپنے کانوں میں " بڑے گوشوارے" پہنتی تھیں ۔ ان کے کان چھدے ہوتے تھے ۔ دولتمندوں کے لئے یہ گوشوارے چاندی یا سونے کے بنائے جاتے تھے اور غریب و غرباء کے لوہے یا تانبے کے بنے ہوتے تھے، لیکن ان پر "پالش" ہوتی تھی ۔ ان کے نتھنے کو چھیدا جاتا تھا ۔ حسب خواہش وہ سونے یا چاندی کی نتھ پہنتی تھیں ۔ نتھ میں ایک موتی آویزاں ہوتا تھا جس کے بیچ میں ایک سوراخ ہوتا تھا ۔ نتھ کے دونوں سرے اس سوراخ کے اندر ملتے تھے ۔

" اعلیٰ طبقے کی بعض عورتیں" الماس، سونے یا چاندی یا تانبے کے کھلے کڑے اپنی کلائیوں اور پیروں میں پہنتی تھیں ۔ بازوؤں اور پیروں میں وہ دو دو، تین تین کڑے پہنتی تھیں آپس میں ٹکرانے سے ان سے آواز پیدا ہوتی تھی ۔ جب ان کے بچے ہوتے تو وہ بہت خوش ہوتے۔ " چھوٹے لوگ" چند سالوں تک اپنے بچوں کو ننگے رکھتے ۔ کبھی کبھی انہیں چھینٹ کا بنا کرتہ پہنا دیتے ۔

(جاری)

مطبوعات ندوۃ المصنفین

قصص القرآن

قصص القرآن کا شمار ادارے کی نہایت ہی اہم اور مقبول کتابوں میں ہوتا ہے انبیاء (علیہم السّلام) کے حالات اور ان کے دعوتِ حق اور پیغام کی تفصیلات قرآن کریم کی روشنی میں بیان کی گئی ہیں اس درجہ کی کوئی کتاب کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی۔ کتاب کی چار ضخیم جلدیں ہیں۔

جلد اوّل میں حضرت آدم علیہ السّلام سے لے کر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علی نبینا وعلیہما السّلام تک کے مکمل حالات آگئے ہیں۔ صفحات ۔ ۵۴۴۔

جلد دوم۔ حضرت یوشع علیہ السّلام سے لیکر حضرت یحیٰی علیہ السّلام تک ان تمام پیغمبروں کے حالات سوانحِ حیات اور دعوتِ حق کا بیان ہے۔ صفحات ۲۸۰

جلد سوم۔ انبیاء علیہم السّلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصص قرآنی اور تاریخی واقعات کا عبرت آموز بیان ہے۔ صفحات ۴۱۲

جلد چہارم۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام اور حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پاک کی اور دعوت کا مفصل حال اور محققانہ بیان مع دیگر ضروری حالات و واقعات اور مباحثِ مہمہ صفحات ۵۲۰ متوسط تقطیع $\frac{20 \times 26}{8}$

قیمت جلد اوّل طبع آفسٹ	قیمت	۱۴۰/-	مجلد	۱۶۵
〃 جلد دوم	〃 〃	۸۰/-	〃	۱۰۵
〃 جلد سوم	〃 〃	۱۲۵/-	〃	۱۵۰
〃 جلد چہارم	〃 〃	۱۲۵/-	〃	۱۵۰
کامل چار جلدیں	〃 〃	۴۷۰/-	〃	۵۷۰

سرپرست اعلیٰ ادارہ ندوۃ المصنفین: عالیجناب حکیم عبدالحمید چانسلر جامعہ ہمدرد دہلی

جلد ۱۱۴ | قیمت چھ روپے | شمارہ ۵

اکتوبر سنہ ۱۹۹۴ء مطابق جمادی الاول سنہ ۱۴۱۵ھ

اس شمارہ کا
خصوصی مضمون

غالب کا ایک فارسی قصیدہ بخط غالب
شائقین غالب کیلئے ایک نادر تحفہ

۹

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپواکر دفتر "برہان" اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

۲ر اکتوبر گاندھی جی کا یوم ولادت ہے اس دن ہندوستانی عوام ان کی یاد تازہ کرتے ہوئے ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کا عہد کرتے ہیں۔ کہیں ان کی یاد میں جلسے ہوتے ہیں اور کہیں ان کے حالات و خیالات پر مشتمل نظریات کی تشہیر اور ان کی زندگی کے مختلف ادوار کی تصویروں (فوٹوؤں) کی نمائشیں منعقد کی جاتی ہیں۔

ہندوستانی عوام گاندھی جی کو صرف اس حیثیت میں جانتے اور سمجھتے ہیں کہ گاندھی جی نے ہندوستان کی آزادی کی تحریک کا آغاز کیا اور ہندوستان سے غیر ملکی تسلّط کو ختم کرنے کے لئے انہوں نے ہندوستانی عوام کو ترغیب دیتے ہوئے بیداری کی لہر پیدا کی اور اہنسا (عدم تشدد) کے ذریعہ تحریک آزادی کو چلایا جو بالآخر ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان سے غیر ملکی تسلّط کے خاتمہ اور ہندوستان کی مکمل آزادی کی حصولیابی کے ساتھ کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ لیکن کسی کو ہمارا مطلب ہے آزادی کے بعد کی ہندوستانی نسل کو یہ علم و معلومات قطعاً حاصل نہیں ہیں کہ گاندھی جی نے آخر اتنے بڑے سامراجیہ سے جس کی حکومت میں سورج غروب نہ ہوتا تھا کس طرح زبردست ٹکر لی اور وہ بھی عدم تشدد کے بلا ضرر حربہ کے ذریعہ۔ اور اس بات پر سوچنے کو شاید ہی کوئی اختلاف ہو کہ گاندھی جی کی قیادت ہی کا ثمرہ تھا کہ ہندوستان میں انگریز سامراجیہ کی حکمرانی کی جڑیں ہل گئیں اور اس کو ہندوستان سے اپنا بوریہ بستر اسمیٹ سمٹا کر باہر نکلنے ہی میں اپنی عافیت محسوس ہوئی۔

گاندھی جی کی قیادت میں تحریک آزادی کامیاب کیوں کر ہوئی۔ اس کے اسباب میں سب سے بڑا سبب تو یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں لوگوں کو آپس میں ملایا ایک کیا کسی کا بھی قد چھوٹا نہ

سمجھا سب کو برابر گردانتے ہوئے سب کو ساتھ لے کر آزادی تحریک کا جھنڈا بلند کیا۔ ہندو مسلمان سکھ عیسائی سب کو ہندوستان کا باشندہ سمجھتے ہوئے اسے آزادیٔ ہند میں برابر کا شریک سمجھا۔ ہندوستان میں صدیوں سے چلی آرہی چھوا چھوت کی لعنت کو ختم کرنے پر زور دیا سب کو مساوات سے مل جل کر رہنے کی ضرورت پر زور دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ذات پات کی تفریق اور فرقہ وارانہ بھید بھاؤ کے خلاف ہندوستانیوں میں جذبہ پیدا ہوئے بغیر ہم آزاد ہندوستان کا خواب حقیقت میں تبدیل ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ اور انگریزی سامراجیہ کی پہلی چال و کوشش یہ تھی کہ ہندوستان ذات پات کی تفریق اور فرقہ وارانہ منافرت سے پاک نہ ہونے پائے اس کے لئے اس نے ہندوستان ہی میں سے چند لوگوں کو ورغلایا اور انھیں مذہب کی آڑ میں اپنی ان شیطانی اور غیر انسانی حرکات کو انجام دینے کے لئے کمربستہ کر دیا چنانچہ انہوں نے مختلف ناموں سے تنظیمیں قائم کیں ہندو اور مسلم نام کی تنظیمیں معرضِ وجود میں آکر ہندوستانیوں کو آپس میں لڑانے کے خطرناک کھیل میں منہمک و مشغول ہو گئیں۔ جس کی وجہ سے آزادی کی تحریک میں رکاوٹیں آئیں۔ اور ہندو مسلمان بجائے اپنے دشمنِ آزادی انگریز سامراجیہ کے خلاف نبرد آزما ہونے کے بجائے آپس میں ایک دوسرے کے خلاف لڑنے جھگڑنے کے لئے آمنے سامنے ہو گئے۔ کبھی مندر و مسجد کے نام پر کبھی تاریخ کے جھوٹے قصے کہانیوں کی آڑ میں اور کبھی کسی بے بات کی بات پر الجھنے مرنے پر آمادہ نظر آنے لگے۔

گاندھی جی کی دوراندیشی تدبر و فراست قدم قدم پر ہندوستانیوں کو ان بیکار کی باتوں میں پڑنے سے روکتی رہی۔ ایک طرف انہوں نے خلافت تحریک کا ساتھ دیکر فرقہ وارانہ اتحاد قائم کرنے میں بڑا ہی اچھا رول ادا کیا اور دوسری طرف انہوں نے ہندوستانیوں کو اس لعنت سے چھٹکارہ دلانے میں اہم کردار نبھایا جسے ذات پات کہتے ہیں اور جس نے ہندوستانی سماج میں مذہب کا جامہ پہن کر زہر گھولا ہوا تھا۔ اور یہ واقعی ان کا بہت بڑا کارنامہ تھا کہ ایسے مشکل حالات میں انہوں نے ہندوستانیوں کے بیچ میں کام کیا جب آزادی کی تحریک میں جان ڈالنے کے لئے نمک ستیہ گرہ شروع کیا تو اس وقت مسلمانوں کے مقتدر رہنماؤں اور علمائے کرام نے گاندھی جی کی ہر طرح مدد دستائش کی ادارہ ندوۃ المصنفین اور رسالہ برہان کے بانی مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ نے نمک

ستیہ گرہ کے وقت گاندھی جی کی ہر طرح رہنمائی کی۔ گاندھی جی انتہائی عقیدت و احترام کے ساتھ اس دوران میں حضرت مفکر ملت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ سے نہ صرف رائے و مشورہ حاصل کیا کرتے بلکہ ان کی صلاح ہی سے نمک ستیہ گرہ تحریک چلایا کرتے۔ مفتی صاحبؒ نے بھی اسے وقت کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے مسلمانوں کو اسمیں پورے طریقہ سے شریک ہونے کی ترغیب دی۔ جسکے نتیجہ میں نمک ستیہ گرہ کی تحریک انگریز سامراج کی ہندوستان سے بے دخلی کا سنگ بنیاد ثابت ہوئی۔ آزاد ہندوستان کی نئی نسل اس بات سے واقف ہی نہیں ہے۔ یہ افسوسناک امر نہیں تو اور کیا ہے؟۔

گاندھی جی کی کامیاب قیادت کی بدولت ہندوستان آزاد ہوا مگر آزاد ہندوستان میں گاندھی جی کی قربانیوں اور ان کی تعلیمات کو یکسر نظرانداز کر دیا گیا یا بھلا دیا گیا یا جان بوجھ کر اسے سرد خانے میں ڈال دیا گیا۔ حالانکہ آزاد ہندوستان میں گاندھی جی کی تعلیمات کی نشرو اشاعت اور اس پر عمل پیرا ہونے کی سخت ترین ضرورت تھی۔ مگر افسوس وہ اقتدار کی ہوس میں فراموش کر دی گئی۔ آج ہندوستان میں گاندھی جی کی تعلیمات کے علی الرغم کام ہو رہا ہے۔ آزاد ہند کا تصور ہر ہندوستانی کا تصور تھا ہندوستان کی آزادی کی لڑائی ہر ہندوستانی کی قربانیوں کا نتیجہ ہے مگر آزاد ہندوستان میں یہ سب بھلا دیا گیا اور صرف ایک ہی فرقہ کو آزادی کا لطف و فائدہ حاصل کرنے کا اہل گردانا جانے لگا۔ اور دوسرے فرقوں کو غدار اور نہ معلوم کیا کیا حقارت آمیز القاب سے یاد کرنا ہی "راشٹر بھکتی" سمجھا جانے لگا۔ بابری مسجد کا انہدام گاندھی جی کی تعلیمات کا انہدام ہے گاندھی کے اصولوں و آدرشوں کا قتل ہے اور کمال کی بات تو یہ ہے کہ جو اس کے ذمہ دار ہیں وہ بے غیرتوں کی طرح گاندھی جی کے آزاد ہندوستان میں ڈھٹائی سے مست گھوم پھر رہے ہیں سینہ چوڑا کئے ہوئے ہندوستانی عوام میں اپنے آپ کو سب سے بڑا دیش بھگت ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ گاندھی جی کے ساتھ تو ہے ہی بد اخلاقی ان کے مثالی ہندوستان کے ساتھ بھی بدترین قسم کی غداری کہنے میں ہمیں کوئی عار نہیں ہے —— لیکن دکھ کی بات تو یہ ہے کہ ابھی ہمارے ساتھ یہ بات کہنے کے لئے عوام الناس کی وہ کثیر تعداد نہیں ہے جس کا تصور و اندازہ گاندھی جی کے دیش میں ہمیں تھا —— جب تک ہم گاندھی جی کے اصولوں و آدرشوں کو ہندوستان کے ہر شہری کے دل و دماغ میں نہ بٹھا دیں اور ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے ہندوستانیوں کو نہ راغب کر دیں اس وقت تک ہمیں گاندھی جی کا یوم ولادت منانے میں صحیح معنوں میں خوشی حاصل

نہیں ہوسکتی ہے !۔

ہم نے برہان کے گذشتہ شمارے میں گندگی سے متعلق لکھا تھا کہ ہندوستان میں صفائی ستھرائی کا فقدان ہے جسکی بدولت گندگی کا ڈھیر ہے اور گندگی سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں بیماریاں پیدا نہ ہوں اس کے لئے صفائی ستھرائی کی طرف خصوصیت سے دھیان دینا چاہیئے۔ لیکن ایسا کرے کون؟ ہر شخص اپنے میں مست ہے اس دور میں انسان کتنا خودغرض ہوگیا ہے کہ اسے دوسرے انسان کی تکلیف ومشکل کا کوئی احساس ہی نہیں ہے ۔ اس وقت ہندوستان کے ایک شہر سورت میں گندگی کیوجہ سے پلیگ (طاعون) کی بیماری کے پھوٹ پڑنے سے تمام ملک میں ہاہا کار مچی ہوئی ہے سورت شہر میں جیسے ہی اس بیماری کی وبا کا پتہ چلا لوگ گھر بار چھوڑ دوسرے شہروں میں بھاگنے لگے جس سے اس بیماری نے دوسرے شہروں میں بھی اپنا جال پھیلا دیا۔ مہاراشٹر، راجستھان اور راجدھانی میں چارسو کے قریب مریض اسپتال میں بھرتی ہوئے جنکی جانچ وتشخیص کے بعد اکثر کو چھٹی دے دی گئی ۲۳ مریض طاعون کے شکار ثابت ہوئے ۳ اشخاص طاعون کی وجہ سے لقمۂ اجل ہوگئے ہیں سورت میں ۵۲ اموات ہوئی ہیں۔ یوپی، کرناٹک، تامل ناڈو، آندھرا اور تریپورہ سے بھی خبریں آئی ہیں کہ وہاں بھی طاعون کیوجہ سے کئی اشخاص اسپتال میں بھرتی ہیں۔ کرناٹک میں ایک اور بھنڈہ میں دو مریض طاعون کی وجہ سے موت کا شکار ہوئے ہیں۔

نوبھارت ٹائمز کی ایک رپورٹ کے مطابق اجودھیا میں بابری مسجد سانحہ کے بعد پلیگ کی بیماری کیوجہ سے ملک پر دوسری بار زبردست کرائسس کا سامنا ہے۔ خوف ودہشت کا ہر طرف ماحول ہے اور اس پر ملک کی اقتصادیات کو بھی زبردست دھکا لگا ہے۔ یہ بات ہر ہندوستانی کو تشویش کئے ہوئے ہے۔ غیر ممالک میں ہندوستان میں اس بیماری کیوجہ سے زبردست ردعمل دیکھنے کو ملا ہے۔ بھارت آنے جانے والے ہوائی جہازوں کے علاوہ بھارت سے گذرنے والے جہازوں تک کو رد کیا جارہا ہے سنگاپور نے اپنے شہریوں کو بھارت کے پلیگ زدہ علاقوں کا سفر نہ کرنیکا مشورہ دیا ہے۔ خلیجی ممالک جن میں سعودی عرب، کویت، قطر، بحرین وغیرہ ہیں نے بھارت سے آنے والی تمام اڑانوں کو رد کردیا ہے۔ تھائی لینڈ بھی بھارتیہ ہوائی جہازوں کے مسافروں کی طبی جانچ کررہا ہے۔

جرمنی نے اپنے فرینک فرٹ ہوائی اڈے پر بھارتیہ مسافروں اور عملہ کے ممبروں کی جانچ شروع کردی ہے فرانس بھی بھارت سے آنے والے ہوائی جہازوں پر نظر رکھ رہا ہے۔ پاکستان نے بھی اسی طرح کے اقدام کئے ہیں۔ ہندوستان میں یہ وبا نئی نسل کے لئے بالکل نامعلوم ہے۔ حالانکہ ۷۰-۸۰ سال پہلے اس وبا نے ہندوستان میں قیامت صغریٰ کا سا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ اس ترقی یافتہ اور سائنسی کمالات کی موجودگی میں اس بیماری کو ناممکن سمجھ لیا گیا تھا مگر قدرت کے آگے سائنسی کمال کہاں ٹھہرا ہے۔ ۱۹۹۳ء میں زائرے میں پلیگ کی وبا پھیلی تھی جس میں ۔ لوگ موت کے شکار ہوئے۔ دنیا کے ۹ ملکوں میں ۱۹۹۲ء میں پلیگ پھیلنے کا پتہ چلا تھا۔ برما میں ۵۲۸ کیس درج ہوئے جبکہ ویتنام میں ۴۳۷ کیس کا علم ہوا۔ امریکہ تک میں ۱۳ کیس سامنے آئے — لیکن ہندوستان کے بعض شہروں میں پلیگ کی وبا کا اس بدتمیزی اور ناعاقبت اندیشی کے ساتھ چرچا کیا گیا کہ تمام دنیا میں ہندوستان کی تصویر ایسی ہوگئی جس کو دیکھ کر ہر محب الوطن ہندوستانی کو دکھ ہوا۔ غیر ممالک سے ٹیلی فون پہ ٹیلی فون آرہے ہیں کہ ہندوستان کا کیا حال ہے۔ طاعون پلیگ نے کیا کیا تباہ کر ڈالا ہے۔ ہمارے حکمرانوں کو اس طرف توجہ کرنے کی زحمت نہ ہوئی کہ وہ یہ دیکھیں کہ آخر باہر کے ممالک میں ہندوستان کے بارے میں اس طرح کا ہوّا کیسے کھڑا ہو گیا۔ اس سے غیر ممالک میں ہندوستان اور ہندوستانیوں کے بارے میں کیسی غلط تصویر ذہن میں پیدا ہوئی ہے۔ اس کا تصور ہی شرم و غیرت سے بدن میں کپکپی پیدا کرتا ہے۔ ایک طرف پلیگ کی بیماری نے پورے ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا ہے دوسری طرف ہم لوگوں کی ایمانداری کا یہ حال ہے کہ جوں ہی اعلان ہوا ٹیٹرا سائکلین دوائی سے یہ بیماری دور ہوتی ہے لوگوں نے اس زیادتی کے ساتھ اسے خریدنا شروع کر دیا کہ جیسے وہ بیمار پڑنے والے ہیں اور انھیں اپنی جان کی پیشگی کی حفاظت کا انتظام کر لینا چاہیئے اور جو بیمار ہو چکے ہیں مریں یا جیئیں ہماری بلا سے، جان ہماری بچنی چاہیئے دوسروں کی جان کی ہمیں کیا چنتا پڑی ہے — اور اس سے بھی شرمناک بات تو یہ ہے کہ جیسے ہی لوگوں میں یہ بات گھر کر گئی کہ ٹیٹرا سائکلین ہی وہ پاؤڈر ہوتا ہے جو جراثیم کا موثر طریقہ سے مقابلہ کرتا ہے اس کے بنانے والوں نے اس کی تعداد ہی آدھی کر دی اور اپنی آمدنی دُگنی کر ڈالی۔ یہ ہے بھارت کے ان مفاد پرستوں کی کمینہ حرکات، ایسے نازک اور مشکل وقت میں بھی یہ اپنے گھر میں گھی کے چراغ جلانے کی جستجو میں لگ جاتے ہیں چاہے دوسرے کے گھر میں اندھیرا ہو جائے وہ ان مفاد پرستوں کی بلا سے اور

یہ اس دیش میں ہے جو رشیوں منیوں کا دیش کہلاتا ہے۔ جہاں انسانیت اور حب الوطنی، دیش بھکتی کا ڈھنڈورا اس زور سے پیٹا جاتا ہے کہ جس کی آواز و گونج سے کان تک پھٹ پڑتے ہیں۔

اس سے پہلے ان ہی دنوں پچھلے سال لاتور عثمان آباد کے زلزلوں نے وہاں جو تباہی و بربادی مچائی تھی اور مفاد پرستوں نے انسانی لاشوں اور انسانیت کی تباہی و بربادی میں اپنے مفاد کو تلاش کرنا شروع کیا تھا اسے دیکھ کر ہر ہندوستانی کا سر شرم سے زمین میں گڑا گیا تھا۔ اور ہر اس موقع پر جب کہیں کوئی ریل و ہوائی جہاز کے حادثہ کے نتیجہ میں انسانیت کی تباہی ہوتی ہے یا سیلاب و طوفان سے بربادیاں رونما ہوتی ہیں، اس وقت مفاد پرستوں کا جھنڈ کا جھنڈ اپنی اپنی روٹیاں سینکنے میں لگ جاتا ہے یہ بارہا دیکھنے کو ملا ہے۔ اس صورتحال پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہی ہے ایک طرف دیش بھکتی، راشٹریہ ہت کا ڈھنڈورہ دوسری طرف انسانیت کی لاش پر اپنی خود غرضی و مفاد پرستی کی حصولیابی کا نظارہ اسے، راشٹر بھکتوں کے کون سے کردار و عمل کے خانہ میں رکھیں؟۔

حاصل مطالعہ

فرانس کا مشہور فاضل طبیب ڈیلیس مولینسز جب سخت بیمار ہوا اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو اس سے ملاقات کے لیے پیرس کے اکثر معالجین اکٹھے ہوئے تمام کے دل اداس تھے، اور آنکھیں پرنم! ان کا ایک مہربان اور شفیق دوست ہمیشہ کے لیے ان سے جدا ہو رہا تھا۔ ڈیلیس مولینسز اس وقت بھی ان سب سے نہایت خندہ پیشانی سے پیش آیا جب اس نے دیکھا کہ تمام لوگ غمگین ہیں تو وہ ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا، "دوستو! مت گھبراؤ، آج نہیں تو کل ہر شخص اس راہ سے گزرے گا۔ جو اس وقت کو بھول گیا وہ غلطی پر ہے۔ عزیزو میں چار جانشین چھوڑ رہا ہوں جو مجھ سے بڑھ کر ہیں" ـــــ تمام طبیب سوچنے لگے کہ وہ کون ہو سکتے ہیں؟ مگر جلد ہی ڈیلیس مولینسز کے الفاظ نے ان کے شکوک رفع کر دیئے ـــــ اس نے کہا "وہ چار طبیب پانی، ہوا، ورزش اور خوراک ہیں۔ پہلے سے کھلے طور پر، دوسرے سے بے فکر ہو کر، تیسرے سے باقاعدہ اور چوتھے سے اعتدال سے کام لو۔ اگر تم نے میری اس آخری نصیحت پر عمل کیا تو تمہیں کسی اور مدد کی ضرورت نہ ہو گی۔ میں اپنی زندگی میں ان کے بغیر کچھ نہ کر سکا۔ تم میرے بعد ان کے بغیر کچھ نہ کر سکو گے ـــــ

نام: حافظ جلیل حسن
پیدائش: ۱۸۶۹ء
تخلص: جلیلؔ مانکپوری
وفات: ۱۹۴۶ء

نعت

ہم ایمار آپ کا پاتے تو آتے اپنی آنکھوں سے
گہر اشکوں کے روضے پر چڑھاتے اپنی آنکھوں سے

زیارت کی تمنّا میں خیال رنج و راحت کیا
کڑی جو راہ میں پڑتی اٹھاتے اپنی آنکھوں سے

نظر آتا کوئی تنکا اگر یثرب کی گلیوں میں
اٹھاتے اپنی پلکوں سے لگاتے اپنی آنکھوں سے

خدا کرتا کبھی حضرت سے آنکھیں چار ہو جاتیں
ہم اپنا دردِ دل سب کچھ سناتے اپنی آنکھوں سے

تصور گر اچٹتا بھی تو رو کر پھر جما لیتے
ہم اپنے پیارے روٹھے کو مناتے اپنی آنکھوں سے

وہ آتے خواب میں تو پتلیاں قدموں سے مل لیتے
ہمیں وہ کاش دیوانہ بناتے اپنی آنکھوں سے

نگاہِ لطف ہی کافی تھی بیمارِ محبت کو
نہ سنتے حال لیکن دیکھ جاتے اپنی آنکھوں سے

جلیلؔ اشکِ ندامت جوش پر آتے تو کیا کہنا
ہم اپنی بگڑی حالت کو بناتے اپنی آنکھوں سے

غالب کا ایک فارسی قصیدہ

بخطِ

غالب

ڈاکٹر جوہر قاضی

غالب دوستوں کو یہ جان کر یقیناً مسرت ہوگی کہ غالب کا ایک فارسی قصیدہ جو
غالب کے اپنے قلم سے لکھا ہوا ہے میرے دیرینہ دوست اور کرم فرما ڈاکٹر جوہر قاضی
صاحب کو اپنے جدّی ذخیرۂ کتب سے دستیاب ہوا ہے۔ غالب کے قلم کی یہ نہایت حسین و
پاکیزہ تحریر نستعلیق کے شفیعانہ خط کا خوبصورت نمونہ ہے جسے غالب کے دست نوشتہ
تحریروں کے ذخیرے میں ایک اور قابل قدر اور اہم اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ
ڈاکٹر جوہر قاضی صاحب کی عنایت اور نوازش سے غالب کے قلم کی اس تحریر کو غالب دوستوں
کے سامنے پیش کرنے کی عزت و سعادت اوّل اوّل "برہان" کو حاصل ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر جوہر قاضی صاحب ایک ممتاز صحافی اور ادیب ہیں علم اور کتابوں سے عشق
انھیں ورثہ میں ملا ہے۔ قدیم اور قلمی کتابوں سے خصوصی ذوق اور لگاؤ رکھتے ہیں۔
اسی مناسبت سے ان کے پاس قدیم کتابوں کا بے انتہا اچھا اور منتخب ذخیرہ ہے۔ جس
میں فنِ طب پر ان کے خاندان کے بزرگوں کے نہایت بیش قیمت قلمی نسخے بھی شامل
ہیں، جو اہمیت کے اعتبار سے کسی طرح کم نہیں۔

——— عمید الرحمٰن عثمانی

اپنے جدّی طبّی خزانوں کو کھنگالنے کے دوران ایک طبّی قلمی بیاض سے راقم الحروف کو غالب
کا یہ فارسی قصیدہ جس میں نواب گورنر لارڈ آکلن بلر کی مدح کی گئی ہے دستیاب ہوا ہے، جو غالب کی
مہر سے مزیّن ہے۔ مہر کے اندر واضح طور پر ۱۲۳۸ ہجری لکھا ہوا ہے۔ غالب کا یہ فارسی قصیدہ کب
اور کس ذریعہ سے ہمارے پاس پہنچا اس سلسلہ میں راقم الحروف کے خاندان کا مختصر تعارف بے محل
نہ ہوگا۔

راقم الحروف کا خاندان سکندرآباد (ضلع بلند شہر) کے قاضیوں کا نہایت معزز اور صاحب علم
خاندان گذرا ہے۔ سکندر لودھی سے لیکر سلاطین مغلیہ کے آخر عہد بہادر شاہ ظفر تک اس خاندان
کے بزرگ عہدۂ قضات پر ممتاز رہے ہیں۔ طبابت کا سلسلہ بھی اس خاندان میں چھ پشتوں سے چلا
آتا ہے۔ ویسے تو اس خاندان میں لاتعداد قابل اور حاذق اطبا ہوئے ہیں لیکن جو عزت و شہرت

بهر کس شیوهٔ خاصی در ایثارست ارزانی
زمن مدح و ز الطاف آن شه مرا گنجینه بخشانی

زهی با شوکتش فرخنده آثار جهانگیری — نهی با دولتش آماده اسباب جهانبانی

دمش در وقت نوازش جانفزا بادیست فروردین — کفش هنگام بخشش دُر فشان ابریست نیسانی

گرامی منصبش را طالع اقبال جمشیدی — همایون مسندش را پایهٔ اورنگ سلطانی

طرب در بزم عیشش کرده دوران را بر آرامی — کرم بر خوان فیضش خوانده دوران را به مهمانی

بعهدش ماه هر شب کامل و آفاق مهتابی — به دورش زهره هر یم حوتی و برجیس سرطانی

دلیران سپاهش را هنرها جمله بهرامی — فرازستان جاهش را بناها جمله کیوانی

همش با خلق گوناگون نوازش در حق اندیشی — همش با خویشتن صد رنگ نازش در خدا دانی

سر راهش سپهر آورده قیصر را به درویشی — بدرگاهش قضا بنشانده دارا را به دربانی

فروزش را به رویش ساز نش پیما یکرنگی — نوازش را به خویش … نازش … روحانی

نهان در خاطرش اسرار اشراق فلاطونی — عیان از خاتمش آثار توقیع سلیمانی

به رزمش گرد ره بر خاک خشید بدشوار — به عزمش کوهسارا از راه برخیزد به آسانی

به حلمش گر توان بره دید زمانه — به دیهیمش گهر نتوان شمردن از فراوانی

روا باشد به گلشن گر بدستش گلفشان باشد / که گلبن نامهٔ اقبال او را کرده عنوانی

عجب نبود که گیتی گر بهالش جاودان بینی / که مه را در سپهر دیدنش تا بر نسوده پیشانی

ترا بارگاه نظم در مدح خود بنگر

که سیمائیش به ماه و مهر را … پیشانی

ندانم چون فرستم این گهرها لیکن آن دانم / که خود تا مشتری خواهد رسید از فرط ارزانی

بگفتارم توانگر از سیم و زر تهیدستم / زمین کلبهٔ من شد گلستان بعد ویرانی

برسم نکته سنجان در سخن غالب بود نامم / بدین نام از ازل آورده ام طغرای سبحانی

مرا در سینه اندر دل که جانفرسائی آنرا / ندانم چاره اما اینقدر دانم که میدانی

بسان دود کاندر تنگنا بر خویشتن پیچید / ستوهم در نورد تنگدستی از پریشانی

نمک پروردهٔ این دو لب جاوید پیمانم / به پیمان مودت دارم آئین ثناخوانی

کرم میکرد گر لارد آکلند از راه غمخواری / تو نیز از راه غمخواری کرم کن کز کریمانی

ازان در نامهٔ مدح تو آرم بر زبان نامش / که با من داشت گونا گون نوازشهای پنهانی

سواد نامهای دلفروز تو در نظر دارم / که چشم من بدان کحل الجواهر گشته نورانی

گر آن در رشته وصف سخنور گوهر آمود است / ترا باید که بر فرق سخنور گوهر افشانی

سخن کوتاه دایم باد و فرخ باد و روز افزون / بمن لطف تو همچون تو بخششهای یزدانی

فن طب میں اپنی حذاقت و بلافت فن وقابل طبیب ہونے کی بنا پر حکیم قاضی حافظ محمد صدر عالم رئیس اعظم سکندر آباد اور ان کے فرزند ارجمند فخر الاطباء حکیم قاضی حافظ محمد افضل عالم کو ملی وہ کسی دوسرے طبیب کے حصہ میں نہیں آئی۔ حکیم قاضی حافظ محمد صدر عالم کا زمانہ حیات ۱۸۰۳ تا ۱۸۷۵ء ہے۔ آپ ہندوستان کے جلیل المنزلت طبیب حکیم محمود خاں دہلوی کے ہمعصر تھے اور سکندر آباد کے طبیب اعظم مشہور تھے۔ یہ والد محترم کے پردادا تھے جبکہ حکیم قاضی محمد افضل عالم (المتوفی ۱۹۲۶ء) راقم الحروف کے پردادا۔ آپ بھی نہایت ممتاز اور باوجاہت طبیب تھے۔ درس و تدریس تصنیف و تالیف اور حذاقت فن کی وجہ سے اپنے پدر بزرگوار حکیم قاضی حافظ محمد صدر عالم کے بعد انھوں نے بھی بڑا نام پیدا کیا۔ آپ تاحیات آنریری مجسٹریٹ تھے۔ ساتھ ہی "سردار الاطباء" کے خطاب سے سرفراز تھے۔ سکندر آباد کی میونسپلٹی کے نامزد ممبر اور وائس چیئرمین بھی رہے ہے۔ لیکن عدم تعاون تحریک میں عملی طور پر شامل ہوکر آنریری مجسٹریٹی سے استعفیٰ دے دیا تھا اور "سردار الاطباء" کا خطاب بھی واپس کر دیا تھا۔ آپ عالم باعمل اور اہل اللہ بزرگ تھے تصوف میں آپ کو خاص دخل تھا۔ سلسلہ چشتیہ صابریہ اور سلسلہ عالیہ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ بہت سے اشخاص آپ کے فیض تعلیم سے مستفید ہوئے ہیں۔

گمان اغلب یہ ہے کہ غالبؔ کا یہ فارسی قصیدہ غالبؔ کے مشہور شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کے توسط سے جو سکندر آباد ہی کے رہنے والے تھے جنہیں غالبؔ اپنے خطوں میں مرزا تفتہ لکھتے تھے حکیم قاضی حافظ محمد صدر عالم کے پاس پہنچا ہو۔ کیونکہ والد محترم (حکیم قاضی محمد یٰسین عالم صاحب) کے ذخیرہ کتب میں نادر و نایاب کتابوں کا ایک بڑا حصہ جو طبی کتب پر مشتمل ہے خاندان میں چلتا ہوا ان تک پہنچا ہے۔

منشی ہرگوپال تفتہ کے متعلق راقم الحروف کے پردادا جناب حکیم قاضی حافظ محمد افضل عالم

لہ راقم الحروف: "سکندر آباد کے صوفی اور طبیب حاذق ـــــ حکیم قاضی حافظ محمد افضل عالم" اخبار مشرق کلکتہ مورخہ ۲۸، جولائی ۱۹۹۲ء نیز رموز الاطباء (جلد اوّل) ص ۵۰۹۔

مرحوم نے ایک یادداشت میں خود اپنے قلم سے تحریر فرمایا ہے:

"حضرت والد ماجد کا انتقال ۱۰ محرم الحرام ۱۲۹۲ھ ہجری مطابق ۱۸۷۵ء بروز شنبہ بمقام سکندر آباد ہوا۔ آپ کے انتقال پر منشی ہرگوپال بھٹناگر المتخلص بہ تفتہ واز ارشد تلامذہ مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی نے قطعہ تاریخ کہا جو آپ کے مزار پر کندہ ہے۔ اس کے ہر مصرع سے تاریخ نکلتی ہے۔ ان میں اور والد ماجد حکیم قاضی حافظ محمد صدر عالم مرحوم میں بے حد خلوص اور یگانگت کے تعلقات تھے۔"

آمدم برسر موضوع غالب کے قلم کا لکھا ہوا یہ فارسی قصیدہ جس کا عکس آپ کے سامنے ہے ایک بدیسی کاغذ کے چار صفحات کے فولڈر پر لکھا ہوا ہے۔ صفحہ کا سائز ½۱۲ انچ طول میں اور ۸ انچ عرض میں ہے۔ اوّل صفحہ پر دس اشعار درج ہیں۔ صفحہ کے دوسری جانب سترہ اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ قصیدہ کے اختتام پر ایک چھوٹی سی چوکور مہر ہے جس پر خط نستعلیق میں "محمد اسد اللہ خاں" اور ۱۲۳۸ کے اعداد منقوش ہیں۔ فولڈر میں انگریزی روش اختیار کی گئی ہے یعنی صفحہ دوم فولڈر کو بائیں جانب کھول کر لکھا گیا ہے۔ غالب نے قصیدہ لکھتے وقت چونکہ صفحہ اوّل اور دوم کا ہی استعمال کیا ہے لہٰذا اس وقت فولڈر کا صفحہ سوم اور چہارم خالی رہا ہوگا مگر موسم کے اثرات کے نتیجے میں اب صفحہ سوم پر صفحہ دوم کی تحریر کا کافی عکس منتقل ہو گیا ہے۔ جبکہ صفحہ چہارم (آخری صفحہ) کو حکیم قاضی حافظ محمد صدر عالم صاحب نے اپنی یادداشت کے لئے استعمال کیا ہے۔ یعنی صفحہ چہارم پر حکیم صاحب موصوف نے اپنے قلم سے ایک نسخہ تحریر فرمایا ہے جسے آپ نے نواب محمد غوث خاں رئیس جاورہ کے لئے تجویز کیا ہے۔ نسخہ کے نیچے حکیم صدر عالم صاحب کے دستخط ہیں اور ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۳ ہجری درج ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے قلم کی یہ تحریر سنہ ۱۲۷۲ ہجری مطابق ۱۸۵۵ء میں حکیم قاضی محمد صدر عالم صاحب کے پاس موجود تھی۔

کلیات[1] غالب (فارسی) کا جو نسخہ اس وقت راقم الحروف کے سامنے ہے اس میں ص ۵۷۸ پر

---

[1] کلیات غالب (فارسی)؛ مرتب امیر حسن نورانی، ناشر رام کمار بکڈپو وارث مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سنہ ۱۹۶۸ عیسوی۔

غالب کا دست نوشتہ فارسی قصیدہ، "قصیدہ سی وسوم"[1] کے عنوان کے تحت درج ہے۔ فاضل مرتب نے نیچے حاشیہ میں نسخہ دیوان فارسی مطبوعہ ۱۸۴۵ء مطبع دار السلام دہلی کا حوالہ دیا ہے جو پہلی بار غالب کی زندگی میں شائع ہوا تھا اور اس کی صحت و طباعت کی نگرانی بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ غالب نے خود انجام دی تھی۔ "قصیدہ سی وسوم" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں قصیدہ کے اشعار تو تمام ہی ہیں جو غالب کے اس دست نوشتہ قصیدہ میں ہیں البتہ ایک خاص بات جو قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ زیر بحث قصیدہ کو دیوان میں شامل کرتے وقت غالب نے اپنے قلم سے نہ صرف اشعار کی ترتیب میں نمایاں تبدیلیاں کی ہیں بلکہ بعض اشعار میں اصلاحات بھی غالب نے اپنے قلم سے کی ہیں چنانچہ حذف و اضافہ اور تغیّر و تبدّل کی مثالیں بھی "قصیدہ سی وسوم" میں جا بجا موجود ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلے وہ اشعار ملاحظہ ہوں جن کی ترتیب غالب نے "قصیدہ سی وسوم" میں بالکل بدل دی ہے۔ دست نوشتہ قصیدہ میں مندرجہ ذیل اشعار قصیدہ کے بالترتیب پانچویں[5]، چھٹے[6]، ساتویں[7] آٹھویں[8]، نویں[9]، دسویں[10]، گیارہویں[11]، بارہویں[12] اور تیرہویں[13] اشعار ہیں:

طرب در بزم عیشش بردہ حورانرا برّ قاہی
کرم بر خوانی فیضش خواندہ رضوانرا بہ مہمانی

بعہدش ماہ ہر شب کامل و آفاق مہتابی
بہ دورش زہرہ دایم حُوتی و برجیس سرطانی

دلیرانِ سپاہش را ہُنرہا جملہ بہرامی
فرازستان جاہش را بناہا جملہ کیوانی

ہمش با خلق گوناگون نوازش در حق اندیشی
ہمش با خویشتن صدرنگ نازش در خدادانی

سراہش بہر آوردہ قیصر را بہ درویشی

---

[1] کلیات غالب (فارسی)، مرتب امیر حسن نورانی، ناشر رام کمار بکڈپو وارث مطبع منشی نول کشور لکھنؤ ۱۹۶۸ء عیسوی۔

بدرگاہش قضا بنشاندہ دارا را بہ دربانی
فروزش را بہ رویش سازش پیمان یکرنگی
نوازش را بہ خویش نازش پیوند روحانی
نہاں در خاطرش اسرار اشراق فلاطونی
عیان از خاتمش آثار توقیع سلیمانی
بہ زرمش گرد رہ برخاک نشیند بدشواری
بہ عزمش کوہسار از راہ برخیزد بہ آسانی
بہ اقلیمش گدا نتواں برہ دیدن ز نایابی
بہ دہیمش گہر نتواں شمردن از فراوانی

جبکہ " قصیدہ سی وسوم " میں مذکورہ بالا پانچواں شعر تیرہویں نمبر پر، چھٹا شعر پانچویں نمبر پر ساتواں شعر دسویں نمبر پر، آٹھواں شعر چھٹے نمبر پر نواں شعر ساتویں نمبر پر، دسواں شعر بارہویں نمبر پر، گیارہواں شعر آٹھویں نمبر پر، بارہواں شعر نویں نمبر پر اور تیرہواں شعر گیارہویں نمبر پر لکھا ہوا ہے۔

اب مندرجہ ذیل اشعار میں تصحیح و اضافہ پر غور کیجئے جنہیں بلا تبصرہ نقل کیا جا رہا ہے۔ خط کشیدہ الفاظ ذہن میں رکھئے یہ تصحیحات سب غالب کے قلم سے عمل میں آئی ہیں: " دست نوشتہ قصیدہ " کے لئے دن اور " قصیدہ سی وسوم " کے لئے ق س کا مخفف اختیار کیا گیا ہے۔

شعر ۵ مصرعہ ثانی	ہمش با خویشتن صد رنگ نازش در خدا دانی	دن
	ہمش با خویش رنگا رنگ نازش در خدا دانی	ق س
شعر ۱۱ مصرعہ ثانی	عیاں از خاتمش آثار توقیع سلیمانی	دن
	عیاں بر خاتمش آثار توقیع سلیمانی	ق س
شعر ۱۶ مصرعہ ثانی	کہ سیمائش بہ ماہ و مہر ماند در درخشانی	دن
	کہ سیمائش بمہر و ماہ ماند در درخشانی	ق س
شعر ۱۷ مصرعہ ثانی	کہ خود تا مشتری خواہد رسید از فرط غلطانی	دن
	کہ خود تا مشتری خواہد رسید از فرط غلتانی	ق س

شعر ۱۵ مصرعہ اولیٰ	بگفتارم تونگر گر ز سیم و زر تہید ستم	د ن
	بگفتارم توانگر گر بہ سیم و زر تہید ستم	ق س
شعر ۲۱ مصرعہ اولیٰ	بسان دود کاندر تنگنا بر خویشتن پیچد	د ن
	بسان درد کاندر تنگنا بر خویشتن پیچد	ق س
شعر ۲۲ مصرعہ اولیٰ	نمک پروردۂ این دولت جاوید پیا نم	د ن
	نمک پرورده این دولت جاوید پیا یم	ق س
شعر ۲۳ مصرعہ ثانی	کہ با من داشت گوناگوں نوازشہای پنہانی	د ن
	کہ بامن داشت گوناگوناگوں نوازشہای پنہانی	ق س
شعر ۲۶ مصرعہ اولیٰ	گر آن در رشتہ وصف سخنور گوہر آمودے	د ن
	گر او در رشتہ مدح سخنور گوہر آمودے	ق س

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ زیر بحث دست نوشتہ قصیدہ کے آخر میں غالب کی مہر
کے اندر ۱۲۳۸ کے اعداد منقوش ہیں۔ اس سے یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ قصیدہ غالب نے
۱۲۳۸ ہجری مطابق ۱۸۲۲ء میں سپرد قلم کیا ہوگا۔ کیونکہ قدیم تحریروں یا مخطوطات کی مدت عمر
یا زمانہ کتابت متعین کرنے کا ایک عام اصول جو مروّج ہے وہ یہ ہے کہ اس قلمی تحریر یا مخطوطے
پر ثبت مُہر کے اندر اگر کوئی سنہ مرقوم ہے تو وہی اس مخطوطے یا قلمی تحریر کے زمانہ کتابت کا سنہ قرار پاتا
ہے۔ لیکن بعض اہم وجوہات کی بنا پر ہم غالب کی اس تحریر کو اس مروجہ اصول سے مستثنیٰ قرار
دینے پر مجبور محض ہیں۔

لارڈ ایلن برا جن کی مدح میں غالب نے یہ قصیدہ لکھا ہے انہوں نے ۲۸ فروری ۱۸۴۲ء
کو گورنر جنرل لارڈ آکلینڈ سے گورنر جنرل کے عہدے کا چارج لیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ قصیدہ
غالب نے ۱۸۴۲ء میں مارچ کی کسی تاریخوں میں لکھا ہوگا اور قصیدہ لکھنے کے بعد اس کے
آخر میں انھوں نے اپنی ۱۲۳۸ کے اعداد والی پرانی مہر ثبت کر دی۔ اس خیال کی تائید اس بات
سے بھی ہوتی ہے کہ غالب نے قصیدہ لکھنے کے لئے جو بدیسی کاغذ استعمال کیا ہے اسے روشنی
کی طرف کر کے دیکھنے پر صفحہ اوّل کے اندر عین وسط میں ایک مخروطی شکل کا مونوگرام جس کے

اوپر برطانوی شاہی تاج سے دکھائی پڑتا ہے۔ اسی طرح صفحۂ چہارم کے اندر بین وسطی جلی حرفوں میں WILMOT ۔ ہے (جو کہ یقیناً کاغذ ساز کمپنی کا نام رہا ہوگا) اور اس کے نیچے ۱۸۳۹ء کے اعداد صاف پڑھے جا سکتے ہیں۔ اب یا تو یہ کورا کاغذ غالب کے پاس ۱۸۳۹ء سے محفوظ رہا ہوگا جسے انہوں نے ۱۸۴۲ء میں استعمال کیا یا پھر ممکن ہے اس کاغذ ساز کمپنی کا قیام ۱۸۳۹ء میں عمل میں آیا ہو جس کی تشہیر کی غرض سے مذکورہ کمپنی نے ۱۸۳۹ کے اعداد کو اپنے نام کا ایک جزو بنا رکھا ہو اور وہ اسی طریق پر کاغذ تیار کرتی ہو۔ تب غالب کو ۱۸۴۲ء میں ہی یہ کاغذ دستیاب ہوا ہوگا۔

بہرحال ان شواہد کی روشنی میں یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ زیر بحث قصیدہ ۱۸۴۲ء میں ہی غالب کے قلم سے نقل ہوا ہے اور اس اعتبار سے مزید اہمیت رکھتا ہے کہ اس پر غالب کی مہر ثبت ہے۔ راقم الحروف عدیم الفرصتی اور اپنے ادبی مطالعے کی وجہ سے غالب کی مہروں کے بارے میں صحیح معلومات اکٹھا نہیں کر سکا کہ غالب کی کتنی مہریں اب تک دستیاب ہو چکی ہیں۔ ہو سکتا ہے غالب کے پاس ایک سے زیادہ مہریں رہی ہوں لہٰذا زیر بحث قصیدہ کے اختتام پر وہ سہواً ۱۲۳۸ کے اعداد والی مہر استعمال کر گئے جس کا احساس ہونے پر انہوں نے یہ تحریر گورنر جنرل موصوف کو بھیجنا مناسب نہ سمجھا ہو اور اس کی دوسری نقل تیار کر کے گورنر جنرل لارڈ ایلن برا کو بھیجی ہو۔ بہرحال اب دیکھنا یہ ہے کہ ماہرین غالب اس کے تفصیلی مطالعہ سے کیا کیا نئی باتیں سامنے لاتے ہیں۔

غالب کی عظمت کی اس سے بڑی دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ ان کی شخصیت اور شاعری کے تعلق سے تنقید و تحقیق کا کارواں آج ایک سو پچیس سال گذر جانے پر بھی برابر سرگرم سفر ہے فروری ۱۹۶۹ء کے "اردو معلیٰ" (غالب نمبر حصہ سوم) میں جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ کی ایک نہایت پر زور تحریر "نسخہ گل رعنا بخط غالب" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی اس سے ایک چھوٹا سا اقتباس پیش خدمت ہے۔

"اردو کے اہم شاعر اور بھی ہیں مگر یہ خصوصیت غالب اور صرف غالب کو حاصل ہے کہ ہر برس اور بعض اوقات ایک سال میں کئی کئی بار اس کے بارے میں

(بقیہ صفحہ ۲۰ پر)

ذہن کی ورزش
انعامی مقابلہ

کیا آپ کو معلوم ہے؟

۱ دونوں جہاں کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم نے کس صحابی کے بارے میں جوش مسرت سے فرمایا تھا کہ اگر کوئی میری غیر شادی شدہ بیٹی ہوتی تو میں اس کا نکاح اس شخص سے کر دیتا جس نے مسجد میں روشنی کی ہے؟

۲ قرآن پاک کی فارسی تفسیر "سواطع الالہام" جس میں کوئی منقوط حرف استعمال نہیں کیا گیا کس کی لکھی ہوئی ہے؟

۳ عہد بنوامیہ میں مسجد نبوی پر آب زر سے "سورۃ الشمس" کس مشہور خطّاط قرآن نے لکھی تھی؟

۴ دور جدید میں اتحاد اسلامی کے علمبردار سید جمال الدین افغانی کی وفات کب اور کہاں ہوئی اور ان کا جسد پاک کس سن عیسوی میں افغانستان نے جاکر کابل یونیورسٹی کے نزدیک دفن کیا گیا؟

۵ مشہور شاعر "سیماب اکبر آبادی" نے جنھوں نے قرآن پاک کا منظوم ترجمہ کیا تھا کب رحلت فرمائی؟

۶ اس شعر میں اقبال کا تخاطب کس سے ہے؟

تیری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوط خمدار کی نمائش، مریز و کجدار کی نمائش

۷ برصغیر کی کس مسجد میں اورنگ زیب عالمگیر کے لکھے ہوئے کتبے موجود ہیں؟

۸ قرآن پاک میں کن چار مساجد کا ذکر آیا ہے؟

۹ وہ کون سی جنگ تھی جس میں حضورؐ نے تیر اٹھا اٹھا کر اپنے چچاؤں کو دیئے تھے؟
۱۰ حضرت عمرؓ نے مکہ میں کس شخص کے مکان کو خرید کر جیل خانہ بنایا۔ جو اسلام کا پہلا جیل خانہ تھا؟

اوپر دیئے گئے سوالات کے جواب ہمیں ۱۵ نومبر تک پہنچ جانے چاہئیں۔ کاغذ پر سوال لکھنے کی ضرورت نہیں۔ صرف جواب لکھیں اور کاغذ پر ایک طرف لکھے ہوئے خوش خط جوابات کے ساتھ نیچے دیا ہوا کوپن بھی آنا ضروری ہے۔ درست جواب دینے والے کو ایک سال کے لئے "برہان" مفت ارسال کیا جائے گا۔ ایک سے زیادہ صحیح جواب کی صورت میں قرعہ اندازی کی جائے گی

خط بھیجنے کے لئے پتہ نوٹ کرلیں۔ "انچارج ذہن کی ورزش انعامی مقابلہ" دفتر برہان" اردو بازار جامع مسجد دہلی

نام ....
گھر کا پتہ ....
....

آپ کو 'برہان' کا یہ سلسلہ کیسا لگا؟

اچھا ☐ بہت اچھا ☐ غیر دلچسپ ☐

بقیہ: "غالب کا فارسی قصیدہ"

نیا تحقیقی مسالا اہل ذوق کے ہاتھ آتا رہتا ہے۔ میں اپنے دوستوں سے اکثر کہتا ہوں کہ کسی اللہ والے نے غالب سے خوش ہو کر اسے یہ دُعا دی تھی کہ "تیری کوئی تحریر ضائع نہ ہوگی"!

سچ پوچھئے تو اسے کسی اللہ والے کی دُعا کا اثر ہی کہا جا سکتا ہے کہ غالب کے قلم کی یہ تحریر ڈیڑھ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ گذر جانے پر موتی کی طرح جھلملا رہی ہے۔

امام ابو عمرو حفص بن سلیمان کوفی

از:۔ محمد الیاس الاعظمی ایم۔ اے

قرن اول میں جن ائمہ کرام نے علم قرأت کے چراغ روشن کیے ان میں امام حفص بن سلیمان کا نام سر فہرست ہے ان کا شمار اقلیم علم قرأت کے تاجداروں میں ہوتا ہے ان کی تگ و دو محنت و جانفشانی اور اخلاص و للٰہیت سے ان کے طرز قرأت نے وہ قبول عام حاصل کیا کہ آج پورے عالم اسلام میں قرآن مجید انھیں کے طرز قرأت اور لب و لہجے سے پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔
مولانا قاری شاہ محمد حسین چشتی لکھتے ہیں :۔

"ان کی روایت بلاد مغرب کے علاوہ تمام ملک عرب و عجم میں خصوصیت کے ساتھ رائج ہے اور برصغیر ہند و پاک میں بھی یہی روایت پڑھی جاتی ہے اور یہ قبولیت خداداد ہے کہ صدیاں گذر گئیں مگر آج بھی مکاتب و مدارس میں صرف روایت حفص پڑھائی جاتی ہے اور روئے زمین پر ایک ہزار حفاظ میں سے تقریباً نو سو ننانوے کو صرف یہی روایت حفص یاد ہے ایسا شاید کوئی نہ ہو جس نے یہ روایت نہ پڑھی ہو"

امام حفصؒ نے اپنے عہد کے یکتائے روزگار تابعی اور امام القرا امام عاصم بن بہدلہ کوفی سے قرأت قرآن کی تحصیل و تکمیل کی اور مدۃ العمر اس کی ترویج و ترقی اور نشر و اشاعت میں مصروف رہے، محمد بن سعید العوفی کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد کو فرماتے ہوئے سنا کہ :

"حفص بن سلیمان لو رأیت لقرت عیناک فہماً و علماً" [1]
امام حفص بن سلیمان کو اگر تم دیکھتے تو ان کے علم و فہم کی وجہ سے تمہاری نگاہیں ٹھنڈی ہو جاتیں۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۴۰۰۔

نام ونسب!

حفص نام، ابوعمرو کنیت اور شجرۂ نسب حسب ذیل ہے:-
ابوعمرو حفص بن سلیمان بن المغیرہ ابوعمر بن ابی داؤد اسدی کوفی۔ [1]

اپنے نام حفص اور حفیص سے مشہور ہوئے۔ امام القراء امام عاصم کوفی کے پروردہ اور ان کی بیوی کے لڑکے ہیں استاد اور شاگرد دونوں بنو اسد کے آزاد کردہ غلام تھے۔ [3]
قاری ابوالحسن اعظمی نے انھیں امام عاصم کا متبنیٰ بتایا ہے۔ جو صحیح نہیں ہے بلکہ وہ ان کی بیوی کے پہلے شوہر کے لڑکے تھے جن کو امام عاصم نے پالا تھا جیسا کہ علامہ جزریؒ اور صاحب معجم الادبار نے اس کی تصریح کی ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"وکان ربیب عاصم ابن زوجۃ"۔ [5] امام حفصؒ امام عاصم کی گود میں پلے تھے اور وہ ان کی بیوی کے پہلے شوہر کے لڑکے تھے۔

ولادت و وطن اور تعلیم!

امام حفص بن سلیمانؒ ۹۰ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے [6] اور یہی کوفہ ان کا وطن بھی ہے
امام ابوعمرو حفص بن سلیمان نے امام عاصم بن بہدلہ کوفی سے قرأت قرآن کی تعلیم حاصل کی اور اس فن میں بڑی مہارت و صلاحیت پیدا کی علامہ جزری فرماتے ہیں:

کان اعلم اصحاب عاصم بقرأۃ عاصم [7]"

---

[1] معجم الادبار ج ۴ ص ۱۱۸ و کتاب الاستکمال ص ۱۰۱ و شجرۂ سبعہ قرأت ص ۱۹۔
[2] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۴۰۰ و تقریب التہذیب ص ۷۷۔
[3] میزان الاعتدال ج ۱ ص ۲۶۱۔
[4] علم قرأت اور قرار سبعہ ص ۱۰۱۔
[5] النشر ص ۱۵۶ بحوالہ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند مارچ ۸۳ء ص ۴۳ و معجم الادبار ج ۴ ص ۱۱۸۔
[6] معجم الادبار ج ۴ ص ۱۱۸۔
[7] ایضاً و النشر ص ۱۵۶۔

امام حفص امام عاصم کوفی کے تلامذہ میں قرأت عاصم کے سب سے زیادہ واقف کار تھے۔

بعدازاں بغداد[1] جانے اور تحصیل علم کے بعد مکہ معظمہ میں سکونت اختیار کرنے کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے قیاس ہے کہ یہ سفر بھی حصول علم ہی کے سلسلے میں رہا ہوگا۔
پھر امام حفص بن سلیمان اپنے عہد کے ماحول و دستور کے مطابق علم حدیث کے حصول میں مشغول ہوئے بعدازاں خود ان سے علم حدیث کا اکتساب طالبین نے کیا۔
حدیث میں ان کے مقام و حیثیت پر مختلف آراء ہیں امام دانیؒ اور امام وکیع نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے:

"کان ثقة اخرج النسائی حدیث فی مسند علی متابعة" [1] امام حفص ثقہ تھے نسائی نے مسند علی میں ان کی حدیث تائیداً نقل کی ہے۔

لیکن اور ائمہ حدیث کے نزدیک وہ قابل جرح ہیں چنانچہ امام بخاری و مسلم کا بیان ہے کہ حفص بن سلیمان محدثین کے نزدیک متروک الحدیث ہیں [3]
ان کی مروی احادیث کو ضعیف کہا گیا ہے حاکم نے ان کو ذاھب الحدیث اور ابن خراش نے متروک یضع الحدیث لکھا ہے ابن المدینی ابوذرعہ ابن ابی حاتم امام نسائی اور امام دارقطنی نے بھی ضعیف الحدیث کہا ہے [4]۔ امام نسائی فرماتے ہیں:

"لیس بثقة ولا یکتب حدیثه" [5] ثقہ نہیں ہیں اور ان کی حدیث نہیں لکھی جاتی۔

---

[1] کتاب التبصرہ ص ۱۸۳۔
[2] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۴۰۲ و تقریب التہذیب ص ۷۷۔
[3] ایضاً و تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۴۰۱۔
[4] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۴۰۱ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۲۶۱۔
[5] " " ج ۲ ص ۴۰۱۔

امام ابن حبان کا بیان ہے کہ :۔

"یقلب الاسانید ویرفع المراسیل حکی ابن الجوزی فی الموضوعات"[1]

حفص سندوں میں الٹ پھیر کر دیتے ہیں اور مرسل روایتوں کو مرفوع روایت کرتے ہیں یہ بات علامہ ابن الجوزی نے موضوعات میں بیان کی ہے۔

ساجی کا بیان ہے کہ :۔

"حفص ممن ذہب حدیثہ عندہ مناکیر"[2]

حفص ان لوگوں میں سے ہیں جن کے پاس حدیث کا سرمایہ نہیں ہے بلکہ قابل انکار روایتیں ہیں۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں :

"یحدث عن سماک وغیرہ احادیث بواطیل"[3]

حفص سماک وغیرہ سے باطل روایات نقل کرتے ہیں۔

صالح بن محمد کا بیان ہے کہ :

"لا یکتب حدیثہ واحادیثہ کلھا مناکیر"[4] ان کی بیان کردہ روایتوں کو محدثین کے یہاں ضبط تحریر میں نہیں لایا جاتا وہ سب منکر ہیں۔

ان روایتوں کی وجہ سے طبقہ محدثین میں ان کا مقام و مرتبہ متنازع ضرور ہوا مگر فن قرأت میں ان کے علوئے مرتبت پر سب متفق ہیں اور دراصل یہی فن ان کے لئے سرمایۂ افتخار ثابت ہوا۔

اساتذہ وشیوخ :

امام حفص بن سلیمان نے امام عاصم کوفی کے علاوہ بھی متعدد شیوخ سے اکتساب فیض

---

1. تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۴۰۱۔
2. ایضاً ص ۴۰۲۔
3. ایضاً ص ۴۰۲۔
4. ایضاً ص ۴۰۲۔

کیا ان میں بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں !

عاصم الاحول، عبدالملک بن عمیر، لیث بن ابی سلیم، کثیر ابن شنظیر، اسحاق السبیعی، کثیر بن زاذان، قیس بن مسلم، علقمہ بن مرثد، محارب بن دنار، وغیرہ [1]

تلامذہ !

امام حفص بن سلیمان کوفی نے ایک مدت تک قرأت قرآن کا درس دیا ان سے اکتساب فیض کرنے والوں کے نام یہ ہیں !

ابو محمد عبید بن صباح بن صبیح کوفی ، ابو شعیب صالح بن محمد القواس، حفص بن غیاث علی بن عیاش، آدم بن ابی ایاس، علی بن حجر، ہشام بن عمار، محمد بن حرب خولانی، علی بن یزید الصدائی، ھبیرہ التمار، عمر بن الصباح وغیرہ [2]

فن قرأت میں علوئے کمال و قبولیت !

امام حفصؒ اگرچہ مختلف النوع خصوصیات کے حامل تھے تاہم ان کا اصل طغرائے امتیاز فن قرأت ہی تھا جیساکہ اوپر گذرا دنیا بھر میں انہی کی قرأت پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے امام اعظم ابو حنیفہؒ اور دیگر ائمہ کبار نے انہی کی قرأت کو اختیار کیا چنانچہ آج بھی اختلاف مسلک ومشرب کے باوجود بلاد اسلامیہ کی اکثریت اور بالخصوص برصغیر ہند و پاک کے مسلمان انھیں کی قرأت پڑھتے اور پڑھاتے ہیں ۔

امام حفص کی قرأت کو مورخین اور تذکرہ نگاروں نے صحیح ترین روایت قرار دیا ہے اس سے فن قرأت میں ان کی بلند پایگی کا اندازہ ہوتا ہے اور بحیثیت امام قرأت ان کے مرتبہ بلند کی شہادت ملتی ہے علامہ ذھبیؒ کا بیان ہے کہ" قرأۃ میں ثقہ ثبت اور ضابطہ تھے امام رفاعیؒ کا بیان ہے کہ :۔

"کان حفص اعلمھم بقرأۃ عاصم" [3] امام حفص قرأت عاصم کے زیادہ واقف کار تھے ۔

---

[1] ایضاً ص ۴۰۰ و تقریب التہذیب ص ۷۷ ۔

[2] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۴۰۱ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۲۶۱ ۔

[3] کتاب التبصرہ ص ۱۸۳ ۔

امام ابن حبان کا بیان ہے کہ :-

"یقلب الاسانید و یرفع المراسیل وحکی ابن الجوزی فی الموضوعات"[1]

حفص سندوں میں الٹا پھیر کر دیتے ہیں اور مرسل روایتوں کو مرفوع روایت کرتے ہیں یہ بات علامہ ابن الجوزی نے موضوعات میں بیان کی ہے۔

ساجی کا بیان ہے کہ :-

"حفص ممن ذهب حدیثه عند لا مناکیر"[2]

حفص ان لوگوں میں سے ہیں جن کے پاس حدیث کا سرمایہ نہیں ہے بلکہ قابل انکار روایتیں ہیں۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں :

"یحدث عن سماك و غیره احادیث بواطیل"[3]

حفص سماک وغیرہ سے باطل روایات نقل کرتے ہیں۔

صالح بن محمد کا بیان ہے کہ :

"لا یکتب حدیثه و احادیثه کلها مناکیر"[4] ان کی بیان کردہ روایتوں کو محدثین کے یہاں ضبط تحریر میں نہیں لایا جاتا وہ سب منکر ہیں۔

ان روایتوں کی وجہ سے طبقہ محدثین میں ان کا مقام و مرتبہ متنازع ضرور رہا مگر فن قرأت میں ان کے علوئے مرتبت پر سب متفق ہیں اور دراصل یہی فن ان کے لئے سرمایۂ افتخار ثابت ہوا۔

اساتذہ و شیوخ :

امام حفص بن سلیمان نے امام عاصم کوفی کے علاوہ بھی متعدد شیوخ سے اکتساب فیض

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۴۰۱۔

[2] ایضاً ص ۴۰۲۔

[3] ایضاً ص ۴۰۲۔

[4] ایضاً ص ۴۰۲۔

کہ ان میں بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں :

عاصم الاحول، عبد الملک بن عمیر، لیث بن ابی سلیم، کثیر ابن شنظیر، اسحاق السبیعی، کثیر بن زاذان، قیس بن مسلم، علقمہ بن مرثد، محارب بن دثار، وغیرہ [1]

تلامذہ :

امام حفص بن سلیمان کوفی نے ایک مدت تک قرأت قرآن کا درس دیا ان سے اکتساب فیض کرنے والوں کے نام یہ ہیں :

ابو محمد عبید بن صباح بن صبیح کوفی، ابو شعیب صالح بن محمد القواس، حفص بن غیاث علی بن عیاش، آدم بن ابی ایاس، علی بن حجر، ہشام بن عمار، محمد بن حرب خولانی، علی بن یزید الصدائی ہبیرہ التمار، عمر بن الصباح وغیرہ [2]

فن قرأت میں علوئے کمال و قبولیت :

امام حفصؒ اگرچہ مختلف النوع خصوصیات کے حامل تھے تاہم ان کا اصل طغرائے امتیاز فن قرأت ہی تھا جیسا کہ اوپر گذرا دنیا بھر میں انہی کی قرأت پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے امام اعظم ابو حنیفہؒ اور دیگر ائمہ کبار نے انہی کی قرأت کو اختیار کیا چنانچہ آج بھی اختلاف مسلک و مشرب کے باوجود بلاد اسلامیہ کی اکثریت اور بالخصوص برصغیر ہند و پاک کے مسلمان انہیں کی قرأت پڑھتے اور پڑھاتے ہیں۔

امام حفص کی قرأت کو مورخین اور تذکرہ نگاروں نے صحیح ترین روایت قرار دیا ہے اس سے فن قرأت میں ان کی بلند پائیگی کا اندازہ ہوتا ہے اور بحیثیت امام قرأت ان کے مرتبہ بلند کی شہادت ملتی ہے علامہ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ "قرأۃ میں ثقہ ثبت اور ضابط تھے امام رفاعیؒ کا بیان ہے کہ :۔

"کان حفص اعلمھم بقرأۃ عاصم" [3] امام حفص قرأت عاصم کے زیادہ واقف کار تھے۔

---

[1] ایضاً ص ۴۰۰ و تقریب التہذیب ص ۷۷۔

[2] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۴۰۱ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۲۶۱۔

[3] کتاب التبصرہ ص ۱۸۳۔

علامہ جزری فرماتے ہیں :

واقسوا الناس دھرا۔ ۱؎ امام حفص اپنے زمانہ کے سب سے بڑے قاری تھے۔

امام وکیع فرماتے ہیں :

واما القرأة فھو فیھا ثبت بالاجماع۔ ۲؎

امام حفص فن قرأت میں متفقہ طور پر قابل اعتبار ہیں۔

صاحب دائرہ معارف اسلامیہ نے لکھا ہے :۔

ان کی شہرت کا دارو مدار اس قرأت پر ہے جو انہوں نے اپنے کوفی استاد (عاصم) سے جن کے وہ داماد تھے حاصل کی تھی مؤخر الذکر کی وفات اور بغداد کی تاسیس کے بعد وہ دار الخلافہ میں مقیم ہو گئے جہاں ان کے بہت سے شاگرد تھے پھر اپنے خسر کی قرأت کی ترویج و اشاعت کی جس میں شعبہ بن عیاش (م ۱۹۴ھ/۸۵۹ء) کا حصہ تھا لیکن حفص کو زیادہ مستند خیال کیا جاتا ہے اور ان کی مساعی سے جو سلسلہ قرأت منقول ہوتا چلا آیا ہے اسی کو قرآن مجید کے اس نسخہ کے متن متعین کے لئے انتخاب کیا گیا جو ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۳ء میں شاہ فواد کی سرپرستی میں قاہرہ میں شائع ہوا اور جسے عہد حاضر میں مستند ترین تصور کیا جاتا ہے BLACHC-RE (INTROD. AU. CORAN) پیرس ۱۹۴۷ء ص ۱۳۴ تا ۱۳۵) نے اس کی طرف خاص توجہ دلائی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ مستقبل میں ملت اسلامیہ غالباً صرف اسی قرأت کو تسلیم کرنے لگے جو حفص کے واسطے سے ہم تک پہونچی ہے "۳؎

حفظ و ثقاہت :

امام ابو عمرو حفص بن سلیمان کی قوت حفظ و ضبط بے مثل تھی علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں :۔

" امام فی القرأة فثقة ثبت ضابط بخلاف حالہ فی الحدیث "۴؎

۱؎ النشر ص ۱۵۶۔

۲؎ تقریب التہذیب ص ۷۷۔

۳؎ دائرہ معارف اسلامیہ ج ۸ ص ۴۲۹۔

۴؎ النشر ص ۱۵۶

امام حفص قرأت کے امام ثقہ ثبت اور ضابط تھے البتہ حدیث میں یہ حال نہ تھا۔

امام ابو بکر خطیب فرماتے ہیں کہ متقدمین حضرات قرأت کے بارے میں حفصؒ کو شعبہؒ سے زیادہ افضل اور قوی الحافظہ سمجھتے تھے اور حفص نے جو قرأت امام عاصم سے پڑھی تھی اس کے بارے میں حفص کو ضابط اور حافظ کہتے ہیں [۱]

علامہ شاطبیؒ نے بھی انکو اعلیٰ درجہ کا ضابط اور ثقہ بتایا ہے ان کا مشہور مصرع ہے ؎

وحفص بالاتقان کان مفضلا

ترجمہ: حفص ضبط و اتقان میں ممتاز ترین ہیں۔

امام حفص کا خود بیان ہے کہ ضُعف کے ضمہ کے علاوہ میں نے کسی حرف میں بھی امام عاصم کوفی کی مخالفت نہیں کی، لیکن بعض ائمہ نے مثلاً عثمان الدارمی اور ابن معین وغیرہ نے ان کو غیر ثقہ بتایا ہے۔ [۲]

زہد و تقویٰ!

امام حفص بن سلیمان علم کے بلند و رفیع مرتبہ پر فائز تو تھے ہی درجہ عمل میں بھی کم نہ تھے درحقیقت وہ علم و عمل کے مجمع البحرین تھے عملی زندگی میں وہ عابد و زاہد اور صاحب تقویٰ و اعمال صالحہ تھے۔

ان کے ہم عصر و ہم درس شعبہ بن عیاش نے البتہ ان کی بے احتیاطی کا شکوہ کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ حفصؒ نے مجھ سے کتاب لی اور واپس نہیں کی اور کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کی کتابیں لیتے تھے تو اس میں ترمیم و تنسیخ کردیتے تھے [۳]

امام حفص کے علم و فضل کی مختلف شہادتوں کے بعد اس قسم کی شکایت کو معاصرانہ رشک پر ہی محمول کیا جاسکتا ہے۔

---

[۱] ملا علی قاری شرح شاطبی ص ۱۴ بحوالہ علم قرأت اور قراء سبعہ ص ۱۰۴ تذکرہ قاریان ہند ج ۱ ص ۱۴

[۲] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۴۰۰۔

[۳] ایضاً ص ۴۰۱۔

موازنہ شعبہ و حفص:

امام حفص اور امام شعبہ بن عیاش دونوں نے ایک ہی سرچشمہ فیض سے استفادہ کیا تھا دونوں نے شہرت و مرجعیت حاصل کی اور دونوں کی قرأت کو حسن قبول عطا ہوا لیکن جمہور علماء نے قرأت میں امام حفصؒ ہی کو برتر مانا ہے بہتر ہوگا کہ ہم یہاں بعض ائمہ قرأت و جرح و تعدیل کے اقوال نقل کر کے دونوں کا موازنہ کر دیں، ابن معین کا بیان ہے کہ:

"کان حفص و ابوبکر من اعلم الناس بقرأۃ عاصم وکان حفص اقرأ من ابی بکر وکان کذابا وکان ابوبکر صدوقا"[1]

امام حفص اور ابوبکر (شعبہ) امام عاصم کوفی کی قرأت کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے ان میں بھی حفص ابوبکر سے زیادہ عالم تھے البتہ حفص دروغ گو اور ابوبکر صادق تھے۔

ایک جگہ یہ بھی اضافہ ہے کہ قرأت عاصمؒ کی اصح روایت وہ ہے جو امام حفص نے روایت کی ہے اور امام حفص قرأت عاصم کے زیادہ واقف کار تھے انھیں ضبط قرأت میں شعبہ پر فوقیت حاصل ہے۔[2]

علامہ ابن القاصح بغدادی تحریر فرماتے ہیں:

"هو حفص بن سليمان الكوفي ويكنى ابا عمرو ويعرف بحفص قرأ على عاصم قال ابن معين هو اقرأ من ابى بكر ولهذا قال الشاطبى" وبالاتقان كان مفضلا" يعنى اتقان حرف عاصم رحمه الله"[3]

امام حفص بن سلیمان کوفی جن کی کنیت ابوعمرو ہے اور عرف حفص ہے امام عاصم کے شاگرد ہیں پڑھا ہے ابن معین کے بیان کے مطابق یہ ابوبکر سے بڑے قاری ہیں اور اسی بنا پر ان کے بارے میں امام شاطبی کی یہ رائے ہے کہ یہ قرأت عاصم کے ضبط و اتقان میں سب سے نمایاں شخص ہیں۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۴۰۱ ومضمون چند قراء، مولانا محمد اسحاق بھٹی ماہنامہ المعارف لاہور مارچ ۱۹۶۹ء ص ۲۷

[2] معجم الادباء ج ۴ ص ۱۱۸

[3] سراج القاری المبتدی ص ۱۵۔

حافظ ابوشامہؒ اور ملا علی قاریؒ نے بھی کم و بیش اسی طرح کی آراء کا اظہار کیا ہے [1]

قرأت حفصؒ:

امام حفص نے امام عاصم کوفی سے فن قرأت کے جن اصول و ضوابط کو سیکھا تھا اس کا کلی طور پر احترام کرتے تھے سوائے سورۃ الروم کے لفظ ضعف کے لیکن امام ابوبکر شعبہ کا معاملہ ایسا نہ تھا قاری ابوالحسن اعظمی نے لکھا ہے کہ "شعبہ نے اصول میں حفص سے اختلاف نہیں کیا ہے اگر کہیں ہے بھی تو بہت کم نہ ہونے کے برابر ہے [2] لیکن علامہ ابن الجزریؒ نے لکھا ہے کہ ابن عیاش (شعبہ) پانچ سو بیس امور میں حفص سے اختلاف رکھتے تھے [3] امام حفص کے اصول و ضابطہ قرأت یہ ہیں.

قاعدہ نمبر ۱:- مد متصل اور مد منفصل دونوں میں توسط کرتے ہیں۔

مد متصل اور مد منفصل کی مقدار دو ڈھائی اور چار الف کے برابر ہوتی ہے۔

قاعدہ نمبر ۲:- دو متحرک ہمزہ کے قریب قریب جمع ہونے کی تمام صورتوں میں بلا ادخال کے دونوں ہمزہ کی تحقیق کرتے ہیں لیکن لفظ ءَاَعْجَمِیٌّ میں دوسرے ہمزہ کی تسہیل کرتے ہیں۔

قاعدہ نمبر ۳:- اذ کے ذال کا ظا میں اور قد کے دال کا تا میں اور تائے تانیث کا دال اور طا میں اور قل، بل اور ھل کے لام کا را میں ادغام کرتے ہیں۔

قاعدہ نمبر ۴:- صرف لفظ مجریها میں امالہ کرتے ہیں

الف کو یا کی طرف اور فتحہ کو کسرہ کی طرف مائل کرنے کو امالہ کہتے ہیں اور اس کی دو قسمیں ہیں اگر اتنا مائل کر دیا کہ یا اور کسرہ کا غلبہ ہو گیا تو اس کو امالہ کبریٰ کہتے ہیں اور اگر الف اور فتحہ کا غلبہ ہو گیا تو اس کو امالہ صغریٰ کہتے ہیں امالہ کی ضد فتحہ ہے۔

قاعدہ نمبر ۵:- سورہ کہف کے لفظ عِوَجًا پر اور سورہ یٰسین کے من مرقدنا پر اور سورۃ قیامہ کے وقیل من پر اور سورہ مطففین کے کلا بل پر مع المد سے وصل کی حالت میں سکتہ کرتے ہیں

---

[1] ابراز المعانی ص ۲۶ و ملا علی قاری شرح شاطبی ص ۱۴۔

[2] علم قرأت اور قراء سبعہ ص ۱۳۱

[3] دائرہ معارف اسلامیہ لاہور ج ۸ ص ۸۲۹۔

پڑھتے پڑھتے کسی کلمہ کے آخر حرف پر بغیر سانس توڑے آواز کو تھوڑی دیر بند کر دینے کو سکتہ کہتے ہیں۔ سکتہ کی بہت سی قسمیں ہیں تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب "اسہل التجوید صفحہ ۶۸"۔

قاعدہ نمبر ۶:۔ یاء اضافت کے بعد ہمزہ قطعی مفتوح ہونے کی صورت میں مَعِیَ اَبَدًا (سورہ توبہ) اور مَعِیَ اَوْ رَحِمَنَا (سورہ ملک) ان دونوں لفظوں میں یاء اضافت کو مفتوح باقی ہر جگہ ساکن اور ہمزہ مکسور ہونے کی صورت میں بِبَاسِطٍ یَدِیَ اِلَیْکَ اور اُمِّیَ اِلٰھَیْنِ (سورہ مائدہ) اور اجریِ نو جگہ ان لفظوں میں مفتوح باقی ہر جگہ ساکن اور ہمزہ وصل مع لام تعریف کی ہر صورت میں سورہ بقرہ کے عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ میں ساکن باقی ہر جگہ مفتوح اور ہمزہ کے سوا کسی اور حرف کی صورت میں وَلِیَ نَعْجَۃٌ (سورہ ص) اور مَحْیَایَ (سورہ انعام) اور فَقَالَ مَالِیَ (سورہ نمل) اور وَلِیَ فِیْھَا (سورہ طٰہٰ) اور وَلِیَ دِیْنِ (سورہ کفرون) اور مَالِیَ (سورہ یٰسین) اور وَجْھِیَ (سورہ انعام و آل عمران) اور مَاکَانَ لِیَ عَلَیْکُمْ مِنْ سُلْطٰنٍ اور مَاکَانَ لِیَ مِنْ عِلْمٍ اور مَعِیَ ہر جگہ اور بَیْتِیَ ہر جگہ ان الفاظ میں مفتوح باقی ہر جگہ ساکن پڑھا ہے۔

قاعدہ نمبر ۷:۔ سورہ نمل کے فَمَا اٰتٰنِیَ میں یاء زائد مفتوح پڑھتے ہیں لیکن حالت وقف میں حذف کرنا بھی ایک طریق سے ثابت ہے۔

ضعف کا مسئلہ:

امام حفص نے اپنے عالی مقام استاد امام عاصم کوفی سے قرأت میں صرف ایک جگہ اختلاف کیا ہے۔ آیت کریمہ "اللّٰہ خلقکم من ضُعْفٍ ثم جَعَلَ من بعد ضُعْفٍ قُوَّۃً ثم جعل من بعد قوۃ ضُعْفًا و شیبۃً" (سورۃ الروم: ۳۰) میں تین جگہ ضعف کا لفظ آیا ہے جنکو ان کے شیخ امام عاصم کوفی نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے لیکن امام حفصؒ نے بعض روایات اور اپنے دوسرے شیوخ سے اخذ واستفادہ اور استقراء و تفحص کے بعد مذکورہ آیت میں لفظ ضعف کو تینوں جگہ بالضم صحیح اور راجح قرار دیا اور اسی پر آج تک امت کا عمل ہے۔

امام عاصم کوفی کی دلیل وہ حدیث ہے جو فضیل بن مرزوق نے عطیہ عوفی سے اور

انھوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مرفوعاً روایت کی ہے یہ حدیث ان کے علاوہ بھی اور بہت سے طرق سے مروی ہے وہ روایت یہ ہے!

حضرت عطیہ عوفی سے مروی ہے کہ میں نے حضرت ابن عمرؓ کے سامنے یہ آیت "اللہ خلقکم الخ" پڑھی تو حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو اسی طرح قرأت کی جس طرح تم نے میرے سامنے کی (یعنی فتحہ کے ساتھ) تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری گرفت فرمائی جس طرح میں نے تمہاری گرفت کی۔

اس روایت کو علامہ جزریؒ نے بہت عالی اور معتبر قرار دیا ہے تاہم بعض لوگوں نے اس حدیث کے راوی کو ضعیف بھی قرار دیا ہے۔ علامہ جزری کے خیال میں ابو داؤد اور ترمذی دونوں نے اسے روایت کیا ہے اور یہ حدیث حسن ہے لیکن علامہ جزری نے امام حفص کی قرأت کی تغلیط بھی نہیں کی بلکہ یہ فرمایا کہ دونوں قرأتیں صحیح ہیں اور میں نے دونوں وجہیں پڑھی ہیں اور دونوں کو اختیار کرتا ہوں علامہ دانیؒ نے دونوں قرأتوں کو اس لئے قبول کیا کہ امام عاصم کوفی کی قرأت کی مطابقت ہو جائے اور امام حفص کے اختیار کی بھی متابعت ہو جائے۔ فتحہ عبید، ابو ربیع الزھرانی الخیل اور عمرو سے روایت ہے اور ضمہ ہبیرہ، تو اس زرعان اور عمرو سے اختیار آیا ہے۔[۱]

پیشہ:

امام حفصؒ اپنے گوناگوں کمالات و امتیازات کے باوجود ایک تاجر تھے امام اعظم ابو حنیفہؒ کے ساتھ کپڑے کی تجارت کرتے تھے[۲]۔ اسی مناسبت سے انہیں البزاز کہا جاتا تھا اور یہی ان کا ذریعہ معاش بھی تھا۔

وفات! امام حفص بن سلیمان نے ۱۸۰ھ میں کوفہ میں بعمر ۹۰ سال وفات[۳] پائی۔

جزی اللہ بالخیرات عنا ائمۃ　　لنا نقلوا القرآن عذباً وسلسلاً

۱۔ النشر ج ۲ ص ۳۴۵ بحوالہ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند مارچ ۱۹۸۳ء ص ۳۳، ۳۴۔

۲۔ دائرہ معارف اسلامیہ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) ج ۸ ص ۴۲۹۔

۳۔ تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۴۰۱ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۲۶۲ و مرأۃ الجنان ج ۱ ص ۳۷۸۔

قسط (۵)

عہدِ مغلیہ یورپی سیاحوں کی نظر میں

۱۶۱۶ تا ۱۶۱۹ء

پروفیسر محمد عمر، شعبہ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کھانا اور برتن:

مچھلی یا پرند کا گوشت کھانے میں وہ اعتدال پسند تھے۔ پرند یا مرغی کا گوشت وہ کبھی کچا نہیں کھاتے تھے۔ وہ گوشت کو پانی میں اُبال لیتے یا تنور میں بھون لیتے تھے۔ وہ گوشت کو روسٹ (بریاں) کرنا نہیں جانتے تھے۔ گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے اس میں پیاز، تیج پتے اور ادرک وغیرہ گھی میں ملا کر دم پخت (اسٹو) بناتے تھے۔ اسے ایک پلیٹ میں رکھ لیتے تھے۔ یہ سالن دوسرے سالنوں سے بہت بہتر ہوتا تھا۔ ان کا عام پسند کھانا "کھڑی جہارت" سے اُبلے ہوئے چاول تھے (یعنی بریانی) وہ چاول "پھولے اور نرم ہوتے تھے" اُبلتے وقت وہ چاول ٹوٹتے نہیں تھے۔ اس میں وہ تھوڑی سی ہری ادرک، کالی مرچ اور گھی ملا دیتے تھے۔ بعض مرتبہ وہ گوشت اور پرند کے گوشت کے ٹکڑوں کو اُبال لیتے اور اسے "پلاؤ" کہتے تھے۔

رمضان (یا محرم) کے روزے:

رمضان کا آخری دن ماتم کے ایک دن کی صورت میں منایا جاتا تھا اور ادنیٰ طبقے کے لوگ بہت آہ و زاری کرتے تھے لیکن جوں ہی وہ دن گذر جاتا، وہ بہت سے چراغ روشن کرتے اور دوسری قسم کی روشنیاں کرتے۔ ان چراغوں کو جلا کر وہ اپنے گھروں کے اوپر رکھ دیتے۔

عورتوں میں پردہ: ان میں یہ ایک عام رسم پائی جاتی تھی کہ ان کی مستورات اپنے شوہر دل

بھائیوں اور والدوں کے علاوہ دوسرے کا منہ نہیں دیکھتی تھیں۔ شادی شدہ عورتیں جو زنا کرتیں اور کنواری لڑکیاں بدچلنی کی مرتکب ہوتیں تو ان کے بھائی انہیں ایسی سخت سزائیں دیتے کہ بعض مرتبہ انھیں جان سے مار ڈالتے تھے۔ "اعلیٰ طبقے" کے لوگوں کی عورتوں کی خدمت کے لئے خواجہ سراؤں کو رکھا جاتا تھا۔

شادی کے رسوم!

(مسلمانوں میں) جو لوگ تارک الدنیا ہوتے تھے وہ شادی نہیں کرتے تھے۔ ملا لوگ صرف ایک بیوی پر اکتفا کرتے تھے۔ شام کے وقت شادی کے رسوم ادا ہونے کے بعد وہ خوشیاں منانا شروع کرتے تھے۔

برات! "غریب ہو یا دولتمند" دولہا گھوڑے پر سوار ہو کر جاتا تھا۔ اس کے ساتھ جلوس میں اس کے اعزا، واقربا اور دوست واحباب براتی ہوتے تھے۔ آگے آگے بہت سی روشنیاں بگل باجے اور ڈھول تاشے ہوتے تھے۔ دلہن، دولہا کے پیچھے ایک پالکی میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہوتی تھی۔ پالکی پر پردے پڑے ہوتے تھے۔ برات کا جلوس شہر یا قصبے کے زیادہ اہم علاقوں سے گذرتا ہوا جاتا تھا۔ اس کے بعد دلہن کے گھر واپس لوٹ آتے تھے۔ وہاں ان کی خاطر تواضع ہوتی اور بعد میں رخصتی ہو جاتی۔

موت اور ماتم:

دفن کرنے سے پہلے وہ میت کو غسل دیتے تھے۔ وہ اپنی مسجدوں میں کسی کو دفن نہیں کرتے تھے بلکہ کسی کھلے میدان میں۔

اپنے عزیزوں کے انتقال پر وہ کئی دنوں تک سوگ مناتے تھے۔ بہت سی عورتوں نے مہینے کے دن ایسے مقرر کر رکھے تھے جن دنوں میں وہ اپنے عزیزوں کا ماتم کرتی تھیں اور یہ رسم زندگی بھر ادا کرتی رہتی تھیں۔ محبت بھرے آنسوؤں کی کثرت سے وہ اپنے متوفی شوہروں

کی قبروں کو "تر" کر دیتی تھیں۔" جب وہ ماتم کرتیں تو وہ اپنے متوفی شوہروں سے ایسے سوال کرتیں کہ تم کیوں مر گئے۔"؟" جبکہ ایسی محبت کرنے والی ان کی بیویاں، دوست و احباب تھے اور آسائش کی دوسری چیزیں مہیا تھیں۔"

مسلمان درویش :

بہت سے لوگ جو تارک الدنیا ہو گئے تھے انھیں " درویش " کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ " وہ لوگ طرح طرح کی "ریاضت شاقہ" پر عمل کرتے تھے"، ان میں سے بعض تن تنہا پہاڑیوں کی چوٹیوں پر اپنی ساری زندگی ریاضتوں میں گذار دیتے تھے اور اس جگہ سے حرکت نہیں کرتے تھے اور "متواتر" "اللہ اکبر" کی ضربیں لگایا کرتے تھے۔ دنیا سے قطع تعلقی کے بعد وہ بال نہیں بنواتے تھے۔" چڑیوں کے پنجوں کی طرح ان کے ناخن بڑھ جاتے تھے"۔ کھانا فراہم کرنے کے لئے وہ لوگ اپنے حجروں سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ اُن کے عقیدتمند انھیں کھانا پہنچاتے تھے۔ ان کے کپڑوں کے لئے لوگ گدڑیاں بھیج دیا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے کپڑے وہ قبول نہیں کرتے تھے۔ جو کھانے انھیں بھیجے جاتے تھے وہ معمولی کھانے ہوتے تھے ورنہ اسے لینے سے انکار کر دیتے تھے۔ ان میں بعض بہت زمانے تک روزہ رکھتے تھے۔ اور جب تک وہ بہت کمزور نہیں ہو جاتے تھے وہ کھانا نہیں کھاتے تھے۔ وہ ننگے جا کر شہروں کے اطراف میں مقیم ہو جاتے۔ لوگ ان کے پاس آ کر جمع ہو جاتے تھے۔ وہ دن کو آگ جلاتے، اور رات کو راکھ پر سوتے۔ اس راکھ کو وہ اپنے جسموں میں مل لیتے۔ بعض مرتبہ وہ نشہ آور چیزیں کھاتے۔ دوسرے ایسے لوگ تھے جو " منڈی" کہلاتے تھے۔ وہ اپنا گوشت چاقوؤں اور جراحی کے آلوں سے کاٹتے تھے۔ بعض اپنے پیروں میں لوہے کی گندی بیڑیاں ڈال لیتے تھے۔ وہ مشکل سے ہل سکتے تھے۔ وہ اپنے جسم پر نیلا فرغل پہنتے تھے۔

جتنی مرتبہ ممکن ہو سکتا تھا مسلمان اپنے ہر دلعزیز صوفی کے مزار پر زیارت کرنے جایا کرتے تھے۔

صوفیاء کے مقبرے :

ان مقبروں کو بڑے تکلف سے سجایا جاتا تھا جہاں متواتر چراغ جلتے رہتے تھے۔

ان مزاروں پر "مجاور" رہتے تھے جن کو روشنی جلانے کے لئے وظائف دئے جاتے تھے فیض حاصل کرنے کے لئے بہت سے لوگ روزانہ ان پر حاضری دیتے تھے۔

(ب) ہندو لوگ

عادات و اطوار:

اس عقیدہ کی بنا پر "کہ وہ روٹی" ذائقہ دار اور اس سے بیحد عزت ہوتی ہے جو پسینہ بہاکر حاصل کی جاتی ہے"۔ ہندو لوگ بہت محنتی اور جفاکش ہوتے تھے۔ ان میں سے بیشتر لوگ دست کاری اور کاریگری کا پیشہ اختیار کرتے تھے۔ اپنے کاروبار کو کامیاب بنانے کے لئے وہ لوگ وقت اور موقع سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ وہ لوگ اپنے "طرح طرح کے ذرائع معاش" میں بہت محنت کرتے تھے اور اپنے وعدوں کو پورا کرنے اور معاملات میں ٹھیک ٹھاک تھے"۔ اپنے پیشے میں وہ بہت دیانتدار ثابت ہوتے تھے۔ اگر کوئی شخص انھیں کسی چیز کی مناسب قیمت دیتا تو وہ اسے قبول کرلیتے تھے۔ لیکن اگر کوئی خریدار اس کی چیز کی معیاری قیمت سے کم قیمت لگاتا تو وہ اس سے یہ کہتے "کیا تم مجھے عیسائی سمجھتے ہو کہ میں تمہیں دھوکا دینے کی کوشش کروں گا؟"۔

وہ لوگ زراعت کرتے تھے، جانور پالتے تھے اور حیرت انگیز صنعتی کام کرتے تھے وہ لوگ مسلمانوں سے مختلف لباس پہنتے تھے۔ لیکن "اچھا لباس پہنتے تھے"۔

کھانے:

ان میں سے بیشتر لوگ بالخصوص "بنیے" کسی جانور کا گوشت نہیں کھاتے تھے۔ وہ لوگ جڑی بوٹیاں، روٹی، دودھ، گھی، مکھن اور مٹھائیاں وغیرہ "کھاکر زندگی گذارتے تھے۔ دوسرے لوگ مچھلیاں کھاتے تھے لیکن دوسری چیزیں نہیں کھاتے تھے۔ راجپوت لوگ سور کا گوست کھاتے تھے تمام ہندو گائے کے گوشت سے پرہیز کرتے تھے۔

عورتیں:

ان کی عورتیں انگوٹھوں میں چھلے پہنا کرتی تھیں اور ننگے پیر رہتی تھیں۔ اپنی کلائیوں اور

ٹخنوں کو وہ خالص پیتل اور دوسرے دھاتوں کے بنے کڑوں "سے آراستہ کرتی تھیں۔ حسب خواہش وہ ان زیورات کو پہنتیں اور اتار کر رکھ دیتی تھیں۔ جوانی کے زمانے ہی میں ان کے کان بالعموم چھید دیئے جاتے تھے۔ بالیوں کے وزن کی وجہ سے کانوں کے سوراخ چوڑے ہو جاتے تھے۔ عورتوں کو باہر آنے جانے کی آزادی حاصل تھی

شادیاں ؛

وہ لوگ بچپن میں ہی اپنے بچوں کی شادیاں کر دیتے تھے جب ان کی عمر چھ یا سات سال کی ہوتی تھی۔ والدین بَر کا انتخاب کرتے تھے۔ جب دولہا دولہن کی عمر ۱۳، ۱۴ یا ۱۵ سال کی ہو جاتی تو وہ ہم بستری کرتے تھے۔ وہ لوگ "اپنی ذات" قبیلے، فرقے اور ہم پیشہ لوگوں میں شادیاں کرتے تھے۔ ان میں ایک ہی بیوی رکھنے کا چلن تھا۔

"براتیوں اور باجے گاجے کے ساتھ" وہ مسلمانوں کی طرح شادی کے رسوم ادا کرتے تھے۔ دولہا دولہن ایک ہی گھوڑے پر علانیہ سوار ہوتے تھے۔ وہ جوڑا اتنا چھوٹا ہوتا تھا کہ لوگ انھیں پکڑے رہتے تھے کہ کہیں وہ زمین پر نہ گر پڑیں۔ ان کے جسم پھولوں سے ڈھکے ہوتے تھے۔

موت اور بیوائیں ؛

وہ لوگ اپنے مردوں کو کسی ندی کے کنارے پر جلاتے اور ساری راکھ اس میں پھینک دیتے تھے۔ وہ بیوائیں جو اپنے شوہروں کے مرنے کے بعد زندہ رہتیں، وہ دوبارہ شادی نہ کرتی تھیں۔ وہ اپنے سروں کے بال" منڈوا لیتیں اور جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتی تھیں۔ نہ ہی دوسرے ان کا خیال رکھتے اور نہ ہی وہ خود اپنا خیال رکھتیں۔

ستی ؛

بعض بیوائیں آگ میں بھسم ہو جاتیں۔ زور جبر سے نہیں بلکہ وہ اپنی خوشی سے ایسا کرتی تھیں جو ستی ہونے جاتیں وہ پس و پیش نہ کرتی تھیں۔ وہ گانا گاتے ہوئے ستی ہونے جاتی اور کوئی نہ کوئی نشہ آور چیز کھا لیتی جس سے اس کا سر چکرانے لگتا"۔ چتا میں جا کر وہ لکڑیوں کے ڈھیر کے وسط میں بیٹھ جاتی جو دو ایک فٹ گہرا گڈھا کھود کر بنایا جاتا تھا۔ اس کے اعزا و اقربا اور والدین خوشی خوشی شمشان تک اس کے ساتھ جاتے تھے۔ جب چتا میں آگ لگا دی جاتی تو وہ لوگ اسوقت

تک زور زور سے چلاتے رہتے جب تک اس میں کسی قسم کی حرکت باقی رہتی۔ جب چتا جل چکتی اور راکھ ٹھنڈی ہو جاتی تو اس کے قریبی رشتہ دار اس میں سے کچھ جمع کر لیتے اور "پسندیدہ تبرک کے طور پر" اسے محفوظ کر لیتے۔ اس کا بقیہ حصہ ندی میں پھینک دیا جاتا۔ اس رسم کو دیکھ کر ٹیری اس قدر متاثر ہوا تھا کہ اس نے رسم ستی کی تعریف میں ایک نظم لکھی تھی۔

"وہ اپنے مردہ شوہر کو اپنی گود میں لے لیتی ہے۔ وہ جلدی بھسم ہونے کے لئے اپنے کو آگ کے سپرد کر دیتی ہے۔ وہ زندہ نہیں رہ سکتی کیونکہ اس کا شوہر مر گیا جس کے باعث اسے عزت حاصل تھی۔ اس کے اعزا وہاں آتے، انہیں دیکھتے جیسے کہ یہ ایک شہادت کا واقعہ ہو۔ انھیں اطمینان ہوتا جیسے کہ وہ سہاگ رات کا منظر دیکھ رہے ہوں۔

مذہبی عقیدہ اور پروہت:

برہمن ان کے پجاری اور پروہت ہوتے تھے۔ ہندوؤں کے مندر چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے۔ وہ ہرے درختوں کے قریب واقع ہوتے تھے۔ ان میں "دیو پیکر" مورتیاں رکھی ہوتی تھیں۔ پوجا پاٹ کرنے سے پہلے عورت اور مرد اشنان کرتے تھے۔ کھانا کھانے سے پہلے بھی وہ نہایا کرتے تھے۔ ٹیری نے لکھا ہے کہ وہ پتروں میں کھانا کھاتے تھے۔ کھانا کھا کر وہ انھیں وہیں چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ وہ گنگا ندی کو کسی حد تک دیوتا کا ہم مرتبہ سمجھتے تھے۔ ندی میں نہانے کے بعد" واپس جانے سے پہلے" وہ اس میں چاندی سونے کے سکے ڈال لیتے تھے۔ گائیوں کا وہ لوگ اس قدر احترام کرتے تھے کہ زبردستی دوسرے طریقے سے روپیہ دینے کے بجائے وہ اُسے چھڑانے کے لئے مغلوں کو بہت بڑی بڑی رقمیں دیتے تھے۔ انکی عبادت اور آرام کے لئے جمعرات کا دن مقرر تھا۔

(س) پارسی لوگ

حلیہ اور پیشے: اس ملک کے دوسرے لوگوں کی طرح ان کا لباس ہوتا تھا۔ وہ اپنی داڑھیاں نہیں منڈواتے تھے۔ ہر قسم کی کھیتی باڑی، جڑی بوٹیاں پیدا کرنا اور فروخت کرنا انگور اور تاڑی کے درختوں کا لگانا اور دوسرے پھلدار درخت لگانا ان کے پیشے میں

شامل تھا وہ لوگ بہت محنتی تھے۔" خود محنت کرکے کمانے میں" ان کا عقیدہ تھا۔

کھانے؛ وہ لوگ گوشت کھاتے اور شراب پیتے ہندوؤں اور مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے وہ گائے اور سور کے گوشت سے پرہیز کرتے تھے جن کے ساتھ وہ اکثر وبیشتر کھانا کھاتے تھے۔ ہر شخص علیحدہ اپنے پیالے میں شراب پیتا تھا۔

شادی بیاہ؛

ان کی صرف ایک بیوی ہوتی تھی۔ ان کی عورتیں پردے میں نہیں رہتی تھیں اپنے پادریوں کے مشورہ کے بغیر شادیاں نہیں کرتے تھے۔ شادی کی رسم ادا ہونے کے موقع پر دولہا دولہن ایک دوسرے سے فاصلے پر کھڑے ہوتے تھے۔ اس موقع پر ایک عورت کی طرف سے اور دوسرا لڑکے کی طرف سے دو پادری وہاں موجود ہوتے تھے۔ ان میں سے پہلا عورت سے معلوم کرتا تھا کہ وہ آیا اس مرد سے شادی کرنے کو تیار تھی؟ اور دوسرا اس مرد سے معلوم کرتا کہ آیا وہ اس عورت کو اپنی بیوی کی حیثیت سے قبول کرنے کو تیار تھا؟ چونکہ وہ دونوں آپس میں رضامند ہوتے اس لئے پادری ان دونوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیتے یہ دعا کرتے ہوئے وہ خوشی خوشی آپس میں ساتھ رہیں، ان دونوں کے آپس میں ہاتھ ملوا دیتے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ وہ دونوں چاولوں کی طرح پھلے پھولیں، پادری ان کے سروں کے اوپر چاول بکھیرتے تھے۔ رسوم کے ادا ہوتے ہوتے شام ہو جاتی۔ اس جوڑے کو ساتھ ساتھ چھوڑ کر سب لوگ چلے جاتے۔

ایک بچہ کی ولادت؛

جب کسی بچے کی ولادت ہوتی تو وہ لوگ فوراً پادریوں" دارو" کو بلواتے جب وہ آتا تو اسے بچے کی ولادت کا ٹھیک ٹھیک وقت بتایا جاتا۔ وہ زائچہ تیار کرتا اور "پیشین گوئی" کے طور پر کچھ الفاظ کہتا۔ اس کے بعد وہ اس کے نام کے بارے میں والدین سے مشورہ کرتا جس نام پر اتفاق رائے ہو جاتا تو نومولود کی ماں اسی مجلس میں اس نام کا اعلان کر دیتی۔

- (جاری)

مولانا ابوالکلام مرحوم کی ترجمان القرآن پڑھنے والوں کو یاد ہوگا کہ سورۃ الکہف میں جہاں ذوالقرنین کا ذکر ہے، مولانا نے اس کا مصداق (فارس یڈیا) کے تاریخی شہنشاہ خورس یا کسرائے اول کو قرار دیا تھا اور اس کے بسط و تشریح میں ایک فوٹو بھی ایک سنگین مجسمہ کا لے کر سرشاہ مذکور کا لگا دیا تھا۔ قدیم طرز کے علماء تفسیر قرآن میں انسانی فوٹو (خواہ وہ جس مقصد سے بھی ہو) دیکھ کر نہایت برہم ہوئے۔ اور پنجاب پنڈی بہاءالدین کے ایک صاحب نے حضرت مولانا تھانویؒ سے اس کے متعلق استفتاء بھی کر دیا۔ مولانا نے چار دوسرے علماء کے تائیدی دستخطوں کے ساتھ۔ اس کا جواب بہت مفصل کئی صفحوں میں دیا۔ اور حدیث و فقہ کی روشنی میں اس عمل کو سرتاسر ناجائز بتایا۔ اور پھر اس فتوے کو ایک عنوان دے کر "تقدیس القرآن منبر عن تدنیس التصاویر" کے نام سے ایک مستقل رسالہ کی صورت میں شائع کر دیا۔ یہ ذکر ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء کا ہے ——— فتوے شائع ہونے کے بعد پھر کیا ہوا؟ یہی ہوا ہوگا کہ ادھر سے بھی جواب نکلا ہوگا۔ تائید کرنے والے فریقین کے پیدا ہو گئے ہوں گے، اور ایک مستقل ہنگامہ مناظرہ کا قائم ہو گیا ہوگا۔ اہلِ قلم میں اپنی ہار ماننا کون ہے اور کون فریق ایسا ہے۔ جو کچھ نہ کچھ دلائل اپنی موافقت میں نہ رکھتا ہو، پھر مولانا ابوالکلامؒ جیسے زبردست و جید صاحبِ قلم کے لئے جواب دشوار ہی کیا تھا۔

لیکن نہیں یہ کچھ بھی نہ ہوا۔ مولانا ابوالکلامؒ نے یہی نہیں کیا، کہ آئندہ ایڈیشن سے تصویر کے نکال دینے کا اقرار کیا ہو، بلکہ ناشر کو لکھ دیا کہ خود اسی ایڈیشن کے باقی ماندہ نسخوں سے وہ تصویر نکال دی

جائے! اور اس طرح ملت کو ایک فتنہ میں پڑنے اور مناقشہ و مجادلہ کی گرم بازاری سے بال بال بچا لیا۔ اس سالمت، شرافتِ نفس، خود فنائی کی مثالیں، اس بیسویں صدی عیسوی میں اگر معدوم نہیں تو کالعدم تو ضرور رہی ہیں۔ حضرت تھانوی اس سے خود بھی متاثر کیسے نہ ہوتے۔ اور مستفتین کو جو خط لکھا اس میں کس مسرت کے ساتھ یہ چھپے ہوئے الفاظ موجود ہیں:

"ماشاء اللہ تعالیٰ یہ آپ کے خلوص کا اثر اور ان کے سلامت قلب کی دلیل ہے، دونوں کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعائے مزید کرتا ہوں۔"

رفع شر کی یہ مثال امت کے لئے سبق آموز ہے اور اس قابل ضرور ہے کہ مولانا ابوالکلامؒ کی ہر سوانح عمری میں اسے عزت کے ساتھ جگہ دی جائے۔

(مولانا عبدالماجد دریابادی، صدق۔ ۳۱ مارچ ۱۹۶۱ء)

سرپرست اعلیٰ

عالیجناب حکیم عبدالحمید چانسلر جامعہ ہمدرد

نگران اعلیٰ

حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

مدیر اعزازی

قاضی اطہر مبارکپوری

نومبر، دسمبر سنہ ۹۴ء

برہان

جلد ۱۱۴ شمارہ ۵-۶

اس شمارے میں

دفتر رابطہ

Nadwatul-Musannefeen

4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006

بابری مسجد کے سلسلے میں اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ خود اس کی ایک تاریخ بن گئی ہے دنیا میں روزانہ مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ان کا حل بھی نکل جاتا ہے۔ یہاں تک کہ عرب اسرائیل کے تنازعات بھی ختم ہونے کے قریب ہیں۔ جارڈن اور اسرائیل کے مابین بھی تنازعہ ختم ہو چکا ہے ــــــ مگر بابری مسجد کا مسئلہ جوں کا توں باقی ہے ۱۹۴۹ء میں جب مسجد میں یکایک زور و زبردستی جبر و ستم کے ساتھ نماز کے فوراً بعد مورتیاں رکھدی گئی تھیں اور مسلمانوں کو آئندہ نماز پڑھنے سے حکماً روک دیا گیا تھا اس وقت سے اب تک اس مسئلہ میں کتنے ہی اتار چڑھاؤ پیدا ہوئے ہیں اور ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو تو حد ہی ہو گئی جب انصاف، قانون، انسانیت رواداری مروت سب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تمام دنیا کے اخباری نمائندوں ٹی وی کیمرہ مینوں کے سامنے اور حفاظت پر مامور پولیس فورس کی موجودگی میں بابری مسجد ہی کو مسمار کر دیا گیا توڑ دیا گیا ڈھا دیا گیا ــــــ شاید ہی دنیا کا کوئی مبصر، مفکر، صحافی، مورخ، قانون داں، سیاستداں ایسا بچا ہو جس نے اس موضوع پر نہ لکھا ہو۔ مگر وہ سب بے سود، نقار خانہ میں طوطی کی صدا بن کر رہ گیا۔ ظلم و جبر نے اپنا کام کر دکھایا مظلوم بے بسی و بیچارگی کے عالم میں ہائے ہائے کرتا رہ گیا۔ جب کسی کا ذہن یہ بن چکا ہو کہ کوئی دلیل کوئی قانون اپنی ہٹ، ضد، لاٹھی، طاقت کے آگے نہیں چلنے دینا تو پھر مظلوم و بے کس کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ ہی نہیں ہے کہ صبر کرے اور بارگاہ عالی میں اس ظلم و جبر کے تدارک کے لئے روئے گڑ گڑائے اور دعا کرے ــــــ یہ ہی سوچ کر ہم نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب اس موضوع پر قطعاً نہیں لکھیں گے۔ مگر اکتوبر کے آخری عشرہ میں سپریم کورٹ نے

بابری مسجد رام جنم بھومی کے تنازعہ و مقدمہ میں حکومت کی طلب کردہ رائے کہ بابری مسجد جس جگہ پر واقع ہے وہاں پہلے کسی مندر ہونے کا ثبوت ہے یا نہیں پر اپنا فیصلہ دیا ہے کہ سپریم کورٹ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ قانون کے دائرے سے باہر آثار قدیمہ کے ماہرین کا کام بھی انجام دینے لگے۔ اور حکومت ہند کے اس فیصلہ کو بھی سپریم کورٹ نے ناجائز قرار دیا ہے جس کی رو سے، بابری مسجد سے متعلق تمام مقدمات جو مختلف عدالتوں اور الہ آباد ہائی کورٹ میں زیر سماعت تھے۔ اب وہ سارے مقدمات انہی عدالتوں میں زیر سماعت ہوں گے۔ سپریم کورٹ نے اپنے وقار کو قائم رکھا ہے اور حکومت کے ہاتھوں میں کھلونا بننے سے خود کو بچا کر اس نے تمام ہندوستانیوں کے دل میں عزت و احترام تو پایا ہی ہے تمام دنیا میں بھی ہندوستان میں قانون کی سربلندی کی شہرت اور نیک نامی پیدا کی ہے۔

کہاوت مشہور ہے کہ کھسیانی بلّی کھمبا نوچے کے مصداق سپریم کورٹ کے مذکورہ فیصلے کو وہ فرقہ پرست عناصر بھی سراہ رہے ہیں جنھوں نے زور و جبر اور طاقت کے نشہ میں چور ہو کر بابری مسجد کو ڈھا دیا تھا اور جو قانون کی حکمرانی سے بھی اور ہندی دھرم کی حکمرانی کو بھارت کے سیکولر آئین پر ٹھونس دینا چاہتے تھے۔ جبکہ سپریم کورٹ کے فیصلہ سے تو یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ بابری مسجد اور اس سے ملحقہ زمین وغیرہ کے مقدمات حسب سابق بدستور عدالتوں میں زیر سماعت ہوں اور قانونی فیصلوں کو دونوں فریق تسلیم کریں۔ مگر ان فرقہ پرست عناصر نے جس ڈھٹائی کے ساتھ مسجد کو توڑا اس کے بعد ہندوستانی عوام سے ان کو شاباشی کی جو امید تھی وہ جب پوری نہ ہوئی اور ہندوستانی عوام کی اکثریت نے اس کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا تو انہوں نے عوام الناس پر یہ تاثر دینے کے لئے کہ ہم نے قانون کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی ہے کھلم کھلا سپریم کورٹ کے فیصلے کو اپنے حق میں کہنا شروع کر دیا۔ جبکہ واقعہ یہ ہے کہ سپریم کورٹ کے حقیقت پر مبنی فیصلہ نے ان فرقہ پرست عناصر کے منصوبوں کو کاری ہی لگائی ہے۔

اتر پردیش کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ جناب کلیان سنگھ کو سپریم کورٹ نے ان کے

حلفیہ بیان کہ بابری مسجد کی ہر حالت میں حفاظت کی جائے گی پر اپنے فیصلہ میں مجرم قرار دیتے ہوئے انھیں ایک دن کی سزا اور دو ہزار روپے جرمانہ کی سزا دیکر قانون کی حکمرانی کا سر بلند کیا ہے۔ مگر یہاں بھی یہ فرقہ پرست عناصر عوام الناس میں اسکو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرنے کے ہتھکنڈے اپنا رہے ہیں۔ لیکن سپریم کورٹ کے چیف جسٹس جناب ایم این وینکٹ چلیانے اس فیصلہ کے معاً بعد اپنے عہدہ سے ریٹائرڈ ہوتے ہوئے ایک اخباری انٹرویو میں یہ بات کہکر کہ" توہین عدالت کے معاملے میں اتر پردیش کے سابق وزیراعلیٰ کلیان سنگھ کو سزا دینے سے ان سب ہی لوگوں کو سبق ملے گا جو عدالت کے احکامات کی توہین کی کوشش میں لگے رہتے ہیں"

فرقہ پرست عناصر کے سارے ارمانوں کو خاک میں ملادیا ہے ــــ مسٹر وینکٹ چلیا نے مزید کہا کہ کلیان سنگھ کو سزا سناکر سپریم کورٹ نے قانون کی بالادستی کو قائم کیا ہے اور اس سے ان سبھی لوگوں کو سبق ملے گا جو خود کو قانون سے اوپر سمجھتے ہیں ــــ قارئین کو یاد ہوگا کہ فرقہ پرست عناصر ہمیشہ ہی یہ راگ الاپتے رہے ہیں کہ بھگوان رام کے معاملے میں ہمیں کسی قانون کی پرواہ نہیں ہے" شری وینکٹ چلیانے کہا کہ انھیں اس میں ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ کلیان سنگھ توہین عدالت کے مجرم ہیں" مسٹر چلیّانے ایودھیا مسئلہ پر راشٹرپتی کے ذریعہ مانگی گئی صلاح کے معاملے میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کو بے حد معقول بتاتے ہوئے کہا کہ اس فیصلہ سے ہندو اور مسلمان دونوں کے مفاد کی حفاظت ہوئی ہے جنوری ۱۹۹۳ء سے جاری رام للہ کی محدود پوجا کورٹ نے نہ روکنے کا فیصلہ اس لئے کیا کیونکہ اس کا مطلب اکثریتی ہندوؤں کے پوجا کا حق چھیننا ہوتا جبکہ انکا متنازعہ ڈھانچہ توڑنے میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ انہوں نے کہا کہ اگر کورٹ ۱۹۸۶ء کی طرح کھلی پوجا کی چھوٹ دیدیتا تو یہ ہندو حامی فیصلہ ہوتا اور یہ مسلمانوں کی دُکھتی رگ پر نمک چھڑکنے کی طرح ہوتا ــــ انہوں نے مزید کہا کہ اگر ایودھیا ایکٹ کو رد کر دیا جاتا تو ۱۹۸۶ء کے فیصلہ کے مطابق وہاں مکمل پوجا کی حالت خود بخود بحال ہوجاتی اور اگر ایسا ہوتا تو مسلم فرقہ میں یہ غلط بات پیدا ہوجاتی کہ ہندو کٹر پنتھیوں کی زور زبردستی کی سرپرستی کی گئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایودھیا ایکٹ کو رد کرنے سے نچلی عدالت کے ذریعہ زمین کا مالکانہ

حق طے کرنے کے متعلق فیصلہ ہونے تک متنازعہ جگہ کی حفاظت و بندوبست سرکار کے اپنے ہاتھ میں رکھنے کا مقصد بھی فوت ہو جاتا۔"

بہر حال ایک بار پھر فرقہ پرستوں کے منہ پر قانون کا زوردار تھپڑ پڑا ہے۔ اب دیکھنے والی بات یہ ہے کہ آئندہ یہ فرقہ پرست عناصر اس مار سے راہِ راست پر آتے ہیں یا نہیں؟۔

سپریم کورٹ کے فیصلہ کو ہم تہہ دل سے سراہتے ہیں اس فیصلہ نے بھارت کے سیکولر آئین کی لاج رکھ لی ہے اور دنیا کی نظروں میں بھارت کے آئین کی عزت و توقیر میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔

برہان کا زیر نظر شمارہ نومبر و دسمبر ۱۹۹۴ء کا مشترکہ شائع کیا جارہا ہے۔ سال ۹۴ء ختم ہوا۔ اور ۱۹۹۵ء کا سال شروع ہو جائے گا۔ زندہ قومیں سال کے اختتام پر اپنا اور اپنے ملک کے حالات کا محاسبہ کیا کرتی ہیں کہ ہم نے کہاں کہاں ترقی و کامیابی حاصل کی ہے اور کہاں کہاں ہم نے ٹھوکر کھائی۔ ۱۹۹۴ء میں مہنگائی جوں کی توں رہی ضروریات زندگی مہنگی ہی رہیں۔ دراصل ہمیں اپنے طور طریقے اور رویے بدلنے ہوں گے۔ جہاں عوام الناس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ امن و امان اور بھائی چارگی کی فضا کو ہر حال میں قائم رکھیں۔ وہاں حکومت کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام الناس میں اعتماد پیدا کرے یہ بات ہر حال میں پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ عوام سے ہی حکومت ہے حکومت سے عوام نہیں۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ عوام کی ہر ضرورت سے باخبر رہے عوام کی ہر خواہش کو اسے بہر حال مقدم رکھنا ہوگا۔ ایک مقبول حکومت ملک و عوام کی فلاح و بہتری کے لئے بہت ضروری ہے۔

ہماری دعا ہے کہ آنے والا سال ۱۹۹۵ء ہندوستان کے لئے اور ہندوستان کے تمام عوام ہندو مسلمان سکھ عیسائی پارسی سب کے لئے باعثِ خیر و برکت اور باعث امن و امان ہو۔ اور اس کے ساتھ ہماری یہ بھی دعا ہے کہ ۱۹۹۵ء تمام دنیا میں امن کا پیغام لائے۔ دنیا میں آپسی اختلافات سب کے ساتھ ختم ہوں خوشیوں و مسرتوں سے ہر انسان کی زندگی مالا مال ہو جائے۔ دنیا میں لڑائی کی باتیں ختم ہو جائیں۔ سب کی اقتصادی حالت درست ہو اور بھائی چارگی ایک دوسرے کے دکھ درد میں سب شامل ہوں ایسی فضا اور ماحول ۱۹۹۵ء میں ہر طرف دیکھنے کو ملے یہ ہماری خواہش آرزو اور دلی

نام: ابوالکلام محی الدین احمد — تخلص: آزاد
پیدائش: ۱۸۸۸ء — وفات: ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء

نعت

موزوں کلام میں جو ثنائے نبیؐ ہوئی
تو ابتدا سے طبع رواں منتہی ہوئی

ہر بیت میں جو وصفِ پیغمبر رقم کیے
کاشانہ [illegible] میں بڑی روشنی ہوئی

ظلمت رہی نہ [illegible] حُسن رسولؐ سے
بیکار [illegible] فلک شبِ مہتاب بھی ہوئی

تاریک شب میں آپؐ نے رکھا جہاں قدم
مہتاب نقشِ پا سے وہاں روشنی ہوئی

سالک ہے جو کہ جادۂ عشقِ رسولؐ کا
جنت کی راہ اس کے لئے ہے کھلی ہوئی

آزاد اور فکر جگہ پائے گی کہاں
اُلفت ہے دل میں شاہؐ زمن کی بھری ہوئی

حضرت شیخ محمد جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی علم شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب بیس واسطوں سے خلیفہ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے جد امجد خواجہ عبدالرحمٰن گازرونی جن کا شمار پانچویں صدی ہجری کے ممتاز صوفیاء میں ہوتا ہے محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آئے تھے اور پانی پت میں مقیم ہو گئے تھے۔

آپ کا اصلی نام محمد تھا پیر روشن ضمیر نے جلال الدین خطاب دیا اہل طریقت میں کبیر الاولیا اور عوام میں مخدوم صاحب کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کے والد خواجہ محمود کا انتقال آپ کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ اس لئے آپ کی پرورش چچا کے زیر سایہ ہوئی۔ آپ کی تعلیم کا تذکرہ کہیں نہیں ملتا لیکن بچپن سے ہی آپ کے دل میں عشق الٰہی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ الہدیہ چشتی نے آپ کے بچپن کے حالات ان الفاظ میں بیان کئے ہیں۔

"از ایام طفلی محبت حق سبحانہ و تعالیٰ گریبان گیر وقت او بود و اکثر بصحرا ماندی و مشغول بذکر حق جل و علی بودی"۔ [1]

حالات کو الف سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آپ کی تربیت بچپن سے ہی بو علی شاہ قلندر کے زیر سایہ ہوئی۔ اور آپ کی سیرت اور اخلاق و کردار کی تعمیر میں حضرت قلندر صاحب کے فیض صحبت اور خصوصی توجہ کا اثر ہے جس کو مصنف سیر الاقطاب نے یوں بیان کیا ہے۔

۱۔ سیر الاقطاب ص۔ ۱۹۸۔

"حضرت قطب ابدال شیخ شرف الدین بو علی قلندر قدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز آں حضرت را از ہنگام طفولیت بغایت دوست می داشت و منظور نظر ایشاں بود چنانکہ ہر روز برای دیدن ایشان می رفت و حضرت را می دید و اگر آں قطب ربانی جائی میرفت ہمان جا تشریف می برد" [۱]

حضرت کبیر الاولیاء صاحب کا ذریعہ معاش کاشتکاری تھا اور جوانی کے زمانے میں خود کھیت پر کام کیا کرتے تھے۔ آپ کو شکار کا بھی شوق تھا اسی شوق کی وجہ سے آپ اکثر جنگلوں میں چلے جاتے تھے وہاں عبادت میں بھی مشغول رہتے تھے۔ لیکن طبیعت میں رنگینی بھی تھی۔ ایک بار گھوڑے پر سوار آپ کہیں جا رہے تھے حضرت بو علی قلندر نے آپ کو دیکھ کر یہ مصرع پڑھا۔

زہے اسپ و زہے سوار [۲]

اس وقت آپ سرخ لباس پہنے ہوئے تھے اور گھوڑا بھی سرخ تھا۔ اس لئے قلندر صاحب کی زبان مبارک سے دوسری بار یہ شعر برجستہ نکلا۔

گل گوں لباس کرد و سوار سمند شد
یاراں حذر کنید کہ آتش بلند شد [۳]

اس بات کا آپ پر یہ اثر ہوا کہ گریبان چاک کر صحرا کی راہ لی اور چالیس سال تک سیاحت کرتے رہے۔ اور بہت سے مشائخ و صوفیاء کے نیاز حاصل کر کے ان سے باطنی علم حاصل کیا اور دو مرتبہ حج کیا۔ سیر الاقطاب میں ہے۔

" آنحضرت چہل سال مسافرت کرد و مکرر حج الحرمین شریف ادا نمود " [۴]

آپ چالیس سال سیاحت کرنے کے بعد پانی پت تشریف لائے اور حضرت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی کی خدمت میں رہ کر ایک عرصہ تک ریاضت و مجاہدہ میں مصروف رہے پھر پیر روشن ضمیر

---

[۱] سیر الاقطاب ص۔ ۲۰۰۔
[۲] سیر الاقطاب ص۔ ۲۰۱۔
[۳] پانی پت اور بزرگان پانی پت ص۔ ۱۹۹۔
[۴] سیر الاقطاب ص۔ ۱۹۹۔

نے اسم اعظم جو سینہ بہ سینہ چلا آتا تھا آپ کو سکھلایا۔ اور خلاف سے سرفراز کیا اور مسند سجادگی پر
بٹھا کر خانقاہ کی خدمت سپرد کی آپ کی خانقاہ میں بیک وقت ایک ہزار آدمی کھانا کھاتے تھے۔
اور اگر اتفاق سے کبھی آدمی پورے نہ ہوتے تو خدام لوگوں کو بلا کر لاتے تھے۔ مولوی غلام سرور کا بیان
ہے۔

"درمطبخ وی کم از یک ہزار کس صبح وشام طعام می خوردند"۔ ؎۱

حضرت مخدوم کبیر الاولیاء سے بہت سی کرامتیں منسوب ہیں۔ لیکن حقیقت میں آپ نے
لوگوں کے دلوں کو اپنے اعمال و کردار سے گرویدہ بنایا۔ انہیں اپنے روحانی فیض سے مستفید کیا تمام
زندگی اللہ کی مخلوق کو پیٹ بھر کے کھانا کھلاتے رہے اور خود اپنی زندگی فقر وفاقہ میں بسر کی۔ ریاضت
و مجاہدہ سے آخری عمر میں استغراقی کیفیت ہر وقت طاری رہتی تھی اور یہ کیفیت اس درجہ غالب
رہتی تھی کہ خدام آپ کے گوش مبارک میں حق حق حق کی صدا بلند کرتے تو آپ کی توجہ اس طرف مبذول
ہوتی اور وہ نماز پڑھنے کھڑے ہو جاتے اور نماز ادا کرنے کے بعد پھر وہی کیفیت طاری ہو جاتی۔

سماع سے دلچسپی آپ کو سماع سے بہت شوق تھا اور آپ اکثر مشائخ کرام کا عرس کرتے تھے
اور مجلس سماع بھی منعقد فرماتے تھے۔ الہدیہ چشتی کا بیان ہے:

"سماع اکثری شنیدی واعراس شائخ کرام می نمودی و اجتماع خلائق دادی وعلماء
ومشائخ زمان آن قطب ربانی معتقد بودند"۔ ؎۲

اس دور کے مشائخ میں سے کسی نے بھی آپ کے سماع کی مخالفت نہیں کی اور آپ پر ہر وقت
جلال طاری رہتا تھا۔ آپ کی دعا اور زبان میں وہ تاثیر تھی کہ جو زبان سے نکلتا وہی ہو جاتا۔
الہدیہ چشتی نے آپ کی کرامات کے متعدد واقعات قلم بند کئے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے۔

"آں قطب ربانی جائیکہ خواستی در طرفۃ العین رسیدی و باز آمدی ہر چند آں مقام
دور گشتی چنانکہ اکثر نماز جمعہ در کعبہ معظمہ ادا کردی"۔ ؎۳

؎۱ خزینۃ الاصفیا ص۔ ۳۶۲ جلد اول۔

؎۲ سیر الاقطاب ص۔ ۱۹۸

؎۳ سیر الاقطاب ص۔ ۱۹۸

آپ کا وصال ۱۳ ربیع الاول ۷۶۵ھ/۱۳۶۴ء[1] کو پانی پت میں ہوا آپ کا مزار پر انوار زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ مولوی غلام سرور لاہوری نے آپ کی تاریخ وفات پر مندرجہ ذیل قطعات کہے ہیں۔

چوں جلال از جہان سفر ور زید	یار حق بود وصل شد با یار
زاہد پاک اشرف الاقطاب	ہست تاریخ آں شہ ابرار
بندۂ مقتدا جلال الدین ۷۶۵	سال ترحیل وی بکن تکرار
گشت ہم پیر والی ارشاد	از رحالش رقم ز سرور زار
چوں جلال الدین بفضل ایزدی	یافت با وصل خداوندی وصال
بحر عرفانی جلال بن نیاز	ہست وصل آں شہ اہل کمال
گشت کامل پیر عالیشان عیان	نیز مفتاح جلال حق جلال ۷۶۵
جلال از جہاں چوں بجنت رسید	بترحیل آں شیخ اہل کمال
رقم ساکن خلد شد از قلم	دوبارہ خداوند اہل جلال[2]

تصنیفات:۔ آپ کی مشہور تصنیف "زاد الابرار" ہے جو ارشاد و طریقت اور علم معرفت کی اہم اور مفید کتاب ہے۔ وہ آپ کے علوم ظاہری و باطنی کی عمدہ مثال ہے۔ مولوی غلام سرور اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"کتاب زاد الابرار کہ از عمدہ تصانیف اہل حقیقت است از تصانیف شیخ جلال الدین پانی پتی است"[3]

معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب نہ تو دستیاب ہو سکی ہے اور نہ ہی اس کا پتہ چل سکا ہے۔

---

[1] خزینۃ الاصفیا ج ا ص ۳۶۵۔

[2] خزینۃ الاصفیا ج ا ص ۳۶۵۔

[3] " " جلد ا ص ۳۶۲۔
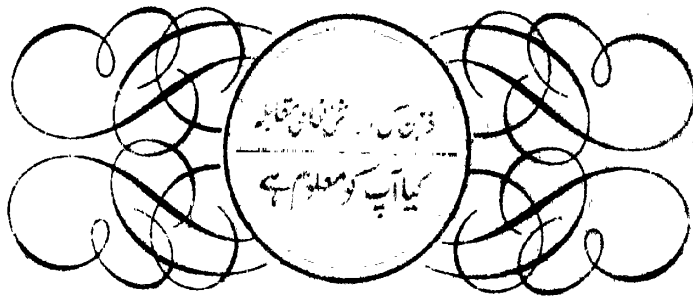
(۱) رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دو برگزیدہ جاں نثار و فدا کار رفقاء حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور حضرت عمر فاروق رضؓ کی قبریں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے جس حجرہ شریف میں ہیں اس کی لمبائی اور چوڑائی کیا ہے؟

(۲) حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے مکتوبات کے تین دفتر اور تین حصے ہیں۔ دفتر اوّل کا نام "دُرالمعرفت" ہے دفتر دوم اور دفتر سوم کا کیا نام ہے؟

(۳) کس صحابی کی ایک آنکھ غزوہ طائف اور دوسری جنگ یرموک میں ضائع ہو گئی تھی؟

(۴) حضورؐ کی پیدائش کے وقت چین میں کون سا خاندان برسراقتدار تھا؟

(۵) وہ کون سا غزوہ تھا جس میں پرچم حضرت عائشہ رضؓ کی اوڑھنی سے بنایا گیا تھا؟

(۶) حضورؐ کو جب اللہ کی طرف سے چار سے زائد نکاح کرنے کی اجازت ملی تو اس وقت کون سی چار ازواج مطہرات آپؐ کے نکاح میں تھیں؟

(۷) وہ کون سا عظیم فاتح ہے جس نے قرآن حکیم کی خدمت میں گلہائے عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا تھا:

"مجھے امید ہے کہ میں دنیا کے تمام دانا اور باشعور لوگوں کو یکجا کر کے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ایک لاثانی نظام قائم کروں گا کیونکہ صرف یہی تعلیمات ہی انسانوں کو مسرتوں سے روشناس کر سکتی ہیں۔"

(۸) حکومت برطانیہ نے علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کو سر کا خطاب کس سن عیسوی میں دیا تھا؟

(۹) چین کا وہ کون سا مقام ہے جہاں ۱۵۵۶ء میں زلزلے سے ۹ لاکھ ۳۲ ہزار افراد ہلاک ہوئے تھے؟

(۱۰) خواجہ حسن نظامی نے کئی شخصیات کو خطابات دیئے تھے، بتلایئے "قد آدم پوسٹر" کا خطاب خواجہ حسن نظامی کو کس نے دیا تھا؟

ان سوالات کے جواب ہمیں ۵ رجنوری تک پہنچ جانے چاہئیں۔ کاغذ پر سوال لکھنے کی ضرورت نہیں صرف جواب لکھیں۔ جواب کے ساتھ نیچے دیا ٹوکن آنا لازمی ہے۔ درست جواب بھیجنے والوں کے نام کا اعلان تو ہم حسب سابق کریں گے ہی، لیکن سال بھر کے لئے "برہان" کا اجراء ایک خوش نصیب ہی کے نام کیا جائے گا ——— (ادارہ)

ذہن کی ورزش انعامی مقابلہ ۱ کے

۱:۔ حضرت تمیم رضؓ بن اوس ۲:۔ فیضی ۳:۔ خالد بن ابی الہیاج ۴:۔ ۱۸۹۷ء استنبول ۳ جنوری ۱۹۴۵ء

(باقی صنہ ۴۰ پر)

ٹوکن انعامی مقابلہ ۲

نام ________________

مکمل پتہ ________________

____

انچارج "ذہن کی ورزش انعامی مقابلہ" دفتر "برہان" اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

عبداللہ بن المقفع اور اسکی شاہکار کتاب کلیلہ و دمنہ

ڈاکٹر شاہد اسلم قاسمی
شعبۂ عربی اے ایم یو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مختصر سوانح حیات:

ابن المقفع ۱۰۶ھ میں بصرہ میں پیدا ہوا روزبہ نام تھا ابو عمر کنیت تھی جو بعد میں ابو محمد سے موسوم ہوئی والد کا نام دازویہ تھا جو حجاج بن یوسف کے زمانے میں فارس اور عراق کے محصلہ مالیات کے عہدے پر فائز تھا تاریخ کی کتابوں میں منقول ہے کہ اس عہدے پر فائز ہوتے ہوئے عوام کا خون چوسنے کی حتی المقدور کوشش کی اسی طرح کی ایک شنیع حرکت پر حجاج نے اس کی سرزنش کی اور اتنا مارا کہ اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا اسی وقت سے اس کا نام المقفع پڑ گیا[۱] روزبہ ابن المقفع مجوسی خاندان کا پروردہ تھا زرادشتی مذہب کا علمبردار تھا چنانچہ عہد طفولیت و شباب کے ایام اس نے مجوسیوں کے درمیان ہی گذارے۔

ابن المقفع نے بصرہ میں عیسیٰ بن علی العباسی کی ملازمت اختیار کی وہ اس وقت تک مجوسی خاندان کا ایک فرد اور زرادشتی مذہب کا مؤید تھا ایک دن وہ کسی واقعہ سے متاثر ہوا اور عیسیٰ بن علی کے سامنے تبدیلی مذہب کی بات کرتے ہوئے اس نے اسلام لانے کی بات کی چنانچہ ایک عام دعوت کا اہتمام کیا گیا جس میں ابن المقفع نے اسلام لانے کا اعلان کر دیا اس طرح قبول اسلام کا شرف حاصل کرنے کے بعد وہ روزبہ سے عبداللہ ہو جاتا ہے[۲]

---

[۱] احمد آتش کا مقالہ "ابن المقفع" اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۱ ص ۷۰۳ طبع اول ۱۹۶۴ء لاہور

[۲] ابن المقفع حنا الفاخوری ص ۱۲ دار المعارف بیروت۔

وہ ایک خوش اخلاق، سخی، نرم مزاج اور سلیم الفطرت انسان تھا اس کے علاوہ اس کے اندر ایثار و قربانی اور صدق و وفا شعاری کا ایسا جذبہ موجود تھا جو لائق تعریف اور قابل تقلید ہے اس نے اپنے ایک معاصر ادیب عبد الحمید کاتب کے ساتھ وفادارانہ دوستی کو نبھا کر جرأت مندانہ اقدام کا ثبوت دیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد کے قتل پر عبد الحمید بھی ایک مکان میں چھپ گیا تاکہ نشانۂ ستم بننے سے محفوظ رہے بہر حال عبد الحمید کی تلاشی شروع ہو گئی اور کھوج کرنے والے اس گھر کے قریب پہونچ گئے جہاں وہ چھپا تھا ابن المقفع بھی وہاں موجود تھا لوگوں نے پوچھا تم دونوں میں عبد الحمید کون ہے دونوں میں سے ہر ایک نے اپنے آپکو عبد الحمید بتایا عبد اللہ بن المقفع کو اس کا خدشہ تھا کہ قطعی طور پر عبد الحمید کو جان لیا گیا تو وہ ظالموں اور جابروں کا ہدف بن جائے گا [1]

اس کی جود و سخا بھی بہت ہی معروف ہے اس کی سخاوت و فیاضی سے متعلق یہ واقعہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

سعید بن سلیم کا بیان ہے کہ میں نے ایک مرتبہ کوفہ کا قصد کیا ابن المقفع نے میری آمد پر خوش آمدید کہا اور دریافت کیا کہ یہاں آنے کا خاص محرک کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ابن المقفع کی خاطر تواضع اور وسعت ظرفی سے قوت ارادی کو تقویت ملی اور میں نے اظہار کیا کہ ایک فرض نے یہاں آنے کو مجبور کیا ہے پھر ابن المقفع نے اس سے معلوم کیا کہ کیا تمہیں کسی سے توقع ہے کہ وہ تمہارے کام آئے تو میں نے کہا کہ ابن شبرمہ نامی ایک شخص نے مجھے بلایا ہے کہ میں اس کے بچوں کو تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ کروں ابن المقفع نے تاسف بھرے انداز میں کہا کہ تمہاری عمر اس کام کے لئے اجازت نہیں دیتی ہے پھر دوسرے دن کی بات ہے کہ میں پڑھانے میں مشغول تھا ابن المقفع آیا اور ہمارے سامنے درہم و دینار اور کنگن سے بھرا ایک رومال رکھدیا [2]

مذکورہ بالا واقعہ اس کی بشر دوستی اور انسانیت نوازی پر شاہد ہے ایثار و قربانی ہمدردی

---

[1] عبد اللطیف حمزہ ابن المقفع ص: ۵۹۔

[2] احمد امین۔ ضحی الاسلام ج ۱ ص: ۲۰۶۔

دنیا میں کوئی وصف اضطراری نہیں تھا بلکہ اس کی طبیعت کا خاصہ تھا اس کا ثبوت اس واقعہ سے بھی ملتا ہے کہ اس نے ہم عصر دوست عبدالحمید کی جاں بخشی کے لئے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا گوارہ کر لیا تھا۔ ڈاکٹر عبداللطیف حمزہ نے اس کی شخصیت کے اس پہلو کو ان الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔

"رجل یجود بحیاته فی سبیل صدیقه وقد آوی الیه ویعرض نفسه للخطر یرید أن یعرفعه عنه" [۱]

ترجمہ: وہ ایک ایسا شخص تھا جو اپنے دوست کی خاطر جان نچھاور کر دیتا تھا وہ اسے پناہ دیتا تھا اور اس سے خطرات کو ٹالنے کی غرض سے اپنے آپ کو خطرات میں ڈال دیا کرتا تھا۔

وہ بڑا ہی فراخدل تھا مالدار ہونے کی بنا پر وہ اپنی ذات پر بھی خوب خرچ کرتا تھا لیکن جس طرح وہ اپنی ذات کے معاملے میں سخی تھا اسی طرح وہ احباب و اقارب اور غرباء و مساکین کی ذات پر خرچ کرنا وجہ سعادت اور باعث شرف سمجھتا تھا ڈاکٹر شوقی ضیف کہتے ہیں۔

"کان حارجا من سلطان بطنه فلا یشتهی مالا یجد ولا یکنز اذا وجد" [۲]

وہ پیٹ کا غلام نہیں تھا اس لئے وہ ناقابل یافت چیزوں کی خواہش نہیں کرتا تھا۔ اور جو چیز حاصل ہو جاتی ذخیرہ اندوزی نہیں کرتا تھا۔

ڈاکٹر احمد امین نے ابن المقفع سے متعلق امام جاحظ کا تبصرہ نقل کیا ہے۔ "کان جوادا فارسیاً جمیلاً" [۳] (وہ بڑا ہی سخی اور اچھے قسم کا شہسوار تھا) چونکہ اس کی مادری زبان فارسی تھی اس لئے وہ اس زبان کے پیچ و خم سے پوری طرح واقف تھا فارسی کے علاوہ عربی زبان پر وہ عبور رکھتا تھا۔

ابن المقفع اور زندقہ۔ دلائل کی روشنی میں:

قبول اسلام کے بعد اس کی زندگی میں کوئی نکھار نہیں آیا اسلامی تعلیمات کے نتیجے میں اسکے

۱۔ عبداللطیف حمزہ۔ ابن المقفع ص۔

۲۔ شوقی ضیف۔ تاریخ الادب العربی ص ۵۲۵ ج ۳۔

۳۔ احمد امین۔ ضحی الاسلام ج ۱ ص ۲۰۶۔

شب و روز میں کوئی قابل ذکر تبدیلی رونما نہیں ہوئی اس کے دور کے سیاسی حالات حلقہ اسلام میں شمولیت سے پہلے کی زندگی، اس کے بعد کی زندگی ان تمام مراحل کے نشیب و فراز پر غور کرنے کے بعد قطعیت کے ساتھ یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ وہ شیدائے اسلام ہو گیا تھا اگرچہ وہ مجمع عام میں اپنے اسلام کا اعلان کر چکا تھا اور دینار وزبہ کے بجائے عبداللہ ابن المقفع کے نام سے واقف ہو چکی تھی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ آباء و اجداد کے دین کی عظمت بھی اس کے دل میں باقی تھی اس نے احوص کے کہے ہوئے اس شعر کو بھی ایک آتش کدہ سے گزرتے ہوئے پڑھا تھا۔

یابیت عاتکة الذی اتغزل — حذر العدی وبه الفؤاد موکل

انی لا منحک الصدود و اننی — قسما الیک مع الصدود لأمیل[1]

"اے دیار عاتکہ جس سے میں دشمنوں کے ڈر سے علیحدگی اختیار کر رہا ہوں حالانکہ دل اسی سے اٹکا ہوا ہے میں تم سے اعراض کر رہا ہوں اور میں بخدا اعراض کے باوجود تمہاری ہی طرف جھکا ہوا ہوں۔"

یہ اور اسی طرح کی کچھ ایسی شہادتیں ہیں جن کی روشنی میں مذہب کے بارے میں اس کا خلوص مشکوک و مشتبہ نظر آتا ہے حنا الفاخوری نے ابن المقفع کی شخصیت کا ایک متوازن جائزہ پیش کیا ہے مذہب اسلام سے رشتہ استوار کرنے سے متعلق بحث کرتے ہوئے یہ عبارتیں ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

"اتصل ابن المقفع رجال الدولة الجدیدة واعتنق الدین الجدید الا انه لم یخلص لتلک الدولة ولا لذلک الدین ولم یمل الیهما مجاراة وسیاسة"[2]

"ابن المقفع کا تعلق نئی حکومت کے افراد سے ہوا اور وہ نئے دین کے حلقہ بگوش ہوا لیکن یہ سچ ہے کہ وہ اس حکومت کے لئے مخلص تھا اور نہ ہی اس دین کے لئے وہ ان کی طرف نہ ہی فکر و خیال میں موافقت کرنے کی بنا پر راغب ہوا تھا اور نہ ہی سیاسی اغراض و مقاصد کے بنا پر"

اگر وہ اخلاق فاضلہ کا مبلغ اور اوصاف حمیدہ کا قائل ہے تو اس کا محرک دین و مذہب نہیں بلکہ اس کی عقل و فہم ہے اسی طرح اگر مذموم اوصاف سے اجتناب و احتراز کی روش اختیار کرتا ہے

---

[1] احمد حسن زیات: تاریخ الادب العربی (مترجم)، ص: ۱۹۷

[2] حنا الفاخوری - ابن المقفع ص: ۱۲

اور نازیبا حرکات و عادات سے کنارہ کش رہتا ہے تو اس لئے کہ عقل و فکر اسے مذموم اور نازیبا گردانتی ہے "کلیلۃ و دمنہ" میں اگر باب برزویہ کو ابن المقفع کا اضافہ کردہ باب سمجھا جائے جیسا کہ متعدد ناقدین کا خیال ہے تو اس کا یہ قول مذکورہ بالا تاثر کو تقویت دیتا ہے اور اس کے صحیح ہونے کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔

" فلما خفت من التردد والتحول رأیت الا اتعرض لما اتخوف منه المکروه ... ان اقتصر على عمل تشهد النفس انه یوافق کل الادیان فکففت یدی من القتل ... وطردت نفسی عن المکروه والغضب والسرقة والخیانة والکذب والبهتان والغیبة"[1]

ترجمہ: "جب مجھے انحراف و روگردانی کا اندیشہ ہوا تو یہ مناسب سمجھا کہ اس چیز کے حصول کے درپے نہ ہوں جس میں شر یا برائی کا خدشہ ہو اور میں کسی ایسے کام پر اکتفا کر لوں جس کے بارے میں نفس گواہی دیتا ہے کہ وہ تمام ادیان کے موافق ہو چنانچہ میں جنگ اور مار دھاڑ سے باز آیا اور اپنے نفس کو ضرر رساں کام، اشتعال انگیزی، چوری، جھوٹ، بہتان اور غیبت سے پاک رکھا"

اس کے قبول اسلام کے اعلان و اظہار کے اہتمام میں عیسی بن علی العباسی نے عام دعوت طعام کیا جس میں مجوسیوں کی عادت کے مطابق کھانے سے پہلے زمزمہ سنجی کی اس حرکت پر عیسی بن علی نے برجستہ ٹوکا " اتزمزم وانت على عزم الاسلام " تو اس نے جواب دیا تھا " کرهت ان ابیت على غیر دین"

مندرجہ بالا واقعات سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ عقیدہ و مذہب کے بارے میں تشکیک زدہ تھا اسے کسی بھی مذہب کے سلسلے میں کامل ایمان و یقین کی نعمت میسر نہ تھی ورنہ کیا معنی کہ لکھتا ہے کہ اس کے بقول اسلام اس کے دل کی گہرائیوں میں گھر کر گیا ہے۔ لیکن مجوسیت اسلام سے متعلق اس پر وقار تقریب میں خلاف شان حرکت پر آمادہ ہوتا ہے اور اس کی تاویل یہ کرتا ہے کہ کوئی لحظہ بھی دین سے تمسک اختیار کئے بغیر گذارنا اسے گوارہ نہیں یہ اس کا عمل ہے جو شک و ریب کے دلدل میں پھنسی ہوئی ذہنیت کو بے نقاب کر دیتا ہے۔

---

[1] باب برزویہ۔ کتاب کلیلہ و دمنہ ص ۶۱،

خیر و شر اور جائز و ناجائز کے سلسلے میں عقل و فرد کو معیار قرار دینا مجوسیوں کے آتش کدہ سے گذرتے ہوئے احوص کے اشعار کا پڑھنا مجلس خورد و نوش کے اندر زمزمہ سنجی کی رسم ادا کرنا یہ سارے ایسے شواہد ہیں جو اس کے زندقہ کے ثبوت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ خلیفہ مہدی جنھوں نے زنادقہ کی ایک جماعت سے محاربہ کرکے زندقہ کی اصلیت کو پرکھ لیا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے۔

"ماوجدت کتاب زندقۃ الا واصلہ ابن المقفع"

استاذ عمر ایٹلی نے اس کے زندقہ سے متعلق ایک بہت بڑا مقالہ سپرد قلم کیا ہے اور آخر میں ادعانہ انداز میں تأثر پیش کیا ہے کہ اگرچہ ابن المقفع زندقہ کے جرم میں مارا نہیں گیا تاہم اس کی موت حالت زندقہ میں ہوئی بعض دوسرے مؤلفین مثلاً السید المرتضیٰ، صاحب الامالی، عبدالقادر بغدادی، البیرونی اور باقلدنی نے بھی اسے زندیق ٹھہرایا ہے۔

ناقدین کا ایک دوسرا طبقہ ہے جو زندیق قرار دینے میں پس و پیش کرتا ہے صاحب اردو دائرہ معارف کے نزدیک ابن المقفع کا "المعارضۃ للقرآن" کے عنوان سے ایک کتاب لکھنا اور اس کے رد میں "الرد علی الزندیق اللعین ابن المقفع" کے عنوان سے ایک کتاب لکھا جانا چند وجوہات کی بناء پر صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

ابن المقفع نے وسعت معلومات اور فکری برتری کے سبب اپنی تصنیفات اور ترجموں میں بعض ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جنکی بناپر بعض ایسے شخص جو اس کی بلند خیالی کو سمجھنے سے قاصر رہے اس کے دین و عقیدہ کی طرف سے بدظن ہو گئے۔

قبول اسلام کے بعد اس سے کوئی ایسی مہلک حرکت سرزد نہیں ہو سکتی تھی جس کے اثرات و نتائج سے باخبر نہ ہوتا اس صورت میں وہ کیسے جرأت کرسکتا تھا کہ وہ "المعارضۃ للقرآن" لکھ کر عوام و خواص کا نشانہ ستم بنے۔

اگر اس کے جانی دشمن سفیان بن معاویہ والی بصرہ کے پاس اس کے زندقہ کے ثبوت میں کوئی واضح دلیل موجود ہوتی تو وہ سزائے موت دلانے میں ذرہ برابر تامل نہ کرتا۔

ان امکانات و توجیہات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن المقفع نے قرآن مجید کے مقابلے میں کوئی کتاب نہیں لکھی ہے جدید دور کے مشہور ناقد احمد امین نے قاسم ابراہیم کی طرف منسوب کی جانے والی کتاب اور خود ابن المقفع کی طرف منسوب ہونے والی کتاب "المعارضۃ للقرآن" کو واضح دلائل سے ثابت کیا ہے معارضۂ قرآن پر زندقہ کے سلسلے میں لکھی جانے والی کتاب" الرد علی الزندیق اللعین" کے بارے میں وہ کہتے ہیں۔

پہلی بات یہ کہ " الفہرست" کے مؤلف ابن الندیم نے زیدی امام قاسم بن ابراہیم کی کتابوں کو شمار کیا ہے لیکن اس مجموعۂ کتب میں اس کتاب کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ [1]

صحیح موقف؛

ابن المقفع کے زندقہ سے متعلق دو مختلف طبقوں کی دلیلیں پیش کی گئی ہیں زندقہ کے قائلین نے اگرچہ عقل و خرد کو کسوٹی دین کے معاملے میں شک و ریب اور دعوت خورد و نوش میں زمزمہ سنجی کو دلائل و شواہد کے طور پر پیش کیا ہے اور ان کی روشنی میں زندیق کی بات کہی ہے لیکن دوسرے طبقہ کی دلیلیں بھی اپنا وزن رکھتی ہیں ایک طرف ابن المقفع بد دین گمراہ اور زندیق معلوم ہوتا ہے تو دوسری طرف دیندار عاقبت شناس اور خادم دین نظر آتا ہے طبقہ اول کی دلیل اس لحاظ سے ضرور وزن دار ہے کہ بہر حال دین و عقیدہ کے معاملہ میں پس و پیش کا شکار رہتا تھا، لیکن زندقہ سے متعلق قطعیت کا حکم لگانا کسی مضبوط اور مستحکم بنیاد پر قائم نہیں، بہرحال شکوک و شبہات میں گرفتار ذہنیت غیر اسلامی حرکتوں کا صدور اور عقل و فکر کو صحیح معیار تسلیم کرنے کے باوجود اس کے زندقہ سے متعلق یک طرفہ ایسے شواہد نہیں ملتے جنکی روشنی میں یک طرفہ فیصلہ صادر کیا جاسکے ہاں" المعارضۃ للقرآن" ہی چونکہ اس باب میں اہم عنصر ہے اس لئے صاحب دائرہ معارف کے اس تبصرے پر ہی اکتفا کیا جاسکتا ہے۔

---

[1] ابن الندیم۔ الفہرست ص:۱۹۳۔

"ابن المقفع نے قرآن مجید کے معارضے میں کوئی کتاب نہیں لکھی ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی شخص نے جو ابن المقفع کی شہرت اور وقعت سے واقف تھا معارضہ قرآن میں ایک کتاب لکھ کر اس سے منسوب کر دی ہو تا کہ لوگ محض اس نام کے باعث اس پر توجہ دیں" [1]

سبب قتل!

والی بصرہ عیسیٰ بن علی العباسی کے کاتب خاص ہونے کا شرف ابن المقفع کو حاصل تھا ملازمت کے دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو اس کی موت کا پیغام ثابت ہوا ۱۳۶ھ میں عیسیٰ بن علی کے بھائی اور خلیفہ منصور کے چچا عبداللہ بن علی نے خلیفہ منصور کی بساط خلافت الٹ دینا چاہی چنانچہ اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا لیکن اسے ہزیمت و پسپائی کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ وہ چھپ چھپا کر اپنے بھائی عیسیٰ بن علی کے پاس سفارش کے لئے پہونچا عیسیٰ بن علی اپنے دوسرے بھائی سلیمان بن علی کے ہمراہ منصور کے پاس سفارش کے لئے گئے سفارش قبول کی گئی اور امان کا وعدہ کیا گیا اس موقع پر والی بصرہ نے ابن المقفع کو اس سلسلے کا عہد و پیمان لکھنے کا حکم دیا اس نے مبالغہ آرائی کی حد تک کچھ ایسے جملے لکھے جو منصور کے شایان شان نہ تھے جس کی بنا پر اس کی آتش غضب بھڑک اٹھی اور "اما احد یکفینیہ" کی چیخ لگائی سفیان بن معاویہ بن یزید بن المہلب جو ابن المقفع کا جانی دشمن تھا وہاں موجود تھا اس نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور پھر اس جستجو میں رہنے لگا کہ وہ اپنی دیرینہ عداوت کا انتقام لے لے۔ اسی دوران عیسیٰ بن علی نے ابن المقفع کو ایک پیغام دے کر سفیان بن معاویہ کے پاس بھیجا بالآخر وہ ابراہیم بن جبلہ کے ساتھ گیا چونکہ اس کے خلاف منظم سازش کی جا چکی تھی اس لئے منصوبہ بندی کے تحت اس کے اعضاء و جوارح کاٹ دیئے گئے اور انہیں دہکتے ہوئے تنور کی نذر کر دیا گیا۔ اس طرح عالم ادب عربی کا یہ نامور انشاء پرداز نشانۂ مظلومیت بن کر ۱۴۲ھ میں رب حقیقی سے جا ملا۔

---

[1] احمد آتش کا مقالہ "ابن المقفع" اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ا ص ۹۰۷، ۱۹۶۴ء۔

ابن المقفع بحیثیت ادیب

چند امتیازات: کسی بھی شاعر یا ادیب کی عظمت کے جہاں دوسرے محرکات و عوامل ہوتے ہیں وہاں ذاتی خصوصیات کا تذکرہ بھی ایک خاص محرک کی حیثیت رکھتا ہے عبداللہ بن المقفع کی شخصیت کے جائزے کا حق اس وقت تک نہیں ادا ہوسکتا جب تک اس کی ذاتی یا شخصی خصوصیات پیش نظر نہ ہوں ذیل میں اس کی یہ چند خصوصیات بیان کی جاتی ہیں۔

فطری ذہانت:

اس کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ذہانت اس کے رگ و پے میں سرایت تھی عہد طفولیت ہی میں وہ حذق و مہارت کے اس مقام تک پہونچ گیا تھا جہاں لوگ اپنے دور ضعیفی کے ایام تک پہنچنے سے قاصر ہوتے ہیں اسے اس بات پر یقین تھا کہ ذکاوت و فطانت ایک ایسا سرمایہ زیست ہے جو دلوں کو تروتازہ رکھتا ہے۔ محمد بن سلام کہتے ہیں کہ میں نے اپنے مشائخ سے یہ تبصرہ سنا ہے کہ عرب میں صحابہ کرام کے بعد خلیل کے مثل کوئی ذہین نہیں پیدا ہوا اور عجم میں ابن المقفع کا کوئی ثانی نہیں ہوا جعفر بن یحییٰ کے اس خیال میں بھی صداقت ہے کہ عبدالحمید اور سہل بن ہارون شاخوں کے مثل ہیں ابن المقفع پھل کے مثل ہے اور احمد بن یوسف پھول کے مثل، تاریخ الادب العربی کے مؤلف عمر فروخ نے اس کی بے مثل ذکاوت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"کان ابن المقفع شدید الذکاء علمہ اکبر من عقلہ" [1]

ترجمہ: ابن المقفع بلا کا ذہین تھا اس کا علم اس کے عقل سے بڑھ کر تھا۔

دقت نظری: کسی بلند پایہ ادیب کی خصوصیات میں دقت نظری بھی ایک اہم خصوصیت

---

[1] عمر فروخ، تاریخ الادب العربی ص ۵۲۔

ہے کیونکہ تحریر کو مؤثر اور دلنشیں بنانے میں مشاہدہ و معائنہ اور تحقیق و تفتیش کا ایک اہم مقام ہے ابن المقفع مسائل و معاملات سے استغراق کی حد تک اپنے آپ کو مربوط کر لیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریروں میں حذق و مہارت اور تحقیق و تفتیش کی عظمت ناطق نظر آتی ہے عمر فروخ نے اپنی تاریخ میں ابن المقفع کی مرعوب کن شخصیت کا تذکرہ یوں کیا ہے۔

" دقيق الملاحظة بارعاً في معالجة الموضوعات المادّية والحسية والعقلية المجردة مع سعة في المعرفة واتزان في الاحكام واصابة في الرأي" [1]

ترجمہ: وہ دقت نظری کا مالک نیز مادی، حسی اور خالص عقلی موضوعات کو برتنے میں کامل تھا اس کے ساتھ ہی ساتھ علم و معرفت میں وسعت احکام میں موزونیت اور رائے میں درستگی جیسے صفات کا حامل تھا۔

تزئین امور:

کسی بھی ادیب یا انشاء پرداز کا کمال اس وقت سامنے آتا ہے جب اس کی تخلیقات قاری کے لئے ہمہ آن تر و تازگی کا ذریعہ بنتی رہیں اس کی تحریریں ہر بار ایک نئی امنگ اور نیا حوصلہ پیدا کرنے کا سبب بنیں اور ان کی لذت و شیرینی بار بار قاری کو دعوت ملاحظہ دے رہی ہوں ایسا اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب تحریریں مزین اور آراستہ ہوں الفاظ کا مناسب استعمال ہو جملے بر محل ہوں کلام تکرار سے خالی ہو چنانچہ ابن المقفع نے اپنی تمام تر تخلیقات میں ان کا لحاظ رکھا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریروں کی معنویت برقرار رہتی ہے قاری امید افزا حوصلوں اور نئی امنگوں کے ساتھ ھل من مزید کہتا ہے۔

مندرجہ بالا ذاتی خصوصیات کے مطالعہ کی روشنی میں عبد اللہ بن المقفع کی شخصیت کا مرقع ایک بے مثل ادیب کی حیثیت سے سامنے آتا ہے قدرتی ذکاوت، فکر و نظر کی گہرائی وسعت مطالعہ اور تزئین امور کے اوصاف کا پایا جانا اس بات کی شہادت ہے کہ وہ ادبیات کے میدان

---

[1] عمر فروخ۔ تاریخ الادب العربی ص: ۵۲۔

میں عزان واقتدار اور علم وعرفان کے عہد زریں کا ایک عظیم نمائندہ تھا ڈاکٹر شوقی ضیف نے اپنی کتاب میں ابن المقفع کی شخصیت کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے اس کی بلاغت سے متعلق ذیل کی عبارتیں قابل ذکر ہیں۔

" والحق انه كان آية في البلاغة وجزالة النعقول ورصانته مع سهولته وقد نصح مرة لبعض الأدباء فقال له: اياك والتتبع مع سهولته وقد نصح مره بعض الادباء فقال له اياك والتتبع لوحشي الكلام طمعا في نيل البلاغة فان ذالك هو العي الاكبر ولعل غيرها يصف بلاغته اجابته لسائل ساله عن البلاغة فقال هي التي اذا سمعها الجاهل ظن انه يحسن مثلها "[1]

ابن المقفع عربی اور فارسی دونوں ہی کے اسرار ورموز سے خوب واقف تھا اصلاح معاشرت کے نقطۂ نظر سے جس چیز کو بھی اس نے مفید مطلب پایا پہلوی سے عربی میں منتقل کردیا ہمارا یہ ادیب الفاظ و معانی کا بحر ذخار ہے لکھتے وقت مناسب الفاظ اس کے استقبال میں صف بستہ کھڑے ہوتے ہیں تحریروں میں کوئی کھوٹ اور لوچ نہیں ہوتی باتیں کافی وشافی ہوتی ہیں تشنگی معانی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ پہلے وہ اس بات پر غور کرتا ہے کہ کون سا معنی مناسب حال اور موزوں ہوگا۔ پھر وہ ان الفاظ کی تلاش میں رہتا ہے جو معنی مقصود کی ادائیگی بطریق احسن کرسکتے ہوں۔ ڈاکٹر احمد امین کا یہ کہنا بجا ہے کہ ابن المقفع کا مقام دنیائے ادب عربی کے پایہ کے نثر نگاروں میں ہوتا ہے اس کا اخلاق وسعت علم تدبر اور زبان کی تیزی اقوام عالم میں ایک مسلمہ حقیقت بن گئی تھی عادت واطوار میں نمایاں تھا عقل و فہم اور وسعت علم میں ہم عصروں سے آگے تھا اور زبان میں کسی قسم کا ضعف نہ تھا[2]

ابن المقفع کی تحریریں۔ فنی حیثیت: مندرجہ بالا مباحث میں ابن المقفع کی ذاتی

---

[1] شوقی ضیف۔ تاریخ الادب العربی۔ ج ۳ ص: ۵۲۲۔

[2] احمد امین۔ ضحی الاسلام۔ ج ۱ ص: ۲۰۶۔

یا شخصی خصوصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کی مدد سے بڑی حد تک اس کی تحریروں کی ادبی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے لیکن ابن المقفع کی ادب شناس شخصیت اس وقت تک تشنہ رہے گی جب تک کہ اس کی تحریروں کی لفظی اور معنوی خصوصیات پیش نظر نہ ہوں ذیل میں اس کی تحریروں کی چند خاص ادبی خصوصیات کا تذکرہ ہے ۔

لفظی خصوصیات میں پہلی اور اہم خصوصیت الفاظ کا حسن انتخاب ہے ابن المقفع اس بات پر بہت زور دیتا ہے کہ مطالب و مفاہیم کے لحاظ سے الفاظ برمحل اور ٹھوس ہوں نیز فصاحت و بلاغت کی میزان پر پورے اترتے ہوں ۔

ایجاز واختصار ابن المقفع کی تحریروں کا ایک خاص وصف ہے اس کی تقریباً تمام ہی ادبی کاوشوں نے ایجاز واختصار کے اعتبار سے اپنا حلقہ تعارف وسیع کر لیا ہے بہت ساری باتوں کو چند الفاظ کا جامہ پہنانا اور منتشر افکار و خیالات کو حسن ایجاز کے ذریعہ شیرازہ وحدت میں پرو دینا بایں طور کہ فصاحت و بلاغت کی دلآویزی باقی رہے ایک ایسا وصف ہے جو اسکی تخلیقات کی ادبی حیثیت میں چار چاند لگا دیتا ہے مارون عبود لکھتے ہیں ۔

"جيد و ان ظهرت فيه العجمة، رصين القول، شريف المعاني، سهل بين رشيق يختار الكلمة السهلة الصحيحة الفصيحة وربما غتش عنها جملة خالية من اساليب التفنن في كتاب كليلة و دمنة اما اسلوبه في الادب بين فمنطقي ولذلك صعبت جملته" [1]

اس کی تحریروں میں قصوں اور کہانیوں کا بھی نمایاں مقام ہے قصے کبھی جانوروں کے زبان میں نقل کئے گئے ہیں اور کبھی انسانوں کی زبان میں، اور اسی طرح وہ اپنی تخلیقات میں ضرب الامثال کو بھی نظر انداز نہیں کرتا خواہ قصے ہوں یا کہانیاں یا پھر امثال ان تمام کے پیش کرنے کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے کہ قاری یا سامع اکتاہٹ محسوس کئے بغیر باتوں کو ذہن نشین کرتا چلا جائے ۔

پُرحکمت جملوں کا استعمال، ابن المقفع کوئی بات بھی کہتا ہے تو وہ وثوق و اعتماد کے

---

[1] مارون عبود - ادب العرب ص ۲۱۲ -

ساتھ کہتا ہے نیز اس کی باتیں حکمت و دانائی سے پُر ہوتی ہیں اس لئے یہ ہر خاص و عام کی توجہات کا مرکز بنتی ہیں اپنی باتوں کو مضبوط دلائل سے پیش کرتے ہوئے حکیمانہ جملوں کا استعمال کرتا ہے جس کی بنا پر قاری کی دلچسپی اور بڑھ جاتی ہے۔

کسی بھی تخلیق یا تصنیف کی رفعت و عظمت کا اندازہ لگانے کے لئے جہاں بہت سارے محرکات ہوتے ہیں ان میں وضاحت و مقصدیت کو مقام حاصل ہے عبداللہ بن مقفع کی تحریریں اس وصف کا جامہ پہنے ہوئے ہیں وہ فکر و خیال کی تمام شقوں کو اچھی طرح واضح کر دیتا ہے یہاں تک کہ افہام و تفہیم کے معاملے میں تشنگی کا احساس نہیں ہوتا اس کے علاوہ لغو اور بے مقصد باتوں سے احتراز کرتا ہے اور اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ خواہ قصہ ہو یا پُر حکمت جملہ یا مثال قارئین اس کی توقع کے مطابق استفادہ کریں۔

تراجم و تالیفات

ابن المقفع نے جو نثری سرمایہ چھوڑا ہے وہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔

(۱) تراجم (۲) تالیفات و تصنیفات

تراجم میں مندرجہ ذیل کتابیں ہیں۔

کلیلہ و دمنہ : پنچ تنتر کا پہلوی سے عربی میں ترجمہ۔ پنچ تنتر کا نسخہ برزویہ کی وساطت سے کسریٰ نوشیرواں اول کے عہد حکومت میں ہندوستان سے ایران پہنچا اس کو پہلوی زبان میں منتقل کیا گیا اور پھر زبان پہلوی سے عربی میں۔

سیر الملوک : خدائی نامگ کے نام سے مشہور ہے یہ تاریخ ملوک العجم کا ترجمہ ہے۔

کتاب الرسوم یا کتاب الآیین : یہ کتاب آئین نامگ کا ترجمہ ہے ساسانیوں کے آداب سیاست و معاشرت اور قوانین و ضوابط کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

کتاب بیگسران : اس کتاب کے اندر ترکوں اور ایرانیوں کی قدیم آویزش و تصادم نیز سیاوش کی موت اور رستم پور دستاں کا ذکر کیا گیا ہے۔

کتاب البیکار : تاریخی کہانیوں پر مشتمل ہے۔

ابن اصیبعہ اور بعض دوسرے مؤلفین نے کہا ہے کہ ابن المقفع نے ارسطو کی تصنیفات کتاب قاطیغوریاس، کتاب باریمیناس، کتاب انالیقا اور فرفریوس کی ایساغوجی کا ترجمہ پہلوی سے عربی میں کیا ہے اور ان میں اصطلاحات جدیدہ کا بھی استعمال ہوا ہے۔[1]

تالیفات

ابن المقفع کی تالیفات یا تصنیفات کے سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ انکا موضوع ادب اخلاق اور سیاست ہے ذیل میں مختصر تعارف کے ساتھ تالیفات کی فہرست پیش کی جاتی ہے۔

الادب الصغیر: یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جو پند و موعظت و نصح و خیر خواہی کی کی باتوں پر مشتمل ہے۔

الدرۃ الیتیمۃ یا الادب الکبیر فی طاعۃ الملوک: یہ بھی ایک رسالہ ہے جس میں امراء و ملوک سے متعلق چند معاملات پر گفتگو ہے۔

رسائل: خطوط پر مشتمل ایک تصنیف ہے۔

رسالۃ الصحابۃ: اس کے اندر سیاسی معاملات زیر بحث آئے ہیں اس میں امیر المومنین (خلیفہ منصور) کو نصیحتیں کی گئی ہیں۔

حکم بن المقفع: چھوٹے چھوٹے حکیمانہ اقوال کا مجموعہ ہے۔

اللولد الوجیز للولد الصغیر: ناصر الدین عبد الرحیم بن ابی منصور کے نام مواعظ پر مشتمل ایک رسالہ ہے بظاہر یہ مقالہ ابن المقفع نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کے لئے لکھا ہے اور اس کا ہر فقرہ اس لفظ سے شروع ہوتا ہے جس کا فارسی ترجمہ " اے پسر" ہے جن فضائل کو حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی ہے وہ ہیں شکریہ، ترک بیکاری، راست بازی، حسن کلام، صبر و سکون وقار کی نعمت سے بہرور ہونا۔[2]

---

[1] ابن المقفع کے تراجم کی یہ فہرست اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۱ ص ۸۰۷ - ۵۵ سے ماخوذ ہے

[2] اردو دائرہ معارف اسلامیہ

کتاب کلیلہ و دمنہ چند خیالات

اغراض و مقاصد: "کلیلہ و دمنہ" فن انشاء مرسل کا بے باک ترجمان ہے باوجودیکہ یہ ایک ترجمہ ہے لیکن اس دور کی ان شاذ و نادر ادبی کتابوں میں ہے جس کی قدر و قیمت عوام و خواص دونوں کی نگاہ میں مسلم ہے صدیاں بیت گئیں لیکن اس کی کتاب (ترجمہ) "کلیلہ و دمنہ" کی معنویت میں کوئی فرق نہ آیا آج بھی اس سرمایہ ادب کو ادباء اور فصحاء کا حرز جان بنایا جاتا اور اس سے اقوال و حکم کی خوشہ چینی کرنا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ابن المقفع ان ستونوں میں ہے جن پر ادب عربی کی فلک بوس عمارت قائم ہے۔

کسی کتاب کی قدر و قیمت کے تعین میں مقصدیت کا عنصر بڑا اہم ہوا کرتا ہے کلیلہ و دمنہ جو اصل سے زیادہ ترجمے کی زبان سے دنیائے عرب و عجم میں مقبول ہوئی اس کے کچھ مخصوص اغراض و مقاصد ہیں جو فکر و خیال کی عظمت پر مبنی ہیں۔

جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی وہ زمانہ ظلم و جور اور قساوت و سنگدلی کا تھا بادشاہ اور اس کے اعوان و انصار رعایا کو اپنے طرز عمل سے مظالم کا نشانہ بنایا کرتے تھے بشرافت و انسانیت مفقود تھی اخوت و محبت اور ہمدردی و موانست نامانوس چیز بن گئی تھی ایک طرف انسانیت و بشر دوستی کی خوشگوار فضاء قائم کرنا مقصد عظیم تھا تو دوسری طرف بادشاہ اور اس کے معاونین کی جانب سے خوف و ہراس کی کیفیت۔ ان دونوں احوال کے پیش نظر اصلاح معاشرت کے لئے حکمت و تدبر کا اساسہ درکار تھا چنانچہ چڑیوں اور جانوروں کی زبان اختیار کرتے ہوئے ان تمام مظالم و شدائد کے سدباب کی کوشش کی گئی یہ ایک لطیف انداز تھا جس سے مقصود یہی تھا کہ بالواسطہ بادشاہ اور اعوان و انصار مخاطب ہوں ان کے دلوں میں رقت پیدا ہو اور انسانیت کی عظمت بحال ہو۔

اصلاح اخلاق اور تہذیب نفوس کے ساتھ اجتماعی اصلاح کی باضابطہ کوشش کے مظاہر جا بجا نظر آتے ہیں جیسے چغلخور کی صلاح سے اجتناب، اشرار کی رفاقت سے احتراز دشمنوں کی سازشوں اور معاندانہ چالوں سے متنبہ ہونا، غفلت ولاپرواہی سے نقصان حزم و احتیاط کا فائدہ

اور اسی طرح کے بہت سے قیمتی اسباق جو اصلاح معاشرت کے لئے ناگزیر ہیں ان سے کلیلہ دمنہ کے صفحات سیاہ ہیں۔

اگر ان اغراض و مقاصد کو تہذیب انسانیت اور اصلاح معاشرت کے سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ یہ کتاب اس باب میں ایک قیمتی خزانہ ہے کیونکہ متعدد واقعات اور متنوع قصوں سے ایک طرف انفرادی و اجتماعی زندگی کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا گیا ہے اور دوسری طرف امراء و حکام کے لئے ایسے نقوش راہ فراہم کئے گئے ہیں جنہیں اختیار کرنے کے بعد سلطنت کے استحکام کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے اور پھر ایک پر وقار معاشرے کا قیام عمل میں آسکتا ہے ایک مبصر کے ان الفاظ سے بھی کلیلہ دمنہ کی افادیت و معنویت کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

"KALILA WA DIMNA IS A SELECTION OF ANCEDOTES AND SHORT STORIES ABOUT ANIMALS WITH ETHICAL CONCLUSIONS RELATING TO THE HUMAN CONDITIONS." ؎

ترجمہ: کلیلہ و دمنہ جانوروں سے متعلق ان چھوٹے چھوٹے قصوں اور کہانیوں کا ایک مجموعۂ انتخاب ہے جن کا خاتمہ ان اخلاقی تعلیمات پر ہوا ہے جو انسانوں کے حالات و کوائف سے متعلق ہیں۔

عمر فروخ کے الفاظ میں۔

" وفی هذا الکتاب یتعلم الامراء کیف یحکمون الرعایا وکیف یتقی بعضهم بعضا وکیف یتعایش الناس فیما بینهم أو یسیرون علی طاعة اولی الامر منهم و عمدة الکتاب ان تمت

؎ NAJEEBULLAH ____ ISLAMIC LITERATURE P. 77., 1963 - NEW YORK.

مثلا عليا ثابتة من طاعة السلطان وحسن العمل امته ومن الصدق في العقول والعمل ومن ادب الضيافة "[1]

کلیلہ و دمنہ اپنے وقت کی آواز تھی اس کے اعلیٰ افکار و خیالات سے بہت سے لوگ متاثر ہوئے اسی طرز پر بہت سی دیگر کتابیں لکھی گئیں شعراء نے اس کے اعلیٰ خیالات و افکار کو اشعار کا جامہ پہنایا اور بہت سے شعراء نے اس کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے جس میں سے ابان اللاحقی کا ترجمہ بہت مشہور ہے بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ تقریباً چودہ ہزار اشعار پر مشتمل تھا اس کے کچھ اشعار (اسی اشعار) ہمیں صولی کی کتاب الاوراق میں ملتے ہیں۔

وقيل ايضا انه قد ينبغي	للرجل الفاضل فيما يبتغي
الا يرى الا مع الا ملاك	أو يعبد الله مع النساك[2]

ومنها في باب الاسد والثور:

وان من كان داني النفس	يرضى من الارفع بالاخس
كمثل الكلب الشقي البائس	يفرح بالعظم العتيق اليابس

کلیلہ و دمنہ ایک ادبی شاہکار

ادبی نقطۂ نظر سے اگر کلیلہ و دمنہ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک چشمہ ہے جس کے صاف و شفاف پانی سے پیاس بجھائی جا سکتی ہے فن و ادب کی چاشنی سے پُر ایسی عبارتیں ہر صفحہ پر قیمتی موتیوں کے مثل بکھری ہوئی ہیں جو ایک مقرر کی قوت گویائی کو تقویت دیتی ہیں اور احساسات و خیالات میں نکھار پیدا کرتی ہیں اور ایک قلم کار کے زورِ قلم میں تیزی کا سبب بنتی ہیں۔

الفاظ کا حسن انتخاب ایک قیمتی جوہر ہے جو شروع سے آخر تک اس کتاب کی زینت بنتے

---

[1] عمر فروخ۔ تاریخ الادب العربی ج ۲ ۔ ص: ۵۳

[2] آثار عبداللہ بن المقفع ص: ۱۷ [3] ایضاً : ۱۸

ہوئے معانی ومفاہیم کا کما حقہ ادائیگی میں محرک خاص کی حیثیت رکھتا ہے۔
جملوں کو چھوٹے چھوٹے فقروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور انداز واسلوب کا استعمال کیا جاتا ہے تاکہ عوام وخواص دونوں ہی اس سے مستفیض ہوں جس موضوع کو بھی اس کتاب میں زیر بحث لایا گیا ہے اس ضمن میں ذیلی مباحث کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں ہر موضوع بحث کو عقل وحکمت سے پُر دلیلوں کی روشنی میں دیکھا گیا ہے۔
کتاب میں جانوروں کی زبان استعمال کی گئی ہے دراصل یہ ایک لطیف انداز ہے جس سے بالواسطہ بادشاہوں کو قریب لانے کی کوشش کی گئی ہے۔
ذیل میں اسی کتاب کے کچھ اقوال واحکام پیش کئے جاتے ہیں جن کی روشنی میں کلیلہ ودمنہ کی معنویت اچھی طرح بے نقاب ہو جاتی ہے۔

" واعلم ان المستشار لیس بکفیل وان الرأی لیس بمضمون بل الرأی کلہ غرر لان امور الدنیا لیس شیٔ منہا بثقۃ ولانہ لیس شیٔ من امرھا یدرکہ الحازم الا وقد یدرکہ العاجز بل ربما أعیی الفرصۃ ما امکن العجزۃ "[1]

ترجمہ: یہ جان لو کہ صاحب مشورہ ذمہ دار اور جوابدہ نہیں ہوتا ہے اور رائے کے بارے میں کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی کیونکہ تمام رائیں غیر واضح ہوتی ہیں اس لئے کہ دنیا کی کوئی بھی چیز ناقابل اعتماد نہیں ہے اس لئے بھی کہ بعض دنیوی معاملات ایسے ہوتے ہیں جو عقلمندوں کی گرفت سے باہر ہوتے ہیں اور بے وقوفوں کی ان پر فتح ہو جاتی ہے۔

" ومن طلب الأمر الجسیم فامکنہ ذلک فاغفلہ فاتۃ الأمر وھو خلیق الا تعود لہ الفرصۃ ثانیۃ ومن جد عدوہ ضعیفا ولم ینجز قتلہ ندم اذا استقوی ولم یقدر علیہ "[2]

---

[1] "کلیلہ ودمنہ" ابن المقفع

[2] باب القرد والغیلم کلیلہ ودمنہ ص: ۱۷۱

قسط ۱۶

عہد مغلیہ یورپی سیاحوں کی نظر میں

۱۶۱۶ء ۱۶۱۹ء

پروفیسر محمد عمر، شعبہ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

موت اور قبرستان: سڑکوں اور مکانوں سے دوران کے قبرستان ہوتے تھے قبر کے اندر کی زمین چکنی یا اس پر فرش بنا ہوتا تھا۔ پانی کے کنوے کے برابر گہرا "ایک گڈھا" اس کے وسط میں بنایا جاتا تھا۔ لوہے کی گول سلاخوں سے بنے ہوئے ایک تابوت میں وہ لوگ میت کو لے جاتے تھے۔ چونکہ اس سے آگ نکلتی تھی اس لئے لکڑی کا تابوت نہیں بناتے تھے اس کنوے کے آس پاس زمین پر یا اندر فرش پر" میت کو رکھتے تھے اور باریک ایک سفید چادر سے اسے ڈھک دیتے تھے۔ داروبا "ہر بود" اس میت کے ساتھ نیچے اترتا۔ نیچے پہونچکر جمع شدہ سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے وہ یہ الفاظ کہتا۔ چونکہ میت چار عناصر پر مشتمل تھی لہذا میں چاہتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک اب اپنا فرض انجام دے۔" ان کی میت کو گدھ کھا جاتے اور وہ میت وہاں اس وقت تک پڑی رہتی جب تک دوسری نعشیں نہ لائی جاتیں۔ اس کے ہڈی کے ڈھانچے کو دوسروں کے لئے جگہ خالی کرنے کے لئے وہ لوگ اسی بہرے گڈھے میں پھینک دیتے۔

سیاروں پر عقیدہ:

وہ لوگ آگ اور اس کے مشابہ دوسری چیز جیسے سورج و چاند کی پرستش کرتے ان کو عبادت کرتے وہ سورج کی طرف اور رات کو چاند کی طرف دیکھا کرتے تھے۔ ان کے ... خانوں میں برابر آگ جلتی رہتی تھی۔ ان کے پجاری دارو یا ہربد کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ ان دونوں کے ... ایک اعلیٰ ... ہوتا تھا ... [illegible]

کرتے تھے جو اکثر ان کے سامنے نہیں آتا تھا۔ ان کے مذہبی قانون کے مطابق بجاریوں کے لیے یہ حکم تھا کہ وہ یا تو عبادت خانہ کے قریب یا اسی میں رہیں تاکہ ان کے پاس آنے والے لوگوں کی وہ رہنمائی کرسکیں۔ وہ لوگ بہت سے تہوار مناتے تھے۔ لیکن ہر ایک تہوار کے بعد روزہ رکھتے تھے۔

(۸) ہندوستان کی صنعتی چیزیں، پھل اور اشیائے نوش

پھل؛ اس ملک میں کثرت سے خربوزے پیدا ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ یہاں تربوز، اخروٹ، لیمو، نارنگی، کھجور، انجیر، انگور، ناریل، کیلا، آم، اناناس، ناشپاتی اور سیب وغیرہ ہوتے تھے۔

شراب اور تاڑی؛

ایک رسیلے" درخت سے" تاڑی کا عرق کھینچا جاتا تھا۔ اس ملک میں ہلکے پھلکے لوگ درخت پر اس پھرتی سے چڑھ جاتے تھے جیسے کہ وہ سیڑھیوں پر چڑھ رہے ہوں۔" بڑے اور ہلکے" کدو کے بنے ہوئے برتن وہ لوگ اس درخت کی نرم شاخوں کے نیچے لٹکا دیتے تھے۔ تاڑی رات کو کھینچی جاتی تھی۔ اس پر سورج کی روشنی کے پڑنے کے پہلے ہی اس رس کو باہر نکال لیتے تھے۔ نئی ایک شراب کی طرح یہ خوش ذائقہ ہوتی تھی۔ یہ شراب اثر پذیر، نافع امراض اور غیر نقصان دہ ہوتی تھی۔ اگر اسے سورج کی دھوپ میں چھوڑ دیا جاتا تو وہ اور زیادہ نشہ آور ہو جاتی تھی۔ یہ پتھری کے لئے بہت اچھی ثابت ہوتی تھی کیونکہ وہ اس کے درد کو کم کر دیتی تھی۔ یہ بہت سستی ہوتی تھی۔

بعض عام قسم کی شراب شکر سے بنائی جاتی تھی جسے لوگ "عرق" کہتے تھے۔ ارمینی لوگ شکر اور دوسرے عناصر سے یہ شراب بناتے تھے۔ یہ سخت اور صحت بخش ہوتی تھی۔ یہ فروخت کی جاتی تھی۔ یہاں اچھے اور میٹھے کثرت سے انگور ملتے تھے۔ لیکن اس سے کسی قسم کی شراب نہ بنائی جاتی تھی۔

شراب نوشی کے پیالے گینڈوں کے سینگوں سے بنائے جاتے تھے۔ وہ دستیاب ہو جاتے تھے لیکن عام طور پر نہیں۔ ان پیالوں میں رکھنے سے اس شراب میں بعض مخصوص "خصائص"

پیدا ہو جاتے تھے۔

قہوہ:

بہت دیندار لوگ ایک قسم کا عرق پیتے تھے جسے وہ قہوہ کہتے تھے۔ پانی میں کالے بیج ابال لئے جاتے تھے۔ وہ پانی کالا ہو جاتا تھا۔ اس سے پانی کا ذائقہ بہت کم بدلتا تھا۔ یہ عرق آدمی میں جوش پیدا کر دیتا اور خون صاف کرتا تھا۔

پان:

یہ "بہت نازک ایک پتا" ہوتا تھا جو چھالی اور سفید چونے کے ساتھ کھایا جاتا تھا۔ اس کا رس چوسا جاتا اور بقیہ "اُگل دیتے" تھے۔ ٹیری نے لکھا ہے کہ "مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ بند ایک کمرے میں اگر کوئی پان چبا رہا ہو تو اس کھانے والے کی سانس اس کمرے کو بہت خوشگوار مہک سے بھر دیتی ہے"

رضائیاں:

وہ لوگ مصنوعی طور پر ریشمی کپڑے بنتے تھے جن میں سے بعض "بڑی خوبصورتی سے نقرئی اور طلائی دھاگوں سے بنے ہوتے تھے" وہ لوگ چھینٹ کے رنگین کپڑوں سے رضائیاں بناتے تھے۔ ان رضائیوں میں وہ لوگ بڑے عمدہ طریقے سے ڈورے ڈالتے تھے۔

قالینیں:

تین گز سے زیادہ چوڑی اور بہت لمبی، عمدہ رنگ برنگی قالینیں وہ لوگ سوتی دھاگوں سے بناتے تھے۔ عمدہ قسم کی قالینیں ریشم سے بنائی جاتی تھیں۔ ایسی کاریگری سے وہ قالینیں بنائی جاتی تھیں کہ ان میں سے بنائے گئے پھول اور تصویریں بڑی خوبصورتی سے ظاہر ہوتی تھیں۔" بہت پُر تکلف قالینوں کی زمینیں عام طور پر نقرئی یا طلائی ہوتی تھیں جن پر ریشمی پھول اور تصویریں بنی ہوتی تھیں۔

صندوق اور صندوقچے:

صندوقوں، صندوقچیوں، چوکیوں، چھوٹی الماریوں اور رگھڑ ودیجیوں کے بنانے میں انھیں "اعلیٰ ترین دسترس" حاصل تھی۔ ایسے سامان اندر اور باہر دونوں طرف سے اچھی طرح

بنے ہوتے تھے۔ ان میں ہاتھی دانت، صدف، تار اور کچھوے جڑے ہوتے تھے۔ عقیق کے علاوہ پیالے بناتے تھے۔ پلنگ کی چادروں، صندوقوں، بڑے صندوقوں، پھل رکھنے کی تشتوں پر "بڑی صفائی" سے وہ نقاشی کرتے تھے۔ جب ان پر جڑاؤ کا کام نہ ہوتا تو ان کے اوپر وہ موتی گوند لگا دیتے تھے۔ اور بڑی صفائی سے ان پر نقرئی طلائی یا دوسرے رنگوں سے نقش و نگار بنا دیتے تھے۔ اس کے بعد ان پر چمکیلی قلعی کر دیتے تھے۔

بوٹ اور جوتے:

وہ لوگ انگریزی طرز کے مطابق جوتے، بوٹ، کپڑے کے جوتے، فیتے اور دستانے اور پیٹیاں بناتے تھے۔ "جو ان کے طرزوں اور طریقوں سے مختلف ہیں" وہ ان چیزوں کو بہت خوبصورت بناتے تھے۔

کشتیاں:

ان کی کشتیاں بہت وزنی سامان لے جاتی تھیں۔ ان میں سے بعض کے سامان کا وزن ۴ یا ۵ ٹن ہوتا تھا۔ ان کی بناوٹ اچھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ چوڑی اور چھوٹی ہوتی تھیں۔ وہ بہت بڑی ہوتی تھیں اور مسافروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی تھیں۔ بہت بڑی کشتیوں میں ٹیری نے مسافروں کا شمار کیا تھا۔ ان کی تعداد ستّرہ سو تھی۔ ان کی کشتیوں کے رسّے بہت عمدہ ہوتے تھے۔

(۹) متفرقات

خسرو:

ٹیری نے لکھا ہے کہ خسرو کی آنکھوں کو ایسی چیز سے مہر بند کر دیا گیا تھا جو ہٹایا نہیں جاسکتا تھا۔ جہاں تک اس شہزادے کے کردار کا سوال تھا تو اس نے لکھا ہے کہ " اسکی وضع میں بہت دلکش ایک شرافت پائی جاتی تھی۔" عام لوگ اس سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ وہ ان کی محبت کا مرکز اور خوشی کا باعث بن گیا تھا۔ وہ ایسا ایک شخص تھا جس کے ایک بیوی تھی جس نے ہر قسم کی خوشی اور تکلیف میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ شہزادے کی موت کے بارے میں ٹیری کی رائے یہ ہے کہ "اس کے بھائی خرم نے اس بے حد بہادر شہزادے کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

شہاب ثاقب؛

۱۶۲۱ء ماہ نومبر میں شعلہ فشاں دو ستارے۔ ایک شمال میں اور دوسرا جنوب میں نمودار ہوئے۔ شمالی ستارہ "شعلہ فشاں ایک مشعل کی طرح" معلوم ہو رہا تھا اور جنوبی ستارہ ایسا معلوم ہو رہا تھا ——————— کہ "جیسے آگ سے اُبل کر باہر نکلتا ہوا ایک گھڑا ہو" اس واقعہ کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد جنوب میں بارش نہ ہوئی اور شاہی فوج کو خرم نے شمال میں ہی کام میں لگائے رکھا۔

جہانگیر کے بھتیجے ؛

جہانگیر کے بھتیجوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا لیکن بعد میں انہوں نے اس فرقے کو ترک کر دیا تھا کیونکہ یسوعی لوگ انھیں عیسائی مذہب کی بیبیاں اور عہدے دنیائے مسیحیت سے مہیا نہیں کر سکتے تھے۔

فادر کورسٹے کے مکان کو جلایا جانا ؛

فادر کورسٹے کا مکان جل کر خاکستر ہو گیا لیکن صلیب کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ فادری اس صلیب کو بادشاہ کے پاس لے گیا اور یہ اعلان کیا کہ یہ ایک معجزہ تھا۔ شہزادہ خرم نے جو وہاں موجود تھا، یہ تجویز پیش کی کہ اسی وقت وہ وہیں آگ جلائے گا اور فادر اس صلیب کو اس میں ڈال دے اور اگر وہ نہ جلی تو وہ سب کے سب عیسائی مذہب قبول کر لیں گے۔ لیکن اگر صلیب جل گئی تو فادر کو خود کو جلانا ہو گا۔ بعض وجوہ کی بنا پر فادر نے اس شرط کو منظور نہ کیا۔

لوگوں کا عیسائی مذہب قبول کرنا ؛

ٹیری کا بیان ہے کہ یسوعی لوگ فخریہ انداز میں اس بات کا دعویٰ کرتے تھے کہ ان کے اثر سے بہتوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا لیکن یہ صرف افواہیں تھیں۔ انہوں نے بہت سے تھوڑے لوگوں کو حلقۂ عیسائیت میں داخل کر لیا تھا۔ وہ غریب طبقے کے لوگ تھے جو ان کے سہارے گذر بسر کرتے تھے۔ اٹلی کے چند جواہر فروشوں، یورپی مسافروں اور دوسرے اقوام کے تھوڑے سے لوگوں پر عبادت گذاروں کی جماعت مشتمل تھی۔" ان کے گرجا گھر تھے لیکن مذہبی پیشوا نہ تھے"

روا داری ؛ ٹیری نے لکھا ہے کہ کورئیٹ نے ایک بار مقامی زبان میں یہ الفاظ کہے "لا الٰہ اللّٰہ،

حضرت عیسیٰ ابن اللہ" اور اس نے مزید یہ کہا کہ "پیغمبر اسلام ریاکار تھے" (نعوذ باللہ) ٹیری نے لکھا ہے کہ "ایشیا کے اگر کسی دوسرے ملک میں ایسی بات کہی گئی ہوتی تو اسے بڑی تعذیب کے ساتھ اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ لیکن اسے یہاں ایک پاگل آدمی سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔"

ترکی کے بادشاہ کے لئے پیغام:

ترکی کا سفیر جب واپس جانے لگا تو اس نے شہنشاہ (جہانگیر) سے دریافت کیا کہ اسے اس کے آقا کے لئے کون سا پیغام دیا گیا۔ شہنشاہ نے جواب دیا "اپنے آقا سے یہ کہنا کہ وہ میرا غلام ہے کیونکہ میرے مورثِ اعلیٰ نے اس پر فتح حاصل کی تھی۔

انارکلی:

ٹیری نے لکھا ہے کہ انارکلی، اکبر کی بے حد چہیتی بیوی تھی۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ والد اور بیٹے کے تعلقات خوشگوار نہ تھے کیونکہ سلیم کے انارکلی سے تعلقات تھے۔

مغل پرچم:

شاہی پرچم شاہی تاج پہنے ہوئے ایک شیر کی طرح تھا جو سورج کے ایک حصّے پر سایہ فگن تھا۔

(۱۱) پیٹرا ڈیلا ویلا (۱۶۲۳ء)

سوانح عمری:

روم کے قدیم اور معروف ایک خاندان سے پیٹرا ڈیلا ویلا کا تعلق تھا۔ اس کے باپ کا نام پمپو ڈیلا ویلا تھا۔ اپریل ۱۵۸۶ء میں پیٹرا کی ولادت ہوئی تھی۔ اس کی ابتدائی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہوتے ہیں۔

۱۶۱۱ء میں اس نے اسپینی جنگی بحری بیڑے میں نوکری کر لی تھی جو بار بری پہ حملہ کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ وہ واپس لوٹا لیکن کسی کے ساتھ محبت کے معاملے میں مایوسی کی وجہ سے وہ نیپلس میں رک گیا۔ وہاں اس کے ایک دوست پرلو سیح پینو نے اسے مشرقی ممالک میں سفر کرنے کا مشورہ دیا۔ لہذا ۸ رجون ۱۶۱۴ء کو وینس سے استنبول جانے کے لئے وہ

بحری جہاز میں سوار ہوا ستمبر ۱۶۱۴ء تک وہ عثمانیوں کے دار الخلافہ میں رہا۔ اس کے بعد وہ ایشیائے کوچک، مصر، ماونٹ، سنائی اور فلسطین کے سفر پر روانہ ہوا۔ وہ جیروشلم، الیپو، دمشق اور بغداد گیا۔ بغداد میں اس نے مایونی گیوریڈا نامی سیریائی ۱۸ سالہ نوجوان ایک لڑکی سے شادی کرلی۔ فارس کی سیاحتوں میں وہ اس کے ہمراہ گئی۔

۱۶۱۶ء میں وہ ایران میں موجود تھا۔ اس ملک میں اس نے ہمدان، اصفہان اور شیراز شہر دیکھے۔ ایک بار وہ شاہ عباس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ۳۰ دسمبر ۱۶۲۱ء کو مینا میں اس کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ اس نے اس کی نعش کو مسالا لگا کر ایک تابوت میں رکھ دیا اور مرحومہ کے جورجیائی غلام لڑکی کے ساتھ وہ اس تابوت کو پورے سفر میں اپنے ساتھ لے گیا۔

ہندوستان کے لئے وہ بندر عباس سے جنوری ۱۶۲۳ء میں بحری جہاز میں سوار ہوا اور اسی سال ۱۰ فروری کو سورت پہونچا۔ ہندوستان کے شہروں میں اس نے کمبایت، احمد آباد، چول، گووا، اکری، برسی لور، منگلور اور کالی کٹ دیکھے۔ آخر الذکر شہر سے ساحلی علاقے میں سفر کرتا ہوا وہ گووا واپس لوٹ آیا۔ اور وہاں سے بحری جہاز سے (۱۶ نومبر ۱۶۲۴ء) مسکت کے لئے روانہ ہوا۔ وہاں سے اس نے بصرہ، الیپو، سالی پرس، مالٹا، سسلی، اور نیپلس کا راستہ اختیار کیا جہاں وہ ۵ فروری ۱۶۲۶ء کو پہونچا۔ اسی سال ۲۲ مارچ کو وہ روم لوٹ آیا اور خاندانی گرجے کے تہ خانے میں اپنی بیوی کو سپرد خاک کردیا۔ اس نے اس جورجیائی غلام لڑکی سے شادی کرلی جس سے ۱۴ بچے پیدا ہوئے۔ اپریل ۱۶۵۲ء میں اس نے وفات پائی اور چرچ آف اراسیلی میں واقع سین برنیڈ نیوڈلی کے کلیسا میں اسے دفن کر دیا گیا۔

اس کی تصنیف اطالوی زبان میں پہلی مرتبہ ۱۶۶۳ء میں شائع ہوئی تھی اور شہزادہ [illegible] بوجوگی کے نام معنون کی گئی تھی جو مقدس کلیسا کا صدر تھا۔

ہندوستان میں اس کی سیاحت محدود تھی۔ "یہ بات قابل افسوس ہے کہ اس نے اس سے [illegible] کا دورہ نہ کیا لیکن یہ خطوط جن میں صرف ایک ملک کے محدود علاقوں کا ذکر ہے [illegible] پر مشتمل ہیں۔ اور ہماری آنکھوں کے سامنے وہاں کے لوگوں اور ان کے عادات

واطوار کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے ہیں جیسے کہ وہ ۱۷ویں صدی کے اوائل میں پائے جاتے تھے"۔ ہندوستان کی تاریخ کے طالب علموں کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ مغلیہ ہندوستان کے اس نے صرف تین شہروں کو دیکھا تھا۔

پھر بھی" ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ وہ پہلا ایسا سیاح تھا جو دوسرے ہرم میں داخل ہوا اور اس نے یورپ کو ممی (وہ لاش جو مسالہ لگا کر محفوظ کر لی جاتی ہے) بھیجی جو آثار قدیمہ کے ذخیرے میں ڈریسڈن میں محفوظ ہیں۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے چٹانی کتبات اور اسیریا (آشور) کی قدیم خط تحریر کی طرف توجہ کی، جن کی بعض نقلیں وہ اپنے ساتھ لایا۔ حالانکہ ان کے پڑھنے کی اس میں صلاحیت نہ تھی لیکن اس نے یہ پتا لگانے میں بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیا کہ مشرقی زبانوں میں جدید دور کے کتبات کے بارے میں مروجہ تصور کے برخلاف یہ بتایا کہ ان کتبات کو بائیں طرف سے دائیں طرف پڑھنا چاہیئے۔ ایڈورڈ گرے نے اس تذکرہ کو مدوّن کر کے ہکلیٹ سوسائٹی کی اشاعتوں میں دو جلدوں میں شائع کر دیا۔

زیر نظر بیانات اسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

(۱) شہر، قصبے، تالاب اور سرائیں

سورت کا محصول خانہ (چونگی):

سورت میں چونگی خانہ کو" دوگانا" کہتے تھے۔ حکام بڑے" غور" سے چیزوں کو دیکھتے تھے۔" وہ لوگ مسافروں کو اس وقت تک شہر کے اندر داخل ہونے نہیں دیتے تھے جب تک ان کے بارے میں مکمل معلومات دستیاب نہ ہوجائیں اور ان کے پاس پروانہ راہداری نہ ہو"۔ حکام لوگ بڑی" ہوشیاری" اور ترتیب کے ساتھ آگے بڑھتے تھے۔ ایک غلام لڑکی کی کیفیت کے بارے میں انھیں معلومات حاصل کرنی تھیں۔ حکام نے حکم دیا کہ" اس کے ساتھ نہ تو سختی اور نہ ہی بدسلوکی کی جائے"۔

سورت میں واقع گوپی تلاؤ:

یہ بڑا ایک تالاب تھا۔ کئی سمتوں اور زاویوں میں اس میں پتھر لگے ہوئے تھے۔ پانی

کی سطح تک پہونچنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں ۔ تالاب کے وسط میں ایک جزیرہ واقع تھا ۔ تیر کر یا کشتی کے ذریعہ وہاں تک پہونچا جاسکتا تھا ۔ پیٹرآ نے اس کے قریب ایک نالی دیکھی تھی جو " بہت بڑی اور گہری تھی ۔ اس کے ذریعہ بڑے تالاب سے چھوٹے تالاب میں پانی لے جایا جاتا تھا " جو اچھی خاصی دوری پر واقع تھا " اس کے اوپر کئی پُل بنے ہوئے تھے ۔ ان دونوں تالابوں کے درمیان کسی امیر کا مقبرہ بنا ہوا تھا ۔

احمد آباد کی ایک جھیل ؛

یہ مصنوعی تھی ، پتھر کی بنی ہوئی تھی " بہت سے زاویوں میں سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں " پیٹرآ نے اس کے عرض کا اندازہ لگایا تھا جو آدھی میل تھی ۔ اس جھیل کے وسط میں بھی ایک " جزیرہ " تھا لیکن سورت کی جھیل کے برعکس یہ محرابی ایک پُل کے ذریعہ بر اعظم سے جڑی ہوئی تھی ۔ وہ پُل اچھا خاصا بنا ہوا تھا جس کے اوپر سے ہندوستانی دو بیل گاڑیاں ساتھ ساتھ بیک وقت گذر سکتی تھیں ۔ پیٹرآ نے لکھا ہے کہ فی الواقع یہ ہندوستانی جھیلیں " خوبصورت " چیزیں ہیں اور ان میں سے بہتوں کو دنیا کی بہت قابلِ ذکر ڈھانچوں یا عمارتوں میں شمار کرنا چاہیئے "

احمد آباد کی کارواں سرائے ؛

عام طور پر احمد آباد اور ہندوستان کے دوسرے شہروں کے مسافر خانے ، فارس اور ترکی کے مسافر خانوں کی طرح نہ تھے ۔ " مسافروں کے قیام کے لئے ایک عمارت ہوتی تھی جس میں قیام کے لئے اِدھر اُدھر کافی جگہ ہوتی تھی اور کمرے ایک دوسرے سے الگ اور جڑے ہوئے ہوتے تھے ۔ ان کمروں میں مسافر قیام کرتے تھے ۔ ہندوستانی سرائیں ایسی بنی ہوتی تھیں جیسے کہ شہروں کی بڑی گلیاں جن میں مسافر رہتے تھے ۔ ان میں کرایہ پر گھر لئے جاسکتے تھے ۔ سامانوں کی حفاظت کے لئے ان گلیوں کے دروازوں میں رات کو تالے بند کر دئے جاتے تھے ۔ ان کو کارواں سرائے کہتے تھے ۔

پیٹرآ کے بیان میں اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ فارس کی سرایوں کی طرز پر بنی ہوئی ہندوستان میں بھی سرائیں ملتی تھیں کیونکہ اس نے احمد آباد کے ذکر میں چھتہ دار طرز پر بنی ہوئی دوسراؤں کا حوالہ دیا ہے ۔

کمبیات میں جانوروں اور پرندوں کے اسپتال ؛ (۱) بیمار لولے لنگڑے اپنے جوڑے سے

محروم (نرہو یا مادہ) پرندوں کو وہاں رکھا جاتا تھا۔ جو لوگ ان کی دیکھ بھال کرتے تھے ان کی تنخواہیں عوام کے خیراتی فنڈ سے ادا کی جاتی تھیں۔ اسپتال کی عمارت بہت چھوٹی سی تھی۔ بہت سی چڑیوں کے لئے ایک کمرہ کافی تھا۔ وہ لوگ ہر قسم کے پرندے پالتے تھے۔ جنگلی چڑیوں کے اچھے ہو جانے پر وہ انھیں چھوڑ دیتے تھے۔ پالتو چڑیوں کو ایسے لوگوں کو دے دیا جاتا تھا جو انھیں پالتو جانور کی طرح رکھتے تھے یہاں پیٹر نے ایسے بوڑھے ایک آدمی کو دیکھا جس کی داڑھی لمبی تھی۔ اس کے ناک کے اوپر چشمہ تھا۔ وہ بوڑھا چڑیوں کے پروں کے ذریعہ چوہے کے بچوں کو دودھ پلا رہا تھا۔ اس نے پیٹر کو اس بات کا یقین دلایا کہ جیسے ہی وہ بڑے ہو جائیں گے انھیں چھوڑ دیا جائے گا۔

(۲) اسی شہر میں اس نے دوسرا ایک اسپتال دیکھا جہاں لنگڑی اور بیمار بھیڑ بکریوں کا علاج کیا جاتا تھا اور مور اور دوسرے جانوروں کو بھی داخل کرتے تھے۔

(۳) دوسرے ایک مقام پر اس نے گایوں اور بچھڑوں کا اسپتال دیکھا۔ اس اسپتال میں اس نے ایسے ایک مسلمان کو دیکھا جس کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے تھے۔ ہندو لوگ اُسے وہاں لائے تھے اور اس لئے اسے کھانا کھلاتے تھے کہ شکستہ حالی کی وجہ سے وہ مر نہ جائے۔ (جاری)

باقی صحیح جوابات: ۵: ۱۹۱۷ء ۶: کارل مارکس ۷: موتی مسجد آگرہ ۸: مسجد قبا، مسجد الحرام، مسجد اقصیٰ، مسجد ضرار ۹: جنگ فجار ۱۰: صفوان بن امیہ۔

12 5 4 21
2 11 93

درست جوابات دینے والے قارئین کے نام اس طرح ہیں:-

ڈاکٹر اقبال احمد عثمانی، نہٹور، بجنور۔ خالد اشفاق، دیوبند۔ ڈاکٹر ضمیر حسن، جامعہ طبیہ دیوبند۔ محمد طیب، محمد سجاد قادری، رابعہ علی، ذاکر نگر اوکھلا۔ سید تحسین عارف، میرٹھ۔ محمد عباس عالم، مرادآباد۔ محمد ظفر اقبال، مظفر نگر۔ محمد رضوان اختر، مہاراشٹر۔ محمد ظہیر خاں، گجرات۔ ثاقب منصور، بلند شہر۔ عتیق اقبال، خورجہ۔ محمد ذیشان عباس، سائرہ صدیقی، محمد طاہر بن یونس اعوان، علی گڑھ۔ حماد ایم رضوان، عمران احمد، عبد الباسط، کانپور۔ عمران احمد، قاری عبید اللہ (افغانی) نئی دہلی۔ عبید اظہر انصاری، غازی آباد۔ اقبال قریشی، دربھنگہ۔ مولوی نعمان الحق، کلکتہ۔

اعلان: قرعہ اندازی کے مطابق سال بھر کے لئے "برہان" مفت حاصل کرنے کے حق دار قاری عبید اللہ (افغانی) قرار پائے۔